# مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش

## حصہ دوم

اسلامی نقطۂ نظر سے موجودہ سیاسی حالات کا
تفصیلی تجزیہ - اسلامی جماعتوں کی سیاسی روش
پر تنقید - جدید انقلابی نصب العین کی توضیح

از

سید ابو الاعلیٰ مودودی

مکتبہ جماعت اسلامی - دار الاسلام
پٹھان کوٹ (پنجاب)

قیمت بے جلد ۸/ عہ

باهتمام

سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر۔ پبلشر، تعلیمی پرنٹنگ پریس لاہور میں چھپ کر
دارالاسلام جمال پور پٹھانکوٹ سے شائع ہوئی

# فہرست مضامین

| | | |
|---|---|---|
| بار اوّل | دسمبر سنہ ۱۹۳۸ء | ۱۳۰۰ |
| بار دوم | فروری سنہ ۱۹۳۹ء | ۱۰۰۰ |
| بار سوم | اپریل سنہ ۱۹۳۹ء | ۲۰۰۰ |
| بار چہارم | ستمبر سنہ ۱۹۴۲ء | ۱۰۰۰ |
| بار پنجم | جون سنہ ۱۹۴۴ء | ۲۰۰۰ |
| بار ششم | جولائی سنہ ۱۹۴۷ء | ۲۰۰۰ |


## نوٹ

یہ کتاب سنہ ۱۹۳۸ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ موجودہ حالات اس وقت کے حالات کے مقابلہ میں بالکل بدل چکے ہیں اور اب اس کو پڑھتے ہوئے ناظرین کو بہت سی چیزیں زائد المیعاد معلوم ہوں گی۔ لیکن ہم اس کتاب کا چھٹا ایڈیشن بلا کسی ترمیم کے اس لئے شائع کر رہے ہیں کہ یہ ایک تاریخی کتاب بن چکی ہے۔

(مینیجر)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

# مقدمہ

"مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے عنوان سے میرے مضامین کا ایک مجموعہ پہلے شائع ہو چکا ہے۔ اب یہ دوسرا اسی سلسلہ کے دوسرے حصہ کی حیثیت سے شائع ہو رہا ہے۔

کسی قوم کے لئے اس وقت سے زیادہ پریشانی و سراسیمگی کا اور کوئی وقت نہیں ہوتا۔ جب وہ دیکھتی ہے، کہ اس کے گرد و پیش سارا ماحول اس کے خلاف بدل گیا ہے، زندگی کے کارخانہ کو چلانے والی تمام طاقتیں ان اصول اور ان مناہج کے خلاف چل رہی ہیں جن پر اعتقاداً و عملاً اس کے وجود قومی کی اساس قائم ہے، اور وہ اس درخت کی طرح ہو کر رہ گئی ہے۔ جس کے لئے زمین، ہوا، پانی، موسم، سب کے سب ناموافق و ناسازگار ہو گئے ہوں۔ بدقسمتی سے آج ہم ہندوستان کے مسلمان اسی صورت حال سے دوچار ہیں۔ ڈیڑھ صدی سے زیادہ مدت ہم پر اسی حالت میں گذر گئی ہے، اور روز بروز یہ حالت شدید تر ہوتی جا رہی ہے۔ ہندوستان کی کسی دوسری قوم کو یہ پریشانی پیش نہیں آئی اس لئے دوسرے لوگ اس الجھن کو بآسانی نہیں سمجھ سکتے۔ جس میں ہم مبتلا ہیں۔ ان کے لئے ہر بدلی ہوئی صورت کے مطابق بدل جانا اور اپنی ہیئت کو ہر سانچے میں ڈھال لینا سہل ہے ان کے اعتقادات اور اصولِ حیات ان کے وجود سے الگ ایک چیز ہیں جن کے بدل جانے اور سراسر الٹ جانے کے بعد بھی ان کا وجود جوں کا توں رہتا ہے۔ لیکن ہمارے اعتقادات اور

اصولِ حیات میں ہمارا وجود ہیں، اور ان کے بدل جانے کے معنی یہ ہیں کہ ہم ہم نہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے ہندوستان کے حالات نے پلٹا کھایا ہے، ہم ایک الجھن میں مبتلا ہیں، اور یہ الجھن بڑھتی جا رہی ہے، کیونکہ ہمارے گردوپیش ایک ایسا ڈھانچہ بن گیا ہے۔ اور بنتا جا رہا ہے جس میں ہم کسی طرح ٹھیک نہیں بیٹھتے۔

انگریزی حکومت جب ہندوستان پر مسلط ہوئی تو اس کے ساتھ ہی ہمارے ماحول میں ایک ہمہ گیر تغیر رونما ہونا شروع ہو گیا۔ ہم صرف مقامِ عزت و اقتدار ہی سے گرا نہیں دیئے گئے بلکہ ایک غیر مسلم قوم کے غلبہ و استیلاء کا یہ نتیجہ روز بروز زیادہ شدت کے ساتھ ہمارے سامنے آنے لگا۔ کہ ہمارے گردوپیش افکار، نظریات، اصولِ اخلاق، طرزِ تمدن، معیارِ تہذیب، قوانینِ معاشرت و معیشت، نظامِ حکومت و سیاست، غرض ایک دنیا کی دنیا بدلتی چلی جا رہی ہے اور اس کی ہر چیز ہمارے اجتماعی مزاج اور ہماری قومی طبیعت کے بالکل خلاف ہوتی جاتی ہے۔

اوّل اوّل ہم نے کوشش کی۔ کہ پتھر کی ایک چٹان بن کر تغیر و انقلاب کی اس رَو کے مقابلہ میں ڈٹ جائیں۔ اس سے زیادہ اور کچھ کرنے کے ہم اہل بھی نہ تھے۔ صدیوں کے جمود نے ہم میں اتنی صلاحیت ہی باقی نہ رہنے دی تھی کہ ہم اس انقلاب کی حقیقت کو سمجھ سکتے۔ اور نہ اتنی طاقت باقی چھوڑی تھی کہ سوچ سمجھ کر ان تدابیر کو عمل میں لاتے جو کسی انقلاب کے مقابلہ میں اختیار کرنی چاہئیں۔ اتنی صلاحیت اور طاقت ہم میں ہوتی تو یہ انقلاب رونما ہی کیوں ہوتا۔ ایک صدی تک خوب پٹنے اور مادی و اخلاقی حیثیت سے تباہ ہو جانے کے بعد یہ راز ہم پر کھلا۔ کہ تغیراتِ زمانہ کے سیلاب کا مقابلہ جامد چٹان بن کر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے بعد ہمارے دانشمندوں نے ہمیں ایک اور پالیسی کی تلقین کی۔ اور وہ یہ تھی کہ:۔

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

ہم نے کہا کہ آؤ اسی کو آزما دیکھیں، شاید اپنے آپ کو کچھ بدل کر ہم اس نئے ڈھانچہ

میں ٹھیک بیٹھ سکیں۔ چنانچہ ہم نے پہلے مغربی تعلیم کی طرف توجہ کی اور اپنے آپ کو زمانے کی رَو کے ساتھ بہنے کے لئے تیار کیا۔ پھر غیر مسلم حکومت کی بارگاہ میں درخور حاصل کرنے کی کوشش کی۔ تاکہ اپنی کھوئی ہوئی مادی طاقتوں میں سے کم از کم ایک معتدبہ حصہ باز یافت کر لیں۔ پھر اپنے ملک کے جدید سیاسی تغیرات سے ہم آہنگ ہونے کی کوشش کی۔ کہ زمانہ کا یہ سیلاب جس طرف جا رہا ہے اسی طرف سب کے ساتھ ہم بھی جائیں۔

یہ تغیرات جو ہم نے اپنی پوزیشن میں کئے، ان سب میں ہمارے پیش نظر یہ مسلک رہا کہ اپنی خودی کا تحفظ بھی کرو اور زمانے کے ساتھ بھی چلو۔ لیکن ستر برس کے تجربے پر ایک غائر نگاہ ڈال کر دیکھئے، کیا اس زمانہ سازی کے دَور میں ہم اپنی خودی کو محفوظ رکھ سکے ہیں؟ واقعات کی ناقابلِ تردید شہادت ہے کہ ایسا نہیں ہوا، اور عقل اس کو محال کہتی ہے کہ کبھی ایسا ہو سکتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ جو کھونٹے سانچے ...... میں آپ ٹھیک بھی بیٹھیں اور اپنی ہیئت کی گولائی کو تبدیل بھی نہ کریں۔ دریا کے رخ پر بہیں بھی اور اپنی جگہ پر قائم بھی رہیں۔ یہ دو باتیں بالکل متضاد ہیں اور ان کو جمع کرنا صریح عقل کے خلاف ہے۔

مغربی تعلیم کے تجربے سے کیا ثابت ہوا؟ یہ کہ جو ماحول ہم پر مسلط ہے اس میں سے ایک عنصر یعنی "تعلیم" کو ہم دوسرے عناصر سے الگ کر کے نہیں لے سکتے۔ دوسرے عناصر جن کے ساتھ اس عنصر کا غیر منفک رابطہ ہے، خود بخود اس کے ساتھ آتے ہیں۔ زندگی کا ایک اور نقطۂ نظر، اخلاق کے کچھ دوسرے اصول، اشیاء کی قدر و قیمت متعین کرنے کا ایک مختلف معیار، تمدن زندگی کے کچھ نرالے ڈھنگ، جو سب کے سب اسلام سے بالکل بیگانہ ہیں، اس ایک چیز کو قبول کرتے ہی خواہ مخواہ آنے شروع ہو جاتے ہیں، اور ان سب کے جمع ہو جانے سے مسلمان خود بخود نا مسلمان بنتا چلا جاتا ہے۔

سرکار فرنگ کے دربار میں پہنچ کر ہمیں کیا سبق ملا؟ یہ کہ دین، ایمان، اخلاق، تہذیب، تمدن سب کچھ ایک روٹی کے عوض دیدو اور روٹی بھی پیٹ بھر نہ ملے۔ اپنی خودی کو قربان کئے بغیر

دہاں سے تم کچھ نہیں پا سکتے، اور اس قربانی کے بعد بھی تمہاری حیثیت ایک خادم سے بڑھکر نہیں ہوتی جو ایک متاع حقیر کی طرح آقا کے مفاد پر بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔

سیاسیات میں زمانہ سازی کا پھل کیا ملا؟ یہ کہ تمام سیاسی تغیرات جو اب تک ہوئے اور آئندہ ہونے والے ہیں، ہمارے نظریات عمرانی کے بالکل خلاف اور خداوندانِ فرنگ کے نظریات عمرانی کے عین مطابق ہیں۔ ان کا نظریۂ قومیت، ان کے اصولِ جمہوریت، ان کے تصورات حکومت و سلطنت، انہی چیزوں پر تمام جدید تغیرات کی بنا رکھی گئی ہے۔ اور ہمارے لئے ایسے تغیرات سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کے معنی اپنے وجود کو ایک دوسرے وجود میں بالکل تحلیل کر دینے کے ہیں۔

ان تجربات کے بعد اب ضرورت ہے کہ ہم اپنی دوسری پالیسی پر بھی نظر ثانی کریں۔ پہلی پالیسی قریب قریب سو برس کے تجربہ سے غلط ثابت ہوئی۔ اور اسے بدلنا پڑا۔ دوسری پالیسی کو ستر برس کے تجربے نے غلط اور غلط ہی نہیں مہلک ثابت کر دیا۔ اس کو بھی بدلنا اور بہت جلد بدل ڈالنا چاہئے۔ اب ہمارے لئے صرف تیسری پالیسی باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ :-

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز

جو ڈھانچہ تمہارے گرد و پیش چھا گیا ہے اس سے تم الگ بھی نہیں رہ سکتے، اور اس میں اپنی خودی قربان کئے بغیر ٹھیک بھی نہیں بیٹھ سکتے، لہٰذا آؤ اب مردوں کی طرح لڑ کر اس ڈھانچے کو توڑ ڈالو اور اسے مجبور کر دو۔ کہ تمہاری ہیئت کے مطابق بنے۔ جس سیلاب میں تم گھر گئے ہو اس کے ساتھ بہنے میں تمہارا وجود نمک کی طرح تحلیل ہوا جاتا ہے، اور اس کے مقابلہ میں جامد چٹان بن کر تم اپنی جگہ جم بھی نہیں سکتے، لہٰذا آؤ، اب بہادروں کی طرح اٹھ کر اس سیلاب کا رخ پھیر دو اور اسے اس رخ پر بہنے کے لئے مجبور کر دو جو تمہاری فطرت مسلمہ کے مقتضیات سے مطابقت رکھتا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں اس میں کامیابی نہ ہو، بہت ممکن ہے

کہ تم خود بھی اس لڑائی میں ہلاک ہو جاؤ۔ مگر بکری کی زندگی کے ۱۰۰ برس سے شیر کی زندگی کا ایک دن بہرحال زیادہ قیمتی ہے

یہی انقلابی ذہنیت ہے جسے میں اب مسلمانوں میں، خصوصاً ان کے نوجوانوں میں پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ انقلابی ذہنیت یکایک پیدا نہیں ہوتی۔ زمانہ کی سخت ٹھوکریں کھا کھا کر آہستہ آہستہ دماغ درستی پر آتا ہے۔ اور ان ٹھوکروں کے ساتھ آہستہ آہستہ انقلابی ذہنیت اس کے اندر اترتی ہے ..................

.... اس دوران میں آدمی کو بڑے سخت مرحلوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ باہر والوں سے پہلے گھر والوں سے لڑائی، اور لڑائی بھی جو کبھی لڑائی لڑنی پڑتی ہے۔ قدیم پالیسی جن دماغوں میں گہری جمی ہوئی ہوتی ہے وہ انقلاب کی دعوت سن کر اول تو اس کا مفہوم و مدعا ہی نہیں سمجھ سکتے۔ پھر کچھ کچھ سمجھتے بھی ہیں۔ تو اسے اپنے عادی تصورات کے خلاف پا کر مشتعل ہو جاتے ہیں۔ کوئی سمجھتا ہے کہ یہ کوئی نیا دوکاندار آیا ہے جو ہماری پرانی جمی ہوئی دوکانوں کے مقابلے میں اپنی دوکان جمانے کے لئے یہ باتیں کر رہا ہے۔ کوئی خیال کرتا ہے کہ یہ کوئی گہری سازش ہے جسے دشمنوں نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ تیار کیا ہے۔ کوئی تیوری بدل کر کہتا ہے۔ کہ جن لوگوں نے اپنے بال قومی خدمت میں سفید کئے ہیں ان کے مقابلہ میں تو خیز طفل مکتب ہو کر تمہیں زبان کھولتے شرم نہیں آتی۔ کوئی آوازہ کستا ہے۔ کہ مَا هٰذَا اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ یُرِیْدُ اَنْ یَّتَفَضَّلَ عَلَیْکُمْ۔ اور کوئی نہنگ سال خوردہ سیلاب کے ساتھ بہتے ہوئے ایک سرپرستانہ نگاہ اس رو کے خلاف تیرنے والی مچھلی پر ڈالتا ہے اور بس یہ کہکر آگے بہہ نکلتا ہے کہ اس نے کوئی نئی بات نہیں کہی، ہم بھی پہلے کہہ چکے ہیں۔

پھر پرانے خیالات کی ایک دنیا ہوتی ہے جسے انقلاب کے داعی کو توڑنا پھوڑنا ہوتا ہے اور نئے خیالات کی ایک دنیا ہوتی ہے جو اسے بنانی پڑتی ہے۔ لوگ پرانے خیالات سے ہٹ نہیں سکتے جب تک کہ نہایت مضبوط دلائل کے ساتھ تنقید کر کے ان کی بنیادیں ہلا نہ دی

جائیں۔ اور نئے خیالات قبول نہیں کر سکتے۔ جب تک کہ تعمیری افکار کو حکمت عملی کے ساتھ پیش کر کے انہیں قابل قبول نہ بنا دیا جائے۔ اور معقول دلائل کے ساتھ انہیں مطمئن نہ کر دیا جائے کہ اس مضبوط ڈھانچے کو جس کی گرفت میں تم طوعاً یا کرہاً آ گئے ہو، یوں توڑا جا سکتا ہے اور اس کی جگہ یہ ڈھانچہ بنانے کی ضرورت ہے جس میں تم ٹھیک بیٹھ سکتے ہو، اور یہ دوسرا ڈھانچہ اس طرح بننا ممکن ہے اس کام میں تخریبی تنقید اور جدید تعمیر دونوں ساتھ ساتھ کرنی پڑتی ہیں۔ جب تک یہ دونوں کام تکمیل کے قریب نہیں پہنچ جاتے، غلط فہمیوں، بدگمانیوں اور پریشان خیالیوں کا ایک گہرا غبار ہر طرف چھایا رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے پرانے خیالات کے معتقدین اور جدید و قدیم کے درمیان بھٹکنے والے مذبذبین کے ایک انبوہِ کثیر کو انقلابی نصب العین کا نقطہ صاف نظر نہیں آ سکتا کہ وہ اس پر جمع ہو سکیں، اور جب تک یہ نقطہ واضح ہو کر اس قابل نہیں بن جاتا۔ کہ قوم کی عملی قوتیں اس پر مجتمع ہوں اس وقت تک عملی جد و جہد کی راہ میں کوئی قدم آگے نہیں بڑھ سکتا پس یوں سمجھئے کہ ابتداءً سب سے بڑا عمل یہی ہے۔ کہ قدیم خیالات کا طلسم پیہم ضربوں سے توڑا جائے۔ اور جدید خیالات کے لئے راہ صاف کی جائے۔

تخریبی تنقید کے مرحلے میں ایک بڑی مشکل یہ پیش آتی ہے کہ قدیم پالیسی کی غلطیاں اور مضرتیں ثابت کرنے کے لئے اس پالیسی پر چلنے اور چلانے والوں کو تنقید کا ہدف بنائے بغیر چارہ نہیں ہوتا۔ اور یہ ایسا کام ہے کہ جسے دل پر پتھر رکھ کر انجام دینا پڑتا ہے۔ اس میں آدمی کو بہت سی دوستیوں، بہت سی محبتوں، بہت سے پرانے تعلقات کی قربانی دینی پڑتی ہے اور بہت سے ان بزرگوں کی ناراضی مول لینی ہوتی ہے جن کا وہ تمام عمر احترام کرتا رہا ہے اور جن کی بزرگی کے احترام سے اس کا دل کبھی خالی نہیں ہوتا۔ اس میں آدمی کو اس امر کا بھی اندیشہ ہوتا ہے کہ کہیں تنقید کی شدت سے وہ جواب میں ضد نہ پیدا کر دے، اور کہیں جوابی حملے خود اس کے ذہنی توازن کو نہ بگاڑ دیں۔ غرض اس خار زار سے اس کو بہت ہی سنبھل کر گذرنا پڑتا ہے اور ہر وقت اپنے اعصاب کی بندش چست رکھنی ہوتی ہے۔

انقلابی ذہنیت پیدا کرنے کے لئے تدریج کا خیال رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ لوگوں کی قوتِ تحمل سے زیادہ خوراک دینا بھی مہلک ہے۔ اور حقیقی خوراک کی طلب ان میں پیدا ہو چکی ہو اس سے کم دینا بھی برے نتائج پیدا کرتا ہے۔ یہاں قدم قدم پر آدمی کی قوتِ فیصلہ کا سخت امتحان ہوتا ہے۔ اور صرف خدا ہی کی مدد اس کو حالات کا صحیح اندازہ کرنے اور ٹھیک وقت پر ٹھیک قدم اٹھانے کی طاقت بخش سکتی ہے۔

میں اپنی کمزوریوں سے خوب واقف ہوں، اور انہی کمزوریوں کا احساس ہے جو مجھے ہر وقت مجبور کرتا ہے کہ میں خداوند عالم سے علم صحیح اور عقل سلیم کے لئے دعا کروں۔ محض فرض کی پکار نے مجھے مجبور کر کے اس کام پر آمادہ کیا ہے۔ جس کے دشوار گذار مرحلوں کو دیکھ کر ایک طرف، اور اپنی کمزوریوں کو دیکھکر دوسری طرف، میری روح لرز اٹھتی ہے۔ بہر حال محض خدا کے بھروسے پر میں نے اس میدان میں قدم رکھ دیا ہے۔ اور ان تمام حکمتوں کو پیش نظر رکھ کر جن کی طرف اوپر اشارہ کر چکا ہوں، اپنے انقلابی مشن کی تبلیغ شروع کر دی ہے۔

پچھلا مجموعہ مرتب کرتے وقت میں نے خاص طور پر اس بات کو ملحوظ رکھا تھا۔ کہ ابھی محض لوگوں کو چونکانے اور ان کے دماغوں کو انقلابی تصورات کے لئے تیار کرنے کی ضرورت ہے، اس سے زیادہ کے وہ متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس لئے میں نے مسلمانوں کی پچھلی تاریخ، ان کے موجودہ حالات اور ان کے گرد و پیش کام کرنے والی قوتوں کے رجحانات پر ایک سرسری تبصرہ کرتے ہوئے صرف یہ بتانے پر اکتفا کیا تھا۔ کہ تمہارے اندر کیا کمزوریاں ہیں، اور باہر سے کس قسم کے خطرات تم کو گھیرے ہوئے ہیں، اور تمہاری تہذیب کی فطرت سے تمہارے ماحول کی طاقتیں کس طرح متصادم ہو رہی ہیں۔ اس تبصرے کے ساتھ میں نے جدید انقلابی نصب العین کی طرف بس چند اشارات کئے تھے۔ اور انہیں قصداً زیادہ واضح نہیں کیا تھا تاکہ اچانک ایک نرالی آواز سن کر طبائع آمادہ بغاوت نہ ہو جائیں۔

اب اس دوسرے مجموعہ میں، میں ایک قدم اور بڑھا رہا ہوں۔ اب میں نے زیادہ وضاحت

کے ساتھ ہندوستان کے موجودہ سیاسی نظام اور اس کی بنیادوں کا تجزیہ کیا ہے اور ایک ایک مقام پر انگلی رکھکر بتایا ہے کہ یہاں مسلمانوں کے لئے ہلاکت ہے، اور یہاں ان کے لئے نقصان ہے، اور یہ چیزیں ان کے مزاج قومی کے منافی ہیں — یہ ان لوگوں کا جواب ہے جنہوں نے یہ غلط فہمی پھیلا رکھی ہے کہ مسلمانوں کو محض خیالی خطرات سے ڈرایا جا رہا ہے —— اس کے بعد میں نے مسلمانوں کے ان رہنماؤں کی پالیسی پر تنقید کی ہے جو اب تک "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز" کے مسلک پر چلے جا رہے ہیں۔ جس قدر دلائل و شواہد میں فراہم کر سکتا تھا ان سب سے کام لے کر میں نے بہت کریکی کوشش کی ہے کہ یہ پورا نظام حکومت و سیاست جو ہم پر مسلط ہے، اپنے اصول و فروع سمیت ان اصولوں سے متصادم ہو رہا ہے۔ جن پر ہماری قومی زندگی کی بنا قائم ہے۔ اور اس نظام کو انہی بنیادوں پر قائم رکھ کر اپنے آپ کو جوں کا توں یا کسی قدر تحفظ کے ساتھ اس میں فٹ کرنے کی کوشش کرنا سراسر ایک غیر دانشمندانہ طریق کار ہے اور مسلمان اس طریق کار سے ہرگز کسی فلاح کی، اور فلاح کیا معنی، اپنے بقا کی بھی امید نہیں کر سکتے —— اس بحث سے میرا واضح مقصد یہ ہے کہ خیالات، مقاصد اور پالیسیوں میں جو اشتباہ و التباس اور الجھاؤ اس وقت پایا جا رہا ہے اسے ختم کر دیا جائے، جو مختلف اور متضاد راستے اس وقت خلط ملط اور گڈمڈ ہو گئے ہیں ان کو الگ الگ کر کے دین قیم کی راہ اور طاغوت کی راہ کو بالکل ایک دوسرے سے ممیز کر دیا جائے۔ اور لوگوں کو مجبور کر دیا جائے کہ دونوں میں سے کسی ایک ہی راستہ کو اپنے لئے منتخب کریں۔ جو وطن پرست ہیں اور ایک ہندوستانی قومیت میں جذب ہونا چاہتے ہیں وہ علی وجہ البصیرت اور علی رؤس الاشہاد اس راستے پر جائیں اور یہ سمجھ کر جائیں کہ یہ راستہ اسلام کے راستہ سے خلاف جا رہا ہے۔ اور جو مسلمان ہیں اور مسلمان رہنا چاہتے ہیں وہ قوم پرستی اور نیشنلزم کا نام لینا چھوڑ دیں اور اس تحریک سے الگ ہو جائیں جو اسلامی قومیت کو وطنی قومیت میں تحلیل کرنا چاہتی ہے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے۔ کہ میں ان لوگوں کے موقف کو ناممکن الوقوف بنا دینا چاہتا ہوں جو بیک وقت دو کشتیوں میں پاؤں۔

رکھنا چاہتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ یہ مخالف سمتوں میں جانے والی کشتیاں ہیں ــــ سب سے آخر میں میں نے زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ ہمارے لئے اب صحیح قومی پالیسی کیا ہے اور اس کو کس طرح عمل میں لایا جاسکتا ہے۔ اس میں ان لوگوں کو پورا جواب مل جائے گا جو اس غلط خیال میں خرص وتخمین کے تیر تکے چلا رہے ہیں کہ میرے پاس صرف سلب ہی سلب ہے اثبات وایجاب نہیں ہے۔

جب لوگ موجودالوقت نظام کے پوری طرح خوگر ہو چکے ہوں تو ان کے لئے یہ سمجھنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ اس نظام میں اصولی خرابیاں کیا ہیں، اور یہ کہ اس کے اصولوں سے مختلف بھی کچھ اصول ہو سکتے ہیں جن پر کوئی قابلِ عمل نظام بن سکتا ہے اس لئے میں جانتا ہوں کہ اس توضیح وتشریح کے باوجود جو میں نے موجودہ نظام پر تنقید کرنے اور جدید تعمیر کا نقشہ کھینچنے میں اختیار کی ہے، بہت سے نکات ایسے باقی رہ جائیں گے جن میں لوگوں کو الجھن پیش آئے گی، میں خود بھی اپنا تمام وقت ان کو سمجھنے میں صرف کر رہا ہوں، اور اپنے ناظرین سے بھی درخواست کرتا ہوں کہ اس مجموعہ کو ملاحظہ فرمانے وقت وہ نوٹ کرتے جائیں کہ کون کون سے مقامات توضیح طلب ہیں۔ اگرچہ میں گالیاں دینے والے حضرات کا بھی شکر گذار ہوں کہ وہ بھی میری اخلاقی تربیت میں مفید حصہ لے رہے ہیں۔ مگر میں ان حضرات کا اور زیادہ شکر گذار ہونگا جو میرے ان مضامین پر تحقیقی تنقید فرمائیں گے۔

ابوالاعلیٰ

۱۲ر جمادی الاخری ۱۳۵۷ھ

---

# مسلمانوں کی غلط نمائندگی اور اس کے نتائج

یہ سوال کہ ہندوستان کے مسلمان کیوں بے چین اور غیر مطمئن ہیں۔ اور کیوں اپنے ملک کی اس سیاسی جدوجہد میں، جس کو "جنگ آزادی" کہا جاتا ہے، اپنے شایان شان حصہ نہیں لیتے۔ ایک ایسا معمہ بن گیا ہے جسے سمجھنا صرف غیر مسلموں ہی کے لئے نہیں، بلکہ خود بہت سے مسلمانوں کے لئے بھی دشوار ہوگیا ہے۔ مسلمانوں کی حالت اس وقت اس شیر خوار بچے کی سی ہے جو اپنی تکلیف پر روتا اور تڑپتا ہے، مگر ٹھیک ٹھیک یہ نہیں بتا سکتا کہ اس کو تکلیف کیا ہے جس پر وہ رو اور تڑپ رہا ہے۔ حتیٰ کہ بسا اوقات غیر تو غیر، خود اس کی اپنی ماں کو یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ اسے فی الواقع کوئی شکایت نہیں، محض ضد چڑھ گئی ہے۔ اس وقت ضرورت تھی کہ مسلمان قوم کے ذہن کو ٹھیک ٹھیک پڑھ کر اس کی بے چینی اور بے اطمینانی کے حقیقی اسباب دریافت کئے جاتے، اس اصل مسئلے کو واضح اور منقح صورت میں پیش کیا جاتا جو ہندوستانی مسلم قوم کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بنا ہوا ہے اور یہ بتایا جاتا کہ ہندوستان کا مسلمان فی الواقع چاہتا کیا ہے۔ نیز مسلمان کے نقطۂ نظر سے ہندوستان کے موجودہ حالات اور مستقبل کے رجحانات کا تجزیہ کر کے صاف صاف بیان کر دیا جاتا کہ کس طرح یہاں ایسا ماحول پیدا ہو رہا ہے اور ہوتا جا رہا ہے جس کو مسلمان اپنی قومی زندگی کے لئے مہلک سمجھتا ہے۔ صرف یہی ایک صورت تھی جس سے مسلمانوں کی اپنی پراگندہ خیالی، اور غیر مسلموں کی حیرانی، بدگمانی اور بدتدبیری کا خاتمہ ہو سکتا تھا۔ بعض غیر مسلموں نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور اس معمے کو سمجھنے اور مسلمانوں کے ذہن کو پڑھنے کی کوشش بھی کی مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکتے تھے اور نہ ہو سکے۔ یہ کام دراصل ایسے لوگوں کے

کرنے کا ہے جن کے احساسات جمہور مسلمین کے احساسات سے متحد الاصل ہیں، اور اس کے ساتھ جن میں یہ قوت بھی ہے کہ اپنے اندر جو کچھ محسوس کریں اس کی واضح تصویر خارج میں کھینچ کر رکھ دیں۔

مسلمانوں کے صاحبِ علم و صاحبِ فکر لوگوں نے اس باب میں جس غفلت سے کام لیا ہے، اس کا نتیجہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہ مسئلہ بالکل نااہل اور ناقابلِ اعتماد لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن گیا ہے اور انہوں نے اس کو نہایت غلط طریقوں سے پیش کرکے دوسروں ہی کو نہیں، خود اپنی قوم کو بھی پریشان خیالیوں اور غلط فہمیوں میں مبتلا کر دیا ہے۔

ان میں سے ایک بڑی جماعت تو اسلام کا صحیح علم ہی نہیں رکھتی، اور نہ اس حقیقت کو سمجھ سکتی ہے کہ مغربی علوم کے فروغ، غیر مسلم حکومت کے اقتدار، اور اب جدید نیشنلزم کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے مسلم قوم کے لئے فی الواقع کونسا بنیادی سوال پیدا ہو گیا ہے۔ یہ لوگ بغیر سمجھے بوجھے، محض چند سطحی اور حقیر سے جزئیات کو مسلمانوں کے قومی مسائل بنا کر پیش کرتے ہیں، اور ان پر مناسب حد سے بہت زیادہ زور دے کر اپنی پوزیشن کو اور زیادہ مضحکہ خیز بنا دیتے ہیں۔ اس سے ہوشیار لوگوں کو یہ خیال پھیلانے کا اچھا موقع مل جاتا ہے کہ مسلمانوں کا قومی مسئلہ چند بہت ہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے مرکب ہے، جن کو محض جہالت، تنگ نظری اور نادانی کی وجہ سے اتنی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔

ایک دوسری جماعت جس نے اس مسئلہ کی حمایت میں اپنے آپ کو بہت نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ انگریزی سلطنت کے وفادار غلاموں پر مشتمل ہے، اور ان کا فائدہ اسی میں ہے کہ اصل مسئلہ کو فروعات میں گم کر دیا جائے تاکہ مسلمان ان فضول چیزوں پر لڑ کر اپنی قوت ضائع کرتے رہیں اور ان کی جان و مال کے خرچ پر سرکارِ برطانیہ کا کام بنتا رہے۔ ان حضرات کی مداخلت سے اس مسئلہ کی عزت و وقعت اور بھی زیادہ کم ہو گئی ہے اور مخالف گروہ کے چالاک لوگوں کو یہ مشہور کرنے کا بہت اچھا بہانہ ہاتھ آگیا ہے کہ درحقیقت مسلمانوں

کے قومی مسئلہ کا کوئی وجود ہی نہیں ہے، یہ تو محض امپریلیسٹ پالیسی کا ایک شاخسانہ ہے، اور صرف ٹوڈیوں، رجعت پسندوں اور سرکار پرستوں ہی کی اغراض نے اسے پیدا کیا ہے۔

ان دونوں گروہوں کی بدولت جو نقصان ہمارے مقدمہ کو پہنچا ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ غیر تو غیر خود مسلمان بھی اب اس دھوکہ میں مبتلا ہوتے جا رہے ہیں کہ درحقیقت ہمارا کوئی قومی مسئلہ نہیں ہے۔ اور اگر ہے بھی تو وہ ایسا اہم نہیں کہ آزادی وطن سے بڑھکر ہم کو اس کی فکر ہو۔ چنانچہ مسلمانوں کے اپنے آدمیوں کی زبانوں پر اب وہی باتیں آنے لگی ہیں جو کل تک غیر مسلم اخباروں اور لیڈروں کی زبان و قلم پر تھیں۔ یعنی مسلم مفاد کا نام لینا رجعت پسندی اور ٹوڈیت اور فرقہ پرستی ہے۔ یہ جادو عوام سے گذر کر علماء پر بھی چڑھ رہا ہے اور وہ لوگ اس سے متاثر ہو رہے ہیں جن کا اصلی فرض یہ تھا کہ جانشینانِ رسول ہونے کی حیثیت سے اس مسئلہ کو سمجھتے اور سمجھاتے اور جانشینانِ رسول ہونے کی حیثیت ہی سے اس کو حل کرنے کی کوشش کرتے۔ اب اگر ہماری قوم کے وہ چند ارباب فکر جو حقیقت کو سمجھتے ہیں اور سمجھانے کی بھی اہلیت رکھتے ہیں۔ اور جن کا ذہن ابھی تک بیرونی اثرات سے آزاد ہے، مہر خاموشی نہ توڑیں گے اور صاف صاف حقیقت کو بیان نہ کریں گے تو یقیناً زمانے کی دو تین گردشیں بھی نہ گذرنے پائیں گی کہ مسلمانوں کی پوری قوم فریب میں مبتلا ہو جائے گی۔ اس میں شک نہیں کہ اب مسلمانوں کے مفاد کا نام لینا اپنے آپ کو بڑے خطرے میں ڈالنا ہے کیونکہ اب غیروں ہی سے نہیں، خود اپنے بھائیوں سے بھی ایسے شخص کو گالیاں سننی پڑیں گی اور انسان کے لئے غیروں کی گالیوں سے بدرجہا زیادہ دلشکن ان لوگوں کی گالیاں ہوتی ہیں جن کی بھلائی کے لئے وہ کام کرتا ہے۔ لیکن خواہ نتائج کیسے ہی تلخ ہوں، جن لوگوں کو اپنی قوم کا مفاد عزیز ہے، انہیں بُرے سے بُرے نتیجہ کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہونا چاہئے اور کم از کم تذکیر کا فرض بجالانے سے ہرگز منہ نہ موڑنا چاہئے۔

اس کو مسلمانوں کی بدنصیبی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ جو سب سے بڑھکر

ان کے قومی مزاج کو سمجھنے والے اور ان کے جذبات و داعیات کا صحیح حال جاننے والے، اور ان کے قلب و روح کی سچی نمایندگی کرنے والے ہو سکتے تھے، اور جن سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ اس قوم کی حقیقی مشکلات کو سمجھ کر کوئی کارگر تدبیر علاج تجویز کریں گے آج وہ بھی زمانہ کے غالب اثرات کی رو میں بہتے جا رہے ہیں، اور نادانستہ ان کی زبانوں سے وہ باتیں نکل رہی ہیں جو کل تک زیادہ کھلے الزامات کی صورت میں غیروں کی زبان سے نکلا کرتی تھیں۔ مثال کے طور پر میں اس تقریر کا اقتباس نقل کرتا ہوں جو ابھی حال میں مولانا سید سلیمان ندوی نے مدراس میں ارشاد فرمائی ہے[1]۔ مولانا کے علم و فضل، ان کی صداقت، ان کے تفکر و تدبر کا جیسا معترف میں ہمیشہ تھا ویسا ہی آج بھی ہوں۔ اور ان کی تقریر کا اقتباس نقل کرنے سے میرا مدعا ان کی ذات گرامی پر کوئی حرف لانا نہیں ہے۔ بلکہ دراصل میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وقت کے غالب خیالات نے ہماری قوم کے اتنے بڑے صاحب فکر و بالغ النظر عالم پر بھی کیا اثر کیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:-

"اس وقت تین ہی صورتیں ہیں۔ یا تو مسلمان اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے بیٹھ رہیں اور جب آزادی کی جنگ ختم ہو جائے تو اپنے دروازے کھول کر باہر نکلیں اور گلیوں میں آزادی کی بھیک مانگتے پھریں۔ یا یہ کہ اپنا کیمپ الگ لگائیں اور یہ دیکھتے رہیں کہ آزادی کی فوج اپنی قوت و بازو سے کب میدان جیتتی ہے اور مال غنیمت پر قبضہ کرتی ہے۔ اس وقت وہ آگے بڑھیں اور فاتح فوج سے مال غنیمت میں جھگڑا کریں۔ یا یہ کہ وہ آزادی کی فوج میں شامل ہو کر آزادی کے لئے ان کے دوش بدوش کھڑے ہو کر جنگ کریں اور اپنے لئے اپنی عظیم الشان قومیت کی پوزیشن کے مطابق اپنی کوششوں سے اپنی جگہ حاصل کریں۔"

(انصاری مورخہ ۳ رمضان ۱۳۵۶ھ)

غور کیجئے! یہ ارشاد گرامی کن مفروضات کا نتیجہ ہے؟ مسلمان جو کئی سال تک آزادی کی

[1] مولانا نے ترجمان القرآن میں اس اقتباس کے شائع ہونے پر شکایت فرمائی تھی لیکن یہ نہیں فرمایا کہ انہوں نے یہ الفاظ نہیں کہے تھے یا کم از کم ان کا مفہوم یہی نہ تھا۔ جو "انصاری" کے رپوٹر نے روایت بالمعنی کے طور پر بیان کیا ہے۔

جنگ سے الگ رہے اور اب بھی ٹھٹکے کھڑے ہیں، اس کی وجہ کچھ اور نہیں، محض بزدلی ہے، اور یہ قوم بزدل ہونے کے ساتھ کمینہ بھی ہے۔ جب آزادی کی فوج کے سورما سپاہی، جو ظاہر ہے کہ اکثر و بیشتر غیر مسلم ہی ہیں، شیر دل کی طرح شکار مار لیں گے، تو یہ جنگل کے ذلیل جانوروں کی طرح آکر حصہ اڑانے کی کوشش کرے گی۔" ـــــــ یہ ہے مسلمانوں کی وہ تصویر جو ان الفاظ سے ذہن سامع میں بنتی ہے، اور اس کے ساتھ غیر مسلموں کی عظمت و بزرگی کا کیسا مرعوب کن نقشہ ذہن کے سامنے آتا ہے کہ گویا وہ شیران بیشۂ حریت ہیں جو تمام ہندوستان کے لئے آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں، پھر یہ "جنگ آزادی" کس قدر پاک، کیسی بے عیب اور کتنی بے لوث چیز فرض کی گئی ہے۔ کہ اس میں کسی لوث کا شبہ کرنا تو گویا ممکن ہی نہیں، ایسی پاک جنگ، ایسے مقدس جہاد میں حصہ لینے سے مسلمانوں کا احتراز کرنا کسی معقول وجہ پر تو مبنی ہو ہی نہیں سکتا۔ اب بس یہ ایک ہی وجہ رہ جاتی ہے کہ مسلمان بزدل، دوں ہمت اور کمینہ ہیں۔

ایک دوسرے بزرگ جن کے علم، تقویٰ، اور دیانت کا احترام میرے دل میں ان کے کسی شاگرد اور مرید سے کم نہیں ہے، اپنے ایک مضمون میں تحریر فرماتے ہیں۔

"جس طرح آزادی کے لئے جد و جہد کرنا ہندوستان کی دوسری قوموں پر واجب ہے۔ اسی طرح مسلمانوں پر بھی واجب ہے۔ بلکہ ان کے لئے اسباب وجوب بہ نسبت دیگر اقوام ہند کے چند در چند زائد ہیں پس مسلمانوں کا دوسری اقوام سے پیچھے رہنا انتہائی شرمناک اور ذلیل امر ہے۔" (مولانا حسین احمد صاحب کا مکتوب "آفتاب" لکھنؤ، مورخہ ۱۵ اپریل ۱۹۳۸ء)

یہاں بھی وہی نظریہ قائم کر رہا ہے حقائق سے آنکھیں بند کر کے یہ تسلیم کر لیا گیا کہ ہندوستان کی موجودہ سیاسی جد و جہد فی الواقع خالص آزادیٔ وطن کی جد و جہد ہے اور اس مفروضہ پر یہ حکم لگا دیا گیا کہ اس جد و جہد میں شریک ہونا مسلمانوں پر واجب ہے، اور اس سے ان کا علیحدہ رہنا کسی معقول وجہ پر مبنی نہیں بلکہ "انتہائی شرمناک اور ذلیل امر ہے۔"

میرے ایک نہایت محترم بھائی جو علم و فضل کے ساتھ خلوص نیت کی نعمت سے بھی مالا مال

ہیں۔ اور عصر حاضر کے مشہور مفسر قرآن مولانا حمید الدین فراہی رحمہ اللہ کی جانشینی کا شرف رکھتے ہیں، اپنے ایک تازہ مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:-

"یہ ساری تنظیم صرف اکثریت کے خطروں اور اندیشوں پر مبنی ہے۔ یہ اندیشے واقعی ہیں یا غیر واقعی؟ ہم تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کر لیتے ہیں۔ کہ واقعی ہیں لیکن اسی کے ساتھ یہ امر بھی ظاہر کر دینا چاہتے ہیں کہ یہ تنظیم کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ انگریزوں کے ہاتھوں بالکل انہی نعروں اور انہی ہنگاموں کے ساتھ ۱۸۵۷ء کے بعد شروع ہو گئی تھی اور ۱۸۸۵ء کے بعد سے تو ہندوستان میں کوئی انگریز حکمراں ایسا نہیں آیا جس نے اکثریت کی چیرہ دستیوں سے بچاؤ کے لئے مسلمانوں کی تنظیم اپنی حکومت کی مسلمہ پالیسی نہ قرار دی ہو اور یہ تنظیم اس تھوڑے سے وقفہ کے سوا جو تحریک خلافت نے پیدا کر دیا تھا، پورے استحکام کے ساتھ باقی رہی ہے۔ اور ہم سے زیادہ ہمارے مہربان حکام نے اس کی رضاعت و تربیت کی ذمہ داریاں محسوس کی ہیں، اور جب تک موجودہ سیاسی ضروریات باقی ہیں اور حالات کوئی نئی کروٹ نہیں بدلتے کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنے اس عظیم الشان انسانی و سیاسی فرض سے جو بحیثیت ہمارے فرمانروا ہونے کے ان پر عائد ہوتا ہے بے پروا ہو جائیں گے پس جو چیز بنی بنائی موجود اور پورے استحکام و قوت کے ساتھ موجود ہے اس پر مزید چونے گارے کے اسراف کی کیا ضرورت ہے؟ اگر اکثریت آپ کے حصن حصین میں سرنگ لگانے کی فکر میں ہے تو نصیب اعدا آپ کیوں اس درجہ مضطرب و سراسیمہ ہوں۔ جو بیدار مغز حکومت ایک لاکھ روپیہ سرحد پر روزانہ خرچ کر کے بعض فرضی خطروں کا سد باب کرتی ہے کیا وہ اتنی بیہوش اور کم خرد ہو گئی ہے کہ وہ اپنے حفظ و بقا کی ریڑھ کی ہڈی کو یونہی اعدا کے حملوں کا ہدف بننے کے لئے چھوڑ دے گی۔" (الاصلاح۔ سرائے میر۔ مورخہ جولائی ۳۸ء)

آگے چل کر مولانا فرماتے ہیں:-

"اگر آپ سچ مچ مسلمانوں کو منظم کرنا چاہتے ہیں۔ تو ان کو کسی اکثریت و اقلیت کے خطروں سے ڈرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف اللہ سے ڈرائیے۔"

پھر ایک طویل بحث کے بعد آیات قرآنی سے استدلال کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ:-

"تمہارے سامنے بھی ہمت آزمائی اور عمل کا ایک میدان یعنی یہی "آزادی کی جنگ" ! ہے جس میں اگر داخل ہو جاؤ تو فتحمندی تمہارے ہی بس میں ہے۔ لیکن اکثریت کے خوف اور اس کے سامان اور روپیہ کی کثرت نے تم کو سراسیمہ کر دیا ہے۔ اس لئے عزم و ہمت سے محروم ہو کر تم پست ہمتی کی خاک مذلت پر لوٹ رہے ہو" (حوالہ مذکور)

دیکھئے! یہاں خود ہماری قوم کا ایک اہل قلم ہمارے مقدمہ کی کس قدر غلط ترجمانی کر رہا ہے۔ جس عینک سے پنڈت جواہر لال نہرو مسلمانوں کے معاملہ کو دیکھتے ہیں۔ ٹھیک، وہی عینک خود ہمارے ایک بھائی نے اپنی آنکھوں پر لگالی ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ یہاں اس عینک پر روسی کارخانے کے بجائے قرآنی رصدگاہ کا لیبل لگا ہوا ہے تاکہ مسلمان بے چارہ بچاؤ کی کوئی راہ نہ پاسکے، دنیا سے تو گیا ہی تھا، دین کی عدالت سے بھی گمراہی کا فتوی سنے!

جس حکومت کی مہربانیوں کا اس قدر لطیف پیرایہ میں اوپر ذکر فرمایا گیا ہے، اس کی سب سے بڑی مہربانی ہمارے حال زار پر یہ ہے کہ اس نے ڈیماکریسی کے انگریزی اصول ہندوستان میں رائج کئے ہیں۔ جن کی رو سے دو مسلمانوں کے مقابلہ میں ۶ غیر مسلموں کی رائے بہرحال صحیح ہے، اور حکومت ہمیشہ اسی رائے کے مطابق چلے گی جو ڈیماکریسی کے اس قاعدے کی بنا پر صحیح قرار پائے۔ مہربان سرکار کی لائی ہوئی اس نعمت کو آگے بڑھکر وہ غیر مسلم قبول کر لیتے ہیں جو "ہمت آزمائی اور عمل" کے میدان میں دادِ مردانگی دے رہے ہیں، کیونکہ اس میں سراسر انہی کی "فتحمندی" ہے۔ مسلمان اس پر ناک بھوں چڑھاتا ہے تو وہی غیر مسلم اپنی "فتحمندانہ" پوزیشن رکھنے کے لئے مسلمان پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ یہ سب کچھ انگریز کے اشارے سے ہو رہا ہے۔ خود غرضانہ نقطۂ نظر سے غیر مسلموں کا یہ کہنا بالکل حق بجانب کیونکہ ان کو اپنے مفاد کی حفاظت کے لئے ہر ممکن تدبیر کرنی چاہئے۔ مگر یہ مسلمانوں کی بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے کہ خود ان کے اپنے بہت سے ممتاز افراد بھی اس معاملہ میں غیر مسلموں کے ہمنوا بن جاتے ہیں۔ سرکار برطانیہ کی لائی ہوئی ڈیموکریسی کی لعنت تو ان کو نعمت نظر آتی ہے۔ مگر اس لعنت سے بچنے کے لئے مسلمان اگر کوئی کوشش کرتے ہیں۔ تو ارشاد ہوتا ہے۔ کہ اکثریت و اقلیت کا سوال

چھیڑنے کے معنی انگریزی اقتدار کی حفاظت کے ہیں۔

پھر لطف یہ ہے کہ ایک طرف تو ڈیموکریسی کا یہ قاعدہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ دو مسلمان چاہے وہ موسیٰ و ہارون ہی کیوں نہ ہوں، باطل پر ہیں، اگر ان کے مقابلہ میں فرعون یا سامری کی امت کے چھ آدمی مخالفانہ رائے دیں، اور دوسری طرف یہ بھی ارشاد ہوتا ہے کہ "مسلمانوں کو اکثریت و اقلیت کے خطروں سے ڈرانے کی ضرورت نہیں، صرف اللہ سے ڈرنا چاہیئے" اور یہ ہدایت بھی فرمائی جاتی ہے کہ اگر ڈیماکریسی کے اس قاعدے کو قبول کر کے تم "ہمت آزمائی اور عمل کے میدان میں کود پڑو گے تو "فتحمند" ہو گے۔ ورنہ یونہی "پست ہمتی کی خاک مذلت" پر لوٹتے رہو گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انگریز اور ہندو مل کر جو زہر تم کو کھلا رہے ہیں ہمت کر کے اسے کھا جاؤ، انشاء اللہ تم کو شہادت کا درجہ نصیب ہو گا جو عین "فتحمندی" ہے، ورنہ اس زہر کو کھانے سے اگر تم نے انکار کیا، اور لَا یَسْتَوِی الْخَبِیْثُ وَالطَّیِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَۃُ الْخَبِیْثِ کے قرآنی اصول پر پست ہمتوں کی طرح اصرار کرتے رہے، تو "اولوالالباب" تم کو جواہر لال نہرو کے ساتھ مل کر طنز و تعریض کی لطیف زبان میں "سرکار برطانیہ کے ٹوڈی" کا طعنہ دیں گے۔

سب سے آخر میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ایک تحریر ملاحظہ ہو۔ جن کا انقلاب حال میرے نزدیک مسلمانوں کے لئے اس صدی کی سب سے بڑی ٹریجڈی ہے۔ پچھلے سال جب کانگرس کے ایوان سے مسلم ماس کانٹیکٹ کا علم اٹھایا گیا تو اس کے ساتھ ہی مولانا کا ایک سپہ سالارانہ خطبہ بھی اخبارات میں شائع ہوا۔ اس میں یہ ارشاد فرمانے کے بعد کہ "مسلمانوں کو اگر کانگرس میں شریک ہونا چاہیئے تو صرف اس لئے کہ ادائے فرض کا مشروط تقاضا یہی ہے"، مولانا اپنی تمام تقریر اس انداز میں فرماتے ہیں کہ یا تو مسلمان اس تحریک میں آنکھیں بند کر کے شریک ہو جائیں۔ جس کی اساس وطنی قومیت اور ڈیماکریسی کے انگریزی نمونہ پر رکھی گئی ہے، یا نہیں تو وہ بزدل ہیں، کم ہمت ہیں۔ ........ اور ذلت کی موت مر جانے والے ہیں۔ پوری تحریر نقل کرنے کی یہاں گنجائش نہیں، مگر چند فقرے نقل کئے بغیر چارہ بھی نہیں ہے:

"ایک زمانہ تھا جب مسلمانوں نے کانگریس کی شرکت سے اس لئے انکار کر دیا تھا۔ کہ وہ سرے سے سیاسی اصلاح و تغیر کے مخالف تھے۔ انہیں یہ بات سمجھائی گئی تھی کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی اکثریت ہے اس لئے یہاں جو تبدیلی بھی جمہوری و نیابتی اداروں کے طریقہ پر کی جائے گی، ہندوؤں کے لئے مفید ہو گی مسلمانوں کیلئے مضر ہو گی۔ چنانچہ ۱۸۸۷ء میں لارڈ ڈفرن اور سر آکلینڈ کالون نے سر سید احمد خاں مرحوم کو یہی راہ دکھائی تھی اور اسی بنا پر انہوں نے کانگریس کی مخالفت کا اعلان کیا تھا۔ ....

"اب ملک اصلاحات کے لئے نہیں بلکہ کامل تبدیلی کے لئے لڑ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان تغیرات کے بعد اب کانگریس کی عدم شرکت کے لئے ۸۷ء والی بات سود مند نہیں ہو سکتی۔ ناگزیر ہے کہ کوئی دوسری ہی بات اختیار کی جائے۔ چنانچہ اب بعض حضرات نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے۔ کہ جب کبھی کانگریس کی تحریک میں شرکت کا سوال چھڑتا ہے یا خود کانگریس کا کوئی رکن مسلمانوں کو توجہ دلاتا ہے تو فوراً یہ حضرات فرقہ وارانہ حقوق اور تحفظات کا سوال چھیڑ دیتے ہیں ....

"انہیں خطرہ ہے کہ اگر برطانی اقتدار ملک میں باقی نہیں رہے گا یا بالکل کمزور پڑ جائے گا تو ہندو اکثریت ان کے حقوق پامال کر دے گی۔ .....

"خطروں اور تباہ حالیوں کی اس اندیشہ ناکی کا کن لوگوں کو یقین دلایا جا رہا ہے؟ ان لوگوں کو جو بلحاظ تعداد کے ہندوستان کی سب سے بڑی دوسری اکثریت اور بلحاظ معنوی قوی کے سب سے پہلی طاقتور جماعت ہیں! اور پھر ان تمام خطروں کا انسداد کیونکر ہو سکتا ہے؟ صرف اس طرح کہ انڈین نیشنل کانگریس ایک رزولیشن پاس کر دے۔ جونہی اس نے رزولیشن پاس کر دیا، خطروں اور تباہ حالیوں کا تمام بادل، جو آٹھ کروڑ انسانوں کے سروں پر چھایا ہوا ہے، معاً چھٹ جائیگا"

"انہیں اگر کانگریس میں شریک ہونا چاہئے تو صرف اس لئے کہ انہیں اپنے اوپر بھروسہ ہے اس لئے نہیں کہ دوسروں نے انہیں بھروسہ دلایا ہے، یا دوسرے بھروسہ دلا سکتے ہیں۔ اگر فی الحقیقت ان کی بے بسی اور بے چارگی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ خطروں اور تباہ حالیوں میں گھر گئے اور تحفظ کی راہ اس کے سوا کچھ نہ رہی کہ یا تو انگریزی اقتدار کے سہارے

جئیں یا کانگریس کے اطمینان دلانے پر اور خود ان کے اندر خود اعتمادی و ہمت کی ایک چنگاری بھی نہیں رہی جو ان کی ٹھنڈی رگوں کو گرم کر سکے۔ تو میں کہوں گا، ایسی زندہ لاشوں کے لئے یہی بہتر ہے کہ جہاں پڑی ہیں پڑی رہیں۔"......

مسلمانوں کی یہ تصویر وہ شخص کھینچ رہا ہے جو ایک زمانہ میں اسلامی ہند کی نشاۃ ثانیہ کا سب سے بڑا لیڈر تھا۔ ان کی مظلومی کا اس سے زیادہ دردناک منظر اور کیا ہو سکتا ہے کہ جو کبھی "الہلال" و "البلاغ" کا ایڈیٹر تھا۔ وہ آج ان کی اس قدر غلط ترجمانی کرے ---- مولانا کے مفروضات جن پر اس پورے خطبہ کی بنا رکھی گئی ہے۔ مختصر الفاظ میں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) سیاسی اصلاح و تغیر کے معنی محض اس تبدیلی کے ہیں جو انگریزوں کے رائج کئے ہوئے جمہوری و نیابتی اداروں کے طریقہ پر کی جائے۔ ایسی تبدیلی کی مخالفت جس مسلمان نے کی اس نے گویا نفس سیاسی اصلاح و تغیر کی مخالفت کی ---- یہ بات اس ہندو کے کہنے کی تھی جو انگریزی اصول جمہوریت و نیابت کو اپنے لئے مفید پا کر توہم پرستانہ جوش کے ساتھ قبول کرتا ہے۔ مگر وقت کی جادوگری کا تماشہ دیکھئے۔ کہ اس نظریہ کو مولانا ابو الکلام بیان فرما رہے ہیں اور محسوس تک نہیں کرتے۔ کہ فی نفسہ یہ نظریہ کس قدر پوچ اور بے اصل ہے۔

(۲) مسلمانوں کا یہ خیال غلط تھا۔ کہ ہندوستان میں جو تبدیلی انگلستان کے جمہوری و نیابتی ادارات کے نمونہ پر کی جائے گی وہ بربنائے اکثریت ہندوؤں کے لئے مفید اور بربنائے اقلیت مسلمانوں کے لئے مضر ہو گی۔ ---- سیاسیات کا طفلِ مکتب بھی بتا سکتا ہے کہ مولانا کا یہ مفروضہ محض بے اصل ہے اور بلا کسی غور و فکر کے انہوں نے اس بات کو قبول کر لیا ہے جو ہندوؤں کے سیاسی لیڈر جان بوجھ کر ہمیں بیوقوف بنانے کے لئے کہا کرتے ہیں۔ انگریزوں نے اپنے ملک کے جن جمہوری و نیابتی اداروں کو یہاں ہمارے سر منڈھا ہے ان کی بنا ہی اکثریت کی حکومت (Majority Rule) پر ہے اور ان کو جوں کا توں ایک ایسے ملک میں جہاں دو مختلف قومیں رہتی ہوں، رائج کرنے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ اکثریت حکمراں اور اقلیت محکوم ہو کر رہے۔ لہٰذا سید احمد خاں مرحوم کے

دور میں جو رائے قائم کی گئی تھی وہ ہرگز غلط نہ تھی۔ البتہ اگر کسی چیز کو غلط کہا جا سکتا ہے تو وہ ان کی وہ پالیسی ہے جو اس مصیبت سے بچنے کے لئے انہوں نے اختیار کی اور اس کو بھی اس زمانے کے حالات سامنے رکھکر غلط قرار دیتے ہوئے ایک صاحب فکر آدمی کو تامل کرنا چاہیئے۔

(۳) مسلمانوں نے کانگریس سے علیحدگی کا فیصلہ اس بنا پر کیا تھا۔ کہ لارڈ ڈفرن اور مسٹر آکلینڈ کالون نے سر سید احمد خاں مرحوم کو یہ راہ دکھائی تھی ـــــ مولانا کو شاید خبر نہیں کہ کانگریس کا قیام اور وہ اصول و مقاصد جن پر آج تک کانگریس چل رہی ہے، سب کچھ اسی لارڈ ڈفرن کی رہنمائی کا نتیجہ ہے، اور اس میں لارڈ رپن اور لارڈ ڈلہوزی اور اس عہد کے متعدد دوسرے انگریزی مدبرین کے دماغوں نے بھی کام کیا ہے۔ کم از کم اپنے ورکنگ کمیٹی کے رفیق ڈاکٹر پتابھی سیتا رامیا ہی کی "تاریخ کانگریس" مولانا نے پڑھلی ہوتی تو شاید اپنی قوم کے دامن پر دھبا لگانے کے لئے ہندوؤں کے کارخانہ روشنائی سے یہ سیاہی مستعار لیتے ہوئے ان کو کچھ نہ کچھ تامل ضرور ہوتا۔

(۴) "اب ملک اصلاحات کے لئے نہیں بلکہ کامل تبدیلی کے لئے لڑ رہا ہے" ـــــ یہ تحریر اس وقت لکھی گئی ہے جب اصلاحات جدیدہ کو قبول کر کے الکشن لڑائے جا چکے تھے، امپریلسٹ گورنمنٹ کے تحت صوبوں کی حکومت کا انتظام کرنے کے لئے کانگریس اپنی خدمات پیش کر چکی تھی، اور اس اقدام میں خود جناب مولانا بھی شریک تھے۔ پھر جب اپنے عمل سے آپ نے ثابت کر دیا کہ آپ کامل تبدیلی کے لئے نہیں بلکہ اصلاحات کیلئے اور ان اصلاحات کیلئے لڑ رہے ہیں جو انگریز اپنے مفاد کے لئے دے رہا ہے اور ہندو اپنے مفاد کے لئے لے رہا ہے۔ تو "کامل تبدیلی" کے لفظ بے معنی کو محض اس لئے دُہرانا کہ اس کے بغیر مسلمانوں کا منہ کالا نہیں کیا جا سکتا۔ مہاسبھائی ہندوؤں کو تو ضرور زیب دیتا ہے مگر مولانا کو زیب نہیں دیتا۔

(۵) مسلمانوں کی موجودہ پوزیشن یہ ہے کہ وہ یا تو انگریزی اقتدار کے سہارے جینا چاہتے ہیں اور اس فکر میں ہیں کہ انگریزی سنگینیں ان کی حفاظت کے لئے ہندوستان میں موجود رہیں یا پھر یہ چاہتے ہیں کہ کانگریس ان کو تحفظ کا زبانی اطمینان دلا دے ـــــ یہ بات ایک ہندو

امپیریلیسٹ کے کہنے کی تھی اور کہہ رہے ہیں اسے مولانا ابوالکلام۔ حقیقت میں تو پوزیشن اس وقت یہ ہے کہ دس سال کے بعد کانگریس اور ہندو مہاسبھا پھر اسی نقطہ پر جمع ہو گئی ہیں جس پر یہ نہرو رپورٹ میں جمع ہوئی تھیں۔ "انقلاب" کا ڈرامہ ختم ہو چکا ہے۔ اور اس کی جگہ وہی دستوری ارتقاء کا نصب العین برسرِ کار آ گیا ہے۔ جو ابتدا سے ان کے پیشِ نظر تھا۔ "دستوری ارتقاء" کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ انگریز اپنی سنگین سے مسلمان کو اس وقت تک دبائے رکھے جب تک ہندو اس کی جگہ لینے کے لئے کافی طاقتور اور کافی قابو یافتہ نہ ہو جائے۔
اب مسلمان جس فکر میں ہے وہ یہ نہیں ہے کہ انگریز کی طرف جائے یا ہندو کی طرف، بلکہ پریشان ہو کر یہ دیکھ رہا ہے کہ گھر کا ساتھی باہر کے غاصب کا اسسٹنٹ بن گیا ہے، باہر کا غاصب اس کو سنگین سے دبائے ہوئے ہے، اور گھر کا ساتھی اپنی رسیاں کھول کھول کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھتا چلا جاتا ہے، یہ وقت ایسا تھا کہ مولانا ابوالکلام جیسے لوگ اٹھ کر مسلمانوں کو ان دونوں بلاؤں کے مشترک عمل سے بچانے کی تدبیر کرتے، مگر مولانا ان کو الٹا اس بات پر مطعون فرما رہے ہیں کہ تم اس دام فریب میں پھنسنے سے دور کیوں بھاگے جا رہے ہو، ہمت کر کے اپنی گردن اور اپنے ہاتھ پاؤں اس کے پھندوں میں دے کیوں نہیں دیتے!
اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پروپیگنڈا کی طاقت کیسی زبردست طاقت ہے، اور جب کوئی نامساعد حالات میں گھر جاتی ہے تو اس پر باہر ہی سے نہیں، اندر سے بھی کیسے مصائب نازل ہوتے ہیں۔ جو تصویر اپنی اغراض کے لئے غیروں نے کھینچی تھی، وہ اب خود ہماری اپنی قوم کے دماغوں میں بیٹھتی چلی جا رہی ہے اور اس کو وہ لوگ ہماری اصلی تصویر کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں جن سے ہم توقع رکھتے تھے کہ وہ ہمارے سب سے بہتر نمائندے ہوں گے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ مولانا ابوالکلام یا مولانا حسین احمد یا مولانا سید سلیمان نے یہ باتیں جان بوجھ کر فرمائی ہیں؟ ہرگز نہیں فضا جن خیالات سے بھر دی گئی ہے، وہ غیر محسوس طور سے دماغوں میں نفوذ کر رہے، اور غیر ارادی طور سے زبانوں پر آ رہے ہیں۔ یہ ایک جادو ہے جو سر دل پر چڑھ کے

بول رہا ہے اور کیا بتا رہا ہے کہ کیسے کیسے عالی مقام سروں پر چڑھ کر کیا کچھ بول رہا ہے۔ فرقہ پرستی کا لفظ جو مغربی تصور قومیت کو پیش نظر رکھ کر وضع کیا گیا تھا۔ آج مسلمانوں کے علماء اور بڑے بڑے لیڈر اس لفظ کو خود مسلمانوں پر استعمال کر رہے ہیں "نیشنلزم" یا "قوم پرستی" کا لفظ آج بے تکلف افتخار کے انداز میں بولا جا رہا ہے گویا یہ تسلیم کر لیا گیا کہ ہندوستان "ایک" قوم ہے اور مسلمان، ہندو، عیسائی وغیرہ اس قوم کے فرقے ہیں "رجعت پسندی" اور "ٹوڈیت" کے الزامات اب خود مسلمانوں کی طرف سے مسلمانوں پر عائد کئے جانے لگے ہیں۔ اور یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ آزادی کے اس جہاد مقدس میں کود پڑنے سے احتراز بلکہ اس میں ادنیٰ تامل بھی اگر کسی چیز کا نتیجہ ہو سکتا ہے تو وہ بس رجعت پسندی و ٹوڈیت ہے، یا پھر بزدلی۔

اس طوفان کے شور و ہنگامہ سے دماغ اس درجہ متاثر ہو چکے ہیں کہ اب ان کو صبر و سکون کے ساتھ یہ سوچنے کی مہلت ہی نہیں ملتی کہ آخر وہ کیا چیز ہے جو مسلمان جیسی بہادر، عالی حوصلہ حریت پسند اور جنگ آزما قوم کو برابر دس سال سے اس جنگ میں اپنے شایان شان حصہ لینے سے روک رہی ہے؟ اور وہ کیا چیز ہے جس کی وجہ سے اپنوں اور غیروں کے اتنے طعنے اور ایسے سخت الزامات آئے دن سنتے رہنے کے باوجود اس قوم کے خون میں جوش نہیں آتا؟ اگر اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ شاید یہ مسلمان کا قصور ہو، تو اس کی ایک دوسری ممکن وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شاید اس "جنگ آزادی" میں کوئی کھوٹ ہو، شاید یہ "شیران بیشۂ حریت" اس جنس کے شیر نہ ہوں جن سے "اسد اللہ" میل کر سکتا ہے اور کر تا رہا ہے۔ شاید اس آزادی کی فوج میں وہ خصوصیات ہوں جنہیں دیکھکر مسلمان کا ضمیر یہ فیصلہ کر رہا ہو کہ ان کے ساتھ چل کر میں اپنی منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکوں گا۔ کم از کم امکان تو دونوں پہلوؤں کا ہے۔ پھر آخر یہ پروپیگنڈا کی طاقت اور نامساعد حالات کی مہربانی نہیں تو کیا ہے جس کی بدولت رفتہ رفتہ دماغوں پر پہلی شق کا امکان جزم و یقین بنکر مسلط ہوتا جا رہا ہے اور دوسری شق کے متعلق اب طوفان میں بہنے والی کشتی کے مسافروں اور کھیونوں میں سے کسی کو بھی یاد نہیں

آتا کہ اس کا بھی کوئی امکان ہے۔

میں آئندہ صفحات میں ناقابل تردید واقعات و شواہد سے ثابت کروں گا کہ فی الواقع صورت حال یہی دوسری ہے، اور مسلمانوں کو اسی صورت حال نے اپنے اہل وطن کے ساتھ سیاسی جد و جہد میں حصہ لینے سے روک رکھا ہے۔ اس بحث سے میرا مقصد ایک طرف تو عام مسلمانوں کے تصورات کو واضح کرنا ہے کیونکہ وہ حالات کو دیکھ دیکھ کر پریشان تو ہو رہے ہیں مگر ابھی تک ان خطرات اور مشکلات کو پوری طرح سمجھے نہیں ہیں جن میں وہ اس وقت گھر گئے ہیں، اور اسی وجہ سے انہیں اپنی نجات کا صحیح راستہ پانے میں مشکل پیش آرہی ہے۔ دوسری طرف میں انصاف پسند غیر مسلموں کو بھی یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے اصلی احساسات کیا ہیں، ان کا ذہن کس طرح کام کر رہا ہے اور ہندوستان کی موجودہ سیاسی تحریکات کس طرح مسلمان کے مزاج، اس کے مفاد اور ان اصولوں کے خلاف چل رہی ہیں جن پر وہ ایمان رکھتا ہے۔ ان باتوں کو اگر وہ سمجھ لیں تو انہیں معلوم ہو جائے کہ مسلمان کا مقدمہ ایسا مہمل نہیں ہے جیسا اس کے غلط نمائندے پیش کر رہے ہیں، بلکہ درحقیقت وہ بالکل صحیح بنیاد پر لڑ رہا ہے اور لڑنے پر مجبور کر دیا گیا ہے۔ تیسری طرف اس بحث میں میرے پیش نظر یہ مقصد ہے کہ ان حضرات علماء کو ان کی غلطی پر متنبہ کر دوں جو مذہب کے نام سے مسلمانوں کو پشت بمنزل چلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں ان کو اصل حقائق سے روشناس کرانا چاہتا ہوں۔ جس جنگ آزادی کو وہ اتنا مقدس سمجھ رہے ہیں، میں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ درحقیقت کس نوعیت کی جنگ ہے۔ جس آزادی کی فوج کو وہ سمجھ رہے ہیں کہ راہ حق پر گامزن ہے، میں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ دراصل کس راہ پر جا رہی ہے اور مسلمان قوم بحیثیت مسلمان ہونے کے چند قدم سے زیادہ اس راہ پر اس کے ساتھ نہیں چل سکتی۔ جس طریق کار کو وہ بالکل صحیح طریق کار سمجھ کر اختیار کر رہے ہیں، میں بتانا چاہتا ہوں کہ وہ خدا اور رسول کے بتائے ہوئے طریق کار کے بالکل خلاف ہے۔ یہ سب کچھ عرض کرنے کے بعد میں ان سے درخواست کروں گا کہ اس کو ٹھنڈے دل سے پڑھیں۔ انصاف کی نظر سے دیکھیں۔

اور اس نور علم و بصیرت سے جو خدا نے ان کو دیا ہے کام لے کر اپنے حال پر غور کریں کہ کیا وہ مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کر رہے ہیں؟ اگر ان کا ضمیر گواہی دے کہ یہ رہنمائی غلط ہے۔ تو انہیں بلا لحاظ اس کے غلط راستہ پر کتنی دور جا چکے ہیں، الٹے قدم واپس ہونا چاہیئے۔ اور راہ راست معلوم کرنے کے لئے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ اور عقل سلیم کی طرف رجوع کرنا چاہیئے۔ اور اگر انہیں اس پر اصرار ہو کہ وہی راستہ صحیح ہے جس پر وہ چل رہے ہیں اور مسلمانوں کو چلانا چاہتے ہیں۔ تو میں ان سے مطالبہ کروں گا کہ پہلے وہ دلائل سے اپنا حق بجانب ہونا ثابت کریں۔ محض شخصیتوں کے درمیان تقابل کرنا، یا سیاسی پارٹیوں کی گذشتہ و موجودہ روش کے درمیان موازنہ کرنا، یا ترے جذبات سے سپہ سالارانہ انداز میں اپیل کرنا کوئی استدلال نہیں ہے۔ اور نہ اس سے احقاق حق یا ابطال باطل ہوا کرتا ہے۔ براہ کرم حقائق اور واقعات کی دنیا میں آیئے جو حقائق میں پیش کر رہا ہوں، یا تو یہ ثابت کر دیجئے کہ وہ حقائق نہیں ہیں، یا پھر ان حقائق کو تسلیم کرکے دلیل و حجت سے —— حجت خواہ عقلی ہو یا نقلی، مگر بہر حال ہو حجت — ثابت کیجئے کہ ان کے باوجود وہی راہ صحیح ہے جو آپ نے اختیار کی ہے۔

یہ کوئی چیلنج نہیں ہے، بلکہ دراصل اس احساس ذمہ داری سے، ایک اپیل ہے جو ہر مسلمان کے دل میں ہوتا ہے، جس کی بنا پر وہ اپنے آپ کو ہر عمل کے لئے خدا کے سامنے جواب دہ سمجھتا ہے۔ پھر اس کا مقصد کسی گروہ کو ملزم بنانا اور قابل ملامت ٹھیرانے کی کوشش کرنا بھی نہیں ہے، جیسا کہ ایک پارٹی کے لوگ دوسری پارٹی والوں کے مقابلے میں کیا کرتے ہیں۔ جو شخص یہ الفاظ لکھ رہا ہے وہ کسی پارٹی میں شامل نہیں اور اس نے آج تک خدائی پارٹی کے سوا کسی پارٹی کی طرف بھی مسلمانوں کو دعوت نہیں دی ہے۔ لہذا اس اپیل میں خواہ مخواہ پارٹی فیلنگ کی بو سونگھنے کی بھی کوشش نہ کی جائے۔ اس کے ساتھ ایک اور بات بھی صاف کہہ دینا چاہتا ہوں میرا یہ خطاب ائمہ سیاست کے مقتدیوں سے نہیں بلکہ اماموں سے ہے۔ ان جاہل مقتدیوں سے میں کسی بحث ہی نہیں

الجھنا چاہتا تھا جو محض جواب دینے کی خاطر جواب دیا کرتے ہیں۔ بات کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور بس اول نظر میں یہ دیکھکر کہ کہنے والا کچھ ان کی خواہشات کے خلاف کہہ رہا ہے جوابی بحث، اور بحث بھی نہیں بلکہ بازاریوں کی طرح حملے شروع کر دیتے ہیں۔

---

# غلط فہمیاں اور خام خیالیاں

مسلمانوں کے سامنے "آزادی" کا نام لے کر توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس دلفریب نام کو سن کر بیخود ہو جائیں گے اور حقائق سے آنکھیں بند کر کے ہر اس راستہ پر چل کھڑے ہوں گے۔ جسے "آزادی کا راستہ" کہہ دیا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمان بھی آزادی کے اتنے ہی خواہشمند ہیں جتنے ہندوستان کے دوسرے لوگ بلکہ مسلمانوں میں اس چیز کی تڑپ دوسروں سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ ان میں ایک قلیل جماعت ایسی ضرور ہو سکتی ہے جو اپنی اغراض کے لئے ہندوستان میں غیر ملکی اقتدار چاہتی ہو۔ ہندوؤں، سکھوں، پارسیوں اور ہندوستان کی دوسری قوموں میں بھی ایسی قلیل التعداد جماعتیں موجود ہیں۔ لیکن جمہور مسلمین میں شاید کوئی ایک شخص بھی آپ کو نہ ملے گا جو ہندوستان کو انگریزوں کا غلام دیکھنا چاہتا ہو۔ بلکہ اوسطاً ایک مسلمان دوسری تمام قوموں کی بہ نسبت انگریزیت اور اس کے اقتدار کو زیادہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اس کا مذہب ہی اسے یہ سکھاتا ہے کہ مادہ پرستی، شہوات کی بندگی اور ظلم و جور پر جس تہذیب اور جس سیاست کی بنا قائم ہو اس سے نفرت کرے۔ پھر اس کے دل میں آج تک یہ زخم تازہ ہے کہ اس ملک کی حکومت اسی سے چھینی گئی ہے اور اسی کو سب سے زیادہ پامال کیا گیا ہے۔ اس لئے نہ صرف فطرتاً، بلکہ تاریخی لحاظ سے بھی مسلمان سب سے بڑھ کر آزادیٔ وطن کا خواہشمند ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ آزادیٔ وطن سے مراد کیا ہے؟ کوئی قوم آزادی کیوں چاہتی ہے؟ یہ چیز فی نفسہٖ مطلوب ہے، یا کسی غرض کے لئے ناگزیر وسیلہ ہونے کی حیثیت سے مطلوب ہے؟

اگر وہ غرض حاصل ہونے کے بجائے الٹی نوٹ بٹ بی جاتی ہو تو کیا پھر بھی کسی قوم سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ "آزادی" کے نام پر دیوانہ وار دوڑتی چلی آئیگی؟ کیا ایسی "آزادی" کو وہ قوم بھی اپنے لئے آزادی سمجھ سکتی ہے جس کو حقیقت میں آزادی نہ مل رہی ہو؟ اور کیا اس قسم کی "آزادی" کیلئے جنگ، اور قربانی کرنا عقل، فطرت، دین کسی چیز کی رُو سے بھی کسی قوم کا فرض ہو سکتا ہے؟ یہ سوالات ہیں جن پر میدان جنگ میں قدم رکھنے سے پہلے ہر ذی عقل انسان غور کرنے پر مجبور ہے، اور مسلمان آخر ذوی العقول سے خارج تو نہیں ہے کہ ان بنیادی سوالات کو نظر انداز کر کے خواہ مخواہ اس بگل کی آواز پر لفٹ رائٹ شروع کر دے جو شیو گاؤں یا سوراج بھون سے پھونکا جائے۔

یہ ظاہر ہے کہ "آزادیٔ وطن" سے مراد ہمالیہ و گنگا و جمنا اور مشرقی و مغربی گھاٹوں کی آزادی نہیں ہے، یہ پہاڑ اور یہ دریا دس ہزار برس پہلے جیسے آزاد تھے ویسے ہی آج بھی ہیں اور قیامت تک رہیں گے۔ در اصل غلام یہ پہاڑ اور یہ دریا نہیں ہیں، بلکہ ہندوستان کے باشندے ہیں، اور آزادیٔ وطن سے مراد حقیقت میں وطن کے باشندوں ہی کی آزادی ہو سکتی ہے۔

پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ وطن جب ۳۵ کروڑ باشندوں سے آباد ہے تو صحیح معنوں میں "آزادیٔ وطن"، صرف اسی آزادی کو کہا جا سکتا ہے جو ان پورے ۳۵ کروڑ باشندوں کے لئے آزادی ہو۔ اہل وطن میں سے بعض کی آزادی اور بعض کی غلامی کو پورے وطن کی آزادی سے ہرگز تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ عموماً لوگ محض سہولت پسندی کی بنا پر بہت سے ایسے ملکوں کو "آزاد" کہہ دیا کرتے ہیں جن کے باشندوں کا ایک حصہ آزاد اور دوسرا حصہ خود اہل وطن کا غلام ہوتا ہے۔ مثلاً جس دور کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ہندوستان آزاد تھا اس میں درحقیقت "ہندوستان" آزاد نہ تھا۔ بلکہ ہندوستان کا آریہ آزاد تھا۔ شودر کی غلامی اس ملک کے باشندوں کی غلامی سے بھی ہزار درجہ زیادہ بدتر تھی جسے اصطلاحاً ہم غلام کہتے ہیں۔ آج امریکہ کو آزاد ملک کہا جاتا ہے حالانکہ امریکہ کی آزادی محض اس کے سفید فام باشندوں کی آزادی ہے، سیاہ فام باشندے کسی آزادی سے متمتع نہیں۔ اسی طرح روس کی آزادی صرف اس کے کمیونسٹ باشندوں تک محدود ہے۔ مسلمان، عیسائی اور تمام غیر اشتراکی بلکہ غیر اسٹالینی باشندوں کے لئے قطعاً کوئی آزادی نہیں، بلکہ ہماری

غلامی سے بھی بدتر غلامی ہے۔ جنوبی افریقہ کی آزادی محض اس کے فرنگی باشندوں کے حصہ میں آئی ہے۔ وہاں کی دیسی آبادی اور ہندوستانی آبادی اس درجہ غلام ہے کہ ہم اپنے آپ کو نسبتہً ان کے مقابلہ میں آزاد کہہ سکتے ہیں۔ جرمنی کی آزادی صرف آرین نسل کے لئے ہے، سامیوں کے لئے نہیں۔ چیکوسلواکیہ کی آزادی چند روز پہلے تک صرف چیک اور سلاوک باشندوں کے لئے مخصوص تھی، دوسروں کے لئے نہیں۔ ایسے ممالک کو اگر عرف عام میں آزاد کہا جاتا ہے۔ تو اس سے وہ تلخ حقیقت شیریں نہیں بن جاتی جو ان کے غلام باشندوں کو رات دن زہر کے گھونٹوں کی طرح حلق کے نیچے اتارنی پڑتی ہے۔

یہ ایک عام غلط فہمی ہے کہ محض غیر ملکی اقتدار سے آزاد ہو جانے کا نام "آزادی" رکھ دیا گیا ہے، حالانکہ یہ آزادی کی تمام حقیقت نہیں ہے، بلکہ صرف اس کا مقدمہ ہے۔ آزادی کا اصلی جوہر تو حکومت خود اختیاری سے متمتع ہونا اور اپنی اجتماعی خواہشات و ضروریات کو پورا کرنے پر آپ قادر ہونا ہے۔ یہ چیز اگر ملک کے کسی گروہ کو حاصل نہ ہو۔ اگر اس کی نکیل اپنے ہی وطن کے کسی دوسرے گروہ کے ہاتھ میں رہے کہ جس طرح وہ چاہے اسے اُٹھائے اور بٹھائے اور جس طرف چاہے اسے چلائے جائے اور جو کچھ چاہے اس پر لاد دے، تو وہ حقیقت میں غلام ہی ہوگا اس کے لئے ملک کی آزادی محض بے معنی ہوگی۔ غلامی اپنی حقیقت اور فطرت کے لحاظ سے بہر حال ایک ہی چیز ہے۔ اس میں اس لحاظ سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ وہ غیر ملک والوں کی غلامی ہے یا اہلِ وطن کی۔ اگرچہ تجربہ سے یہی ثابت ہُوا ہے کہ کمیت و کیفیت کے اعتبار سے اہلِ وطن کی غلامی بہ نسبت غیر ملکیوں کی غلامی کے زیادہ شدید ہوتی ہے۔ مثلاً جو سلوک امریکہ کا سفید فام اپنے حبشی اہل وطن کے ساتھ کرتا ہے، یا جو برتاؤ روس کا اسٹالینی اپنے غیر اسٹالینی یا غیر اشتراکی اہلِ وطن سے کر رہا ہے۔ اس کو کوئی نسبت اس طرز عمل سے نہیں جو ہندوستان میں انگریزوں نے ہمارے ساتھ اختیار کیا ہے۔ تاہم دونوں قسم کی غلامیوں میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینے کا سوال ہرگز پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ غلامی بہر حال ایسی چیز ہے کہ اسے دفع کرنے

کی کوشش ہی کرنی چاہئے۔ پس جو شخص اہل وطن کی غلامی کو غیر ملکیوں کی غلامی پر ترجیح دیتا ہو، اور دوسری قسم کی غلامی کو محض پہلی قسم کی غلامی میں بدل لینے کا نام "جنگ آزادی" رکھے، اور ایسی جنگ آزادی میں شریک ہونے کو فرض قرار دے، وہ دراصل جنت الحمقاء کا باشندہ ہے۔ کوئی صاحب عقل انسان اس کی پیروی نہیں کر سکتا۔ نہ ایک پوری کی پوری قوم اتنی بیوقوف ہو سکتی ہے کہ وہ صرف غیر ملکی اقتدار سے آزاد ہونے کے لئے میدان جنگ میں کود پڑے، اور یہ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھے کہ آزادی کے اصلی جوہر میں بھی اس کا کوئی حصہ ہے یا نہیں۔

ایک وطن کے باشندوں کو محض اس واقعہ کی بنا پر کہ وہ ایک وطن کے باشندے ہیں، تمام حیثیات سے ایک سمجھ لینا، اور اس مفروضہ پر ملک کی آزادی کو ان سب کے لئے یکساں آزادی قرار دینا، یا تو جہالت ہے یا پھر خطرناک قسم کی چالاکی۔ بہت سے لوگ اسی مفروضہ کو سامنے رکھ کر بے تکلف کہہ جاتے ہیں کہ "بھائی! جب ملک آزاد ہو گا تو سب آزاد ہو جائیں گے" لیکن یہ مفروضہ ہر حال میں ہر جگہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ جہاں صرف ایک قوم رہتی ہو، مختلف گروہ اور ان گروہوں کے درمیان گروہی امتیازات نہ ہوں، اور سب باشندے اپنے عقائد، جذبات و احساسات (Sentiments)، رسوم و رواج، قوانین معاشرت اور طرز زندگی کے اعتبار سے ایک ہوں، یا کم از کم باہم متقارب ہوں، وہاں تو بلا شبہ کہا جا سکتا ہے کہ محض ملک کا آزاد ہو جانا ہی تمام باشندگان ملک کا آزاد ہو جانا ہے، کیونکہ وہاں اہل ملک کے درمیان الگ الگ گروہوں کا وجود ہی نہیں ہے جس کی بنا پر اس امر کا امکان پیدا ہوتا ہے کہ آزادی ایک گروہ کے پاس اٹک کر رہ جائے اور دوسرے گروہ تک نہ پہنچ سکے۔ لیکن جس ملک کے باشندوں میں ایک سے زیادہ گروہ موجود ہوں اور ان کے درمیان نسل یا رنگ، یا زبان، یا عقائد، جذبات اور طرز زندگی کے بین اختلافات موجود ہوں، وہاں اس امر کا امکان ہے کہ آزادی کی دولت کو ایک گروہ اچک لے اور دوسرے گروہ، یا گروہوں کو اس سے محروم کر دے۔ ایسی جگہ وہ مفروضہ نہیں چل سکتا جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ وہاں ہر گروہ کو یہ پوچھنے کا حق ہے، اور اگر وہ اپنے وجود کو

عزیز رکھتا ہے تو اسے پوچھنا چاہئے کہ آزادی حاصل کرنے کا کونسا طریقہ اختیار کیا جارہا ہے، اور جس آزادی کے لئے جد و جہد کی جارہی ہے وہ کس نوع کی آزادی ہے۔ پھر اگر واقعات سے کسی گروہ پر یہ ثابت ہو جائے کہ حصولِ آزادی کا وہ طریقہ اختیار کیا جارہا ہے جو اس کے اجتماعی وجود کو نقصان پہنچانے والا ہے، اور ملک کی آئندہ حکومت ایسے اصولوں پر تعمیر ہو رہی ہے، جن کی بدولت حکمرانی کے اختیارات سے وہ لازمی طور پر محروم ہو جاتا ہے تو اس سے ہرگز یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ ایسی جنگ آزادی میں حصہ لے گا۔ ایسی آزادی کو ملک کی آزادی کہنا حقیقت کے خلاف ہے۔ جس گروہ کے لئے یہ آزادی نہیں بلکہ غلامی ہے، اور جس گروہ کے لئے یہ زندگی نہیں بلکہ موت ہے وہ آخر کیوں اس کے حاصل کرنے میں حصہ لے؟

اس مرحلے پر پہنچ کر ہم سے دو مختلف باتیں کہی جاتی ہیں، اور ضرورت ہے کہ ہم ان پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ کہا جاتا ہے کہ ملک کی آزادی کا لازمی نتیجہ خوشحالی ہے، اور یہ خوشحالی جب آئے گی تو تمام باشندے اس سے متمتع ہوں گے۔ تعلیم عام ہو گی۔ تمدن ترقی کرے گا۔ صنعت و حرفت اور تجارت کو فروغ ہو گا، معیارِ زندگی بلند ہو گا۔ اور اقوام عالم کے درمیان اہل ملک کی عزت بڑھے گی۔ یہ فوائد ظاہر ہے کہ ملک کے تمام باشندوں کو حاصل ہوں گے۔ پھر کیوں نہ ملک کے ہر گروہ کو ان فوائد سے یکساں دلچسپی ہو اور کیوں نہ وہ ان کے حصول کے لئے مل کر جد و جہد کریں؟

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ملک کی خوشحالی اور ترقی کے لئے آزادی ناگزیر ہے، اور آزادی کے حصول میں مختلف گروہوں کا وجود اور ان کے امتیازات مانع ہیں، لہٰذا کوشش کرنی چاہئے کہ ان گروہوں کو اور ان کے امتیازات کو مٹا کر تمام اہل ملک کو ایک کر دیا جائے۔ کیونکہ جب تک یہ باقی رہیں گے ملک آزاد نہ ہو سکے گا اور جب تک ملک آزاد نہ ہو گا، تمام اہل ملک خواہ وہ کسی گروہ سے تعلق رکھتے ہوں، یکساں بدحالی افلاس، جہالت، اخلاقی اور ذہنی پستی میں مبتلا رہیں گے کیا تم ان حالات کو دائما برقرار رکھنا چاہتے ہو۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایک ملک کے باشندوں میں عقائد، جذبات، طرزِ زندگی، زبان، ادب،

اور تہذیب و تمدن کے اختلافات غیر حقیقی اور مصنوعی ہیں۔ ان کو زندگی کے اہم تر مسائل سے کوئی علاقہ نہیں۔ زندگی کے اہم تر مسائل یہ ہیں کہ لوگوں کو کھانے کے لئے مل رہا ہے یا نہیں؟ ان کے لئے زندگی کی ضروریات پوری کرنے اور مزید برآں زندگی کی آسائشوں سے متمتع ہونے کے مواقع موجود ہیں یا نہیں؟ ان کے ملک میں دولت آفرینی کے جو وسائل موجود ہیں ان سے کس قدر فائدہ اٹھایا جا رہا ہے؟ اور جو دولت وہ پیدا کر رہے ہیں وہ کس طرح تقسیم ہو رہی ہے؟ ان اہم تر مسائل کا تعلق تمام باشندگان ملک سے یکساں ہے اور ان میں ان سطحی اختلافات کا کچھ دخل نہیں جن کا تم ذکر کرتے ہو لہذا یہ اختلافات اگر موجود بھی ہیں تو انہیں نظر انداز کر دینا چاہئے۔ اور تمام باشندگان ملک کو ایک قوم فرض کر کے زندگی کے ان مسائل کو ان کو حل کرنا چاہئے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تہذیب و تمدن کے بقاو قیام اور عروج و ارتقاء کا انحصار بھی معاشی فلاح اور سیاسی آزادی پر ہے۔ یہ چیز اگر حاصل نہ ہو تو کوئی تہذیب زندہ نہیں رہ سکتی، کجا کہ ترقی کر سکے۔ لہٰذا تہذیب و تمدن کا مفاد بھی اس امر کا مقتضی ہے کہ ملک کے تمام گروہ مل کر پہلے سیاسی آزادی اور معاشی فلاح کے لئے جد و جہد کریں۔

یہ مختلف باتیں کبھی مختلف زبانوں سے اور کبھی ایک ہی زبان سے سننے میں آتی ہیں۔ لیکن جب ہم ان پر غور کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اگر یہ ہم کو دھوکا دینے کے لئے نہیں کہی جا رہی ہیں تو ان کے کہنے والے خود دھوکے میں ہیں۔ وہ حقیقت کو طالب علم کی نظر سے نہیں دیکھتے، بلکہ مشنری کی نگاہ سے دیکھتے ہیں جو اپنی خواہش نفس کے اتباع میں گم ہو جاتا ہے۔

آج انسان اس دور سے آگے نکل چکا ہے جس دور میں وہ محض ایک جانور ہونے کی حیثیت سے بس اپنی جسمانی ضروریات کی تکمیل کا خواہشمند ہوتا تھا، اور یہ امر اس کی نگاہ میں کوئی خاص اہمیت نہ رکھتا تھا کہ یہ ضروریات کس ڈھنگ پر۔ . . . . . . کس صورت میں پوری ہوتی ہیں۔ اب اس کے لئے اپنی ہزارہا برس کی طے کی ہوئی مسافت کو الٹے پاؤں دوبارہ طے کرنا اور یکایک اسی دور وحشت و حیوانیت کی طرف پس پا ہو جانا محال ہے۔ اس طویل مدت میں اس کی عقل، اس کے مذاق، اس کے علم اور

اس کی قوت اجتہاد و اکتساب کے ارتقا سے انسانیت کے مختلف نمونے (Models) پیدا ہو چکے ہیں۔ ایک ایک قوم ایک ایک نمونے کو پسند کر کے اس پر اپنی اجتماعی شخصیت تعمیر کر چکی ہے۔ اور اس خاص نمونۂ انسانیت کو اپنی قومی ہیئت (National type) بنا چکی ہے۔ جو صدیوں کے نشوونما سے اس کے اندر پختہ ہوا ہے اب ایک قوم کی زندگی دراصل اس کے نیشنل ٹائپ کی زندگی ہے اور اس کے نیشنل ٹائپ کا مر جانا خود اس قوم کا مر جانا ہے۔ اگرچہ ضروریاتِ زندگی کا پورا ہونا، دولت حاصل کرنا اور اسے خرچ کرنا آج بھی ایک قوم کے لئے اتنی ہی اہمیت رکھتا ہے جتنی اہمیت آج سے دس ہزار برس پہلے رکھتا تھا۔ لیکن ان تمام معاملات کا دامن ہر قوم کے مخصوص نظریۂ زندگی، اس کے ضابطۂ اخلاقی، اس کے اصول معاشرت و تمدن، اور اس کے معیار قدر و قیمت کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ ہر قوم اپنی ضروریات کو اپنے ہی نیشنل ٹائپ کے مطابق پورا کرنا چاہتی ہے۔ آپ محض "ضروریاتِ زندگی" کا نام لیکر کسی قوم سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے حصول کے لالچ میں وہ اپنے نیشنل ٹائپ کو تبدیل کر دے۔ کیونکہ اس کی تبدیلی دراصل قوم کی موت ہے کوئی قوم جس کی قومی سیرت مستحکم ہو چکی ہو وہ محض آسائشوں کے لالچ سے اپنے نیشنل ٹائپ کو بدل لینے پر آمادہ نہیں ہو سکتی۔ اور جو قوم اس پر آمادہ ہو جائے اس کے متعلق یہ یقین کے ساتھ جان لینا چاہئے کہ یا تو اس کا کیرکٹر ابھی بنا نہیں ہے، یا پھر وہ ایک ذلیل اور موقع طلب (Opportunist) قوم ہے جس کی سیرت پر کوئی اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

اس بنیادی حقیقت کو ذہن نشین کرنے کے بعد غور کیجئے کہ کوئی قوم آزادی کیوں چاہتی ہے اس سوال کا صرف ایک ہی جواب ممکن ہے، اور وہ یہ کہ اپنے نیشنل ٹائپ کی حفاظت اور اس کے نشوو ارتقا کی خواہش ہی دراصل آزادی کی طلب کا مبداء ہے، جو قوم غلام ہوتی ہے وہ اپنے نیشنل ٹائپ کو صرف یہی نہیں کہ ترقی نہیں دے سکتی، بلکہ اس کے برعکس اس کا نیشنل ٹائپ مضمحل ہو جاتا ہے۔ اگر کسی قوم کو اپنا نیشنل ٹائپ عزیز نہ ہو تو اس میں سرے سے آزادی کی خواہش پیدا نہ ہو گی۔ اور جس قوم میں آزادی کے لئے تڑپ پائی جاتی ہے، اس کی تڑپ کا کوئی سبب اس کے سوا نہیں

کہ وہ اپنے نیشنل ٹائپ کو عزیز رکھتی ہے، اسے فنا نہیں ہونے دینا چاہتی، اور اس کو ترقی دینے کی خواہشمند ہے۔ جب حقیقت یہ ہے تو وہ صرف ایک جاہل اور بیوقوف آدمی ہوگا جو آزادی حاصل کرنے کی خاطر کسی قوم کو اپنا نیشنل ٹائپ بدل دینے کے لئے کہے گا۔ اس سے بڑھکر اور کیا حماقت ہو سکتی ہے کہ جس چیز کی خاطر آزادی کی خواہش ایک قوم میں پیدا ہوا کرتی ہے، اسی چیز کو مٹانے کا خیال ظاہر کیا جائے اور پھر یہ توقع رکھی جائے کہ آزادی کی پکار اس قوم کے دل و دماغ کو اپیل کرے گی۔ کیا کوئی شخص نقصان اُٹھانے کی نیت سے تجارت کر سکتا ہے؟ کیا کوئی شخص مرنے کے لئے غذا کھا سکتا ہے؟ کیا کوئی شخص اس غرض کے لئے پانی کی طرف دوڑ سکتا ہے کہ اس کی پیاس بجھنے کے بجائے اس کا سینہ جل جائے؟ اگر یہ ممکن نہیں تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک قوم اپنے قومی وجود کو ختم کرنے کے لئے آزادی کی خواہش کرے حالانکہ آزادی اس کی مطلوب ہی صرف اس لئے ہو سکتی ہے کہ اپنے قومی وجود کو زندہ رکھے اور ترقی دے۔

بلاشبہ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ کوئی قوم اپنے نیشنل ٹائپ کی حفاظت اور ترقی کے لئے کچھ نہیں کر سکتی، جب تک کہ وہ آزاد نہ ہو جائے لیکن اس کے ساتھ یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ جس ملک میں متعدد قومیں مختلف قومی ہیئتوں کے ساتھ رہتی ہوں، وہاں مجرد ملک کی آزادی کو ہر ہر قوم کی آزادی نہیں کہا جا سکتا وہاں آپ کو صراحت کے ساتھ یہ بتانا پڑے گا کہ آزاد حکومت کی نوعیت کیا ہوگی۔ اگر آزاد حکومت کے لئے آپ کے پاس خالص جمہوریت کے اصول ہوں جن کے معنی اکثریت کی حکومت کے ہیں، تو لامحالہ یہ آنیوالی آزادی صرف اس قوم کے لئے آزادی ہوگی جو کثیر التعداد واقع ہوئی ہو۔ قلیل التعداد قوموں کے لئے اس کے معنی بجز اس کے کچھ نہ ہوں گے کہ وہ غیر ملکی اقتدار سے نکل کر خود اپنی ایک ہم وطن قوم کی تابع ہو جائیں۔ ایسی آزادی کو نہ تو قلیل التعداد قومیں اپنے لئے آزادی سمجھ سکتی ہیں اور نہ یہ توقع کر سکتی ہیں کہ اکثریت کی حکومت کے تحت رہ کر انہیں اپنے نیشنل ٹائپ کی حفاظت اور ترقی کا کوئی موقع مل سکے گا۔ آزادی کی جنگ میں ان کے لئے صرف اسی وقت کشش پیدا ہو سکتی ہے جب کہ آزاد حکومت کا ایک ایسا نقشہ ان کے سامنے پیش

کیا جائے جس میں ان کے لئے بھی حکومت خود اختیاری رکھی گئی ہو۔ اس لئے کہ صرف حکومت خود اختیاری ہی وہ چیز ہے جس سے کوئی قوم اپنے نیشنل ٹائپ کی حفاظت و ترقی کے لئے کچھ کر سکتی ہے۔ اور نیشنل ٹائپ کی حفاظت و ترقی ہی وہ واحد غرض ہے جس کے لئے کوئی قوم آزادی چاہتی اور آزادی کی خاطر لڑ سکتی ہے۔

رہا یہ قول کہ ملک کی خوشحالی میں تمام باشندگان ملک کا یکساں حصہ ہوگا خواہ ملک کا نظام حکومت اکثریت کے ہاتھوں میں ہی کیوں نہ ہو، تو یہ قطعاً غلط ہے۔ جہاں قومی امتیاز موجود ہو۔ وہاں ترجیح ہمجنس لازماً موجود ہوتی ہے۔ اور جہاں ترجیح ہم جنس پائی جاتی ہو وہاں صرف عقائد، جذبات طرز زندگی، زبان و ادب اور تہذیب و تمدن ہی کے معاملہ میں ایک قوم کا مفاد دوسری قوم سے مختلف نہیں ہوتا، بلکہ معاشی، سیاسی اور انتظامی معاملات میں بھی لازماً مختلف ہو جاتا ہے وہاں جس طرح ایک قوم اپنی تعلیم، اپنی معاشرت اور اپنی تہذیب کے سوال کو بے خوف و خطر دوسری قوم کے ہاتھ میں نہیں دے سکتی، اسی طرح وہ اپنی روٹی کے سوال کو بھی اس کے ہاتھ میں دیکر مطمئن نہیں ہو سکتی، اور نہ انتظامی و تشریعی ادارت میں اپنی نمائندگی کے سوال کو اس پر چھوڑ سکتی ہے جس جگہ ایک شخص پانی پینے اور کھانا کھانے کے لئے بھی یہ دیکھتا ہو کہ پانی لانیوالا اور کھانا بیچنے والا اس کا ہم قوم ہے یا نہیں، جہاں ایک شخص بازار میں خرید و فروخت کرتے وقت بھی دوکاندار کی قومیت پر نظر رکھتا ہو، جہاں ایک مزدور سے خدمت لیتے ہوئے، یا کسی آدمی کو ملازم رکھتے ہوئے بھی دیکھا جاتا ہو کہ اس مزدور یا اس امیدوار کا تعلق کس قوم سے ہے، وہاں یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا جاسکتا کہ ملک کے سارے باشندوں کا معاشی یا سیاسی مفاد یکساں ہے، اور کسی ایک قوم کے ہاتھ میں حکومت کے اختیارات سمٹ جانے سے دوسری قوم کے پیٹ کو کوئی خطرہ نہیں۔

پھر جیسا کہ میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں، یہ خیال کرنا بھی بالکل غلط ہے کہ دولت آفرینی اور تقسیم دولت اور معیار زندگی کی ترقی اور ضروریات زندگی کی فراہمی کے مسائل کا کوئی تعلق تہذیب و تمدن سے نہیں ہے۔ اس باب میں ہر جماعت اپنا ایک الگ مسلک اور الگ نقطۂ نظر رکھتی ہے

اور محض آسائش جسمانی کے لالچ سے اس بات پر آمادہ نہیں ہوسکتی کہ اپنے نقطہ نظر کو دوسرے نقطہ نظر سے بدل لے۔ آپ اشتراکی جماعت سے یہ توقع نہیں کرسکتے کہ وہ اپنے نظریات معیشت و اجتماع کو کسی لالچ کی بنا پر سرمایہ دارانہ نظریات سے بدل لیگی۔ اسی طرح آپ کو ایک مسلمان سے بھی یہ توقع نہ کرنی چاہیئے کہ وہ ان مسائل کو حل کرنے میں اپنے مخصوص نقطۂ نظر کو بدل دیگا اور اپنے آپ کو دوسروں کے حوالہ کردیگا کہ جس طرح چاہیں اس کے لئے دولت کی پیدائش اور اس کی تقسیم کے سوال کو حل کردیں، درآنحالیکہ یہ سوال اس کی تہذیب و تمدن کے نقشے کو بنانے اور بگاڑنے میں فیصلہ کن اہمیت رکھتا ہے۔

اس بحث سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے کہ جو لوگ "آزادی" کا لفظ زبان سے نکال کر یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمان اس نام کو سنتے ہی ان کی طرف دوڑے چلے آئیں گے، اور جب ان کی یہ توقع پوری نہیں ہوتی تو مسلمانوں کو بزدلی اور رجعت پسندی اور سامراج پرستی کے طعنے دیتے ہیں، وہ کس خام خیالی میں مبتلا ہیں۔ ہر قوم میں تھوڑے یا بہت افراد ایسے ضرور نکل آتے ہیں جو اپنے تخیلات و اوہام میں گم ہوکر اپنے قومی مفاد کو بھول جاتے ہوں اور ایسے افراد بھی ضرور پائے جاسکتے ہیں کہ جو دن کی روشنی میں بھی نمایاں حقائق کو نہ دیکھ سکتے ہوں مگر ایک پوری کی پوری قوم نہ اندھی ہوسکتی ہے۔ اور نہ بیوقوف۔ وہ کسی آواز پر دوڑ پڑنے سے پہلے یہ ضرور دیکھے گی کہ اس کو کس طرف بلایا جارہا ہے۔ وہ محض آزادی کی پکار پر فریفتہ نہیں ہوسکتی بلکہ عین اس کی عقل اور فطرت کا اقتضا ہے کہ اس پکار کی حقیقت پر غور کرے، اور یہ تحقیق کرے کہ آزادی حاصل کرنے کے لئے کونسا طریقہ اختیار کیا جارہا ہے اور پکارنے والے جس آزادی کے لئے جدوجہد کررہے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے۔

آئندہ صفحات میں انہی دو سوالات کی تحقیق کی جائے گی۔

---

# قوم پرستوں کے نظریات

خوش قسمتی سے ہمارے پاس ایک کتاب ایسی موجود ہے جس میں ہندوستان کے بین الاقوامی مسئلے اور اس کے حل، اور ہندوستان کی آزاد حکومت کے نقشے اور اس کے طریق حصول کے متعلق "قوم پرست" جماعت کے نظریہ کی پوری تشریح مل جاتی ہے۔ یہ کتاب پنڈت جواہر لال نہرو کی تصنیف ہے، جو نہ صرف کانگریس کے صدر رہ چکے ہیں، بلکہ گاندھی جی کے متوقع جانشین سمجھے جاتے ہیں۔ اگرچہ آگے چل کر ہم اس قوم پرستی کے تمام اساطین سے استفادہ کرنے والے ہیں، مگر بحث کی ابتدا بھارت بھوشن پنڈت جواہر لال کے افادات سے کرنا ہر آئینہ مناسب ہے۔

پنڈت جی کو یہ فخر حاصل ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے بین الاقوامی مسئلہ کا ایک نیا حل دریافت کیا ہے جس کی گہرائیوں تک یا تو ان سے پہلے کے ہندوستانی سیاست دانوں کی نظر نہ پہنچی تھی، یا ان میں ایسا انقلابی حل پیش کرنے کی جرأت نہ تھی۔ اس حل کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے سب سے پہلے ان نظریات کا تجزیہ کرنا ضروری ہے جن کو پنڈت جی نے بطور اصل موضوعہ کے تسلیم کر لیا ہے اور پھر انہی پر اس پالیسی کی بنیاد رکھی ہے جسے وہ اس مسئلہ کا صحیح حل سمجھتے ہیں۔ میں ان نظریات کو ترتیب وار بیان کروں گا، تاکہ اس پالیسی کی پیدائش اور اس کے ارتقاء کا پورا نقشہ آپ کے سامنے آجائے۔

پنڈت جی کے تصور کی ابتداء یہاں سے ہوتی ہے کہ وہ ہندوستان کی آبادی کو ایک قوم فرض کرتے ہیں۔ تاریخ یورپ اور سیاسیات یورپ کے مطالعہ سے ان کے ذہن میں قومیت کا صرف ایک ہی تصور پیدا ہوا ہے، اور وہ یہ کہ ایک جغرافی رقبہ کی تمام آبادی ایک قوم ہے اور اس کو ایک ہی قوم ہونا چاہئے۔ وہ دیکھتے ہیں۔ کہ فرانس ایک ملک اور

ایک قوم ہے جرمنی ایک ملک اور ایک قوم ہے، اٹلی، انگلستان، ہسپانیہ وغیرہ ایک ایک ملک اور ایک ایک قوم ہیں۔ اس مشاہدے کے دوران میں ان کی نظر اس حقیقت کی طرف نہیں جاتی کہ ان میں سے ہر ملک کے باشندے ایک اسپرٹ، ایک قسم کے تمدن اور کم از کم قریبی دور کی حد تک ایک قسم کی تاریخی روایات کے حامل ہیں، اور وہ تمام عناصر ترکیبی جن سے ایک قومیت وجود میں آتی ہے ان کے درمیان مشترک ہیں یا واقعات کی رفتار نے ان کو مشترک بنا دیا ہے۔ اور اس اشتراک ہی نے ان کے اندر یہ ہم آہنگی اور یگانگت پیدا کی ہے۔ ان سب حقیقتوں کو نظر انداز کر کے وہ ایک نہایت سطح بین آدمی کی طرح یہ فرض کر لیتے ہیں کہ ان سب ممالک میں قومیت کی اساس رشتہ وطنیت کا اشتراک ہے، اور اسی طرح سے ہر خاک وطن کی پیداوار کو ایک ہی قوم ہونا چاہیے۔ یہی تصور ہے جس کے تحت ان کے قلم سے یہ الفاظ نکلے ہیں:۔

"ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ بس یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم موجود ہے جو یکجا نہیں ہے منتشر ہے، مبہم ہے اور غیر متعین ہے۔ اب سیاسی نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نقطہ نظر سے یہ بہت دور از کار ہے اور بدقت قابل توجہ کہا جا سکتا ہے۔ مسلم قومیت کا ذکر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ہی نہیں، بس مذہبی اخوت کا رشتہ ہی ایک چیز ہے، اس لئے جدید مفہوم میں کوئی قومیت نشوونما نہ پا سکے۔"

(میری کہانی، جلد دوم صفحہ ۱۳۳۲ مکتبہ جامعہ دہلی)

اس عبارت سے صاف معلوم ہے کہ پنڈت جی کے ذہن میں ہندوستانی قومیت کا تصور کیا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ مطالعہ اور فہم کا قصور ہو، یا ہندوستان کو ایک قوم دیکھنے کی آرزو نے ان کے ذہن کو روشن ترین حقائق کے ادراک سے عاجز کر دیا ہو۔ بہر حال یہ واقعہ ہے کہ وہ قوم پرستی اور فرقہ پرستی کے الفاظ کو بالکل حقیقی معنوں میں لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہندوستان میں ایک ہی قوم رہتی ہے۔ اور یہ مسلمان، ہندو، عیسائی وغیرہ محض اس قوم کے فرقے ہیں۔ اسی بنا پر وہ ہندوستان کی ان جماعتوں کے اختلافات کو "فرقہ وارانہ" مسئلے سے تعبیر کرتے ہیں، اور

یہ بنیادی حقیقت ان کے ذہن کی گرفت میں آتی ہی نہیں کہ یہ مسئلہ دراصل فرقہ وارانہ نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے ۔۔ آپ چاہیں تو اسے بدقسمتی کہیئے اور بہت ہی ناگوار چیز سمجھئے۔ مگر ہے یہ حقیقت اور اس حقیقت کو نظر انداز کرنے میں پنڈت جی تنہا نہیں ہیں، بلکہ تمام "قوم پرست" ان کے شریک حال ہیں۔

تصورِ قومیت کے بعد دوسرا تصور جو صاحب موصوف کے دماغ پر حاوی ہے، وہ کارل مارکس کا فلسفۂ تاریخ ہے۔ یہاں اس فلسفہ کی تشریح کا موقع نہیں۔ مختصر یہ کہ جس طرح کسی بھوکے سے پوچھا گیا تھا کہ "دو اور دو کتنے ہوتے ہیں" تو اس نے کہا تھا کہ چار روٹیاں۔ اسی طرح معاشی مصائب کے مارے ہوئے اس فلسفی نے بھی دنیا کے تمام مسائل کا مرکز و محور صرف روٹی کے مسئلہ کو قرار دیا ہے۔ تاریخ کے تمام انقلابات میں اس کو معاشی طلب یا بھوک کے سوا کوئی قابل توجہ عامل (Factor) نظر نہیں آتا۔ اس کے نزدیک، جواہر لال نہرو کے الفاظ ہیں:۔

"دنیا کی ساری تاریخ کا خلاصہ یہ ہے کہ معاشی عامل ہی وہ قوت ہے جو جماعتوں اور طبقوں کے سیاسی خیالات کی تشکیل کرتی ہے۔" (ص۵۷)

اگرچہ پنڈت جی بقول خود کسی اذعانی عقیدے (Dogma) کے قائل نہیں ہیں، مگر مارکس کی اس تعبیر تاریخ کو انہوں نے وحی آسمانی کی طرح قبول کیا ہے۔ اور اس کے متعلق وہ فرماتے ہیں کہ "اب میرے نزدیک تاریخ کے معنی ہی بدل گئے۔ مارکس کی تعبیر نے اسے کہیں زیادہ روشن اور واضح کر دیا" (ص۱۴۹)

اپنے تصورِ قومیت کے ساتھ اس مارکسی فلسفہ کو ملا کر پنڈت جی یہ نظریہ قائم کرتے ہیں کہ اوّل تو ہندوستان کی تمام آبادی ایک قوم ہے۔ پھر اس قوم میں اگر کوئی حقیقی امتیاز و اختلاف ہو سکتا ہے تو وہ صرف معاشی بنیادوں پر ہو سکتا ہے۔ یہ ہندو اور مسلم اور عیسائی یعنی مذہب کی بنیاد پر جو اختلافات ہیں، یہ کسی طرح معقول نہیں ہیں۔ اختلاف کی فطری اور معقول بنیاد یہ ہے کہ قوم کے اندر جن کے پاس ایک روٹی ہو وہ سب ایک گروہ ہوں اور جن کے پاس دو روٹیاں ہوں وہ دوسرا گروہ ہوں، اور ہلم جرا پھر اگر ان کو لڑنا ہو تو روٹیوں پر لڑیں۔ بلکہ "اگر" کیا معنی، ان کو

اسی چیز پر لڑنا چاہئے۔

اسی نظریہ کی بنیاد پر ہندوستان جدید کا یہ لیڈر کہتا ہے:-

"معاشی نقطۂ نظر سے یہ (یعنی مسلم قومیت کا تخیل) بہت دور از کار ہے اور بدقت قابل توجہ کہا جا سکتا ہے" صلا ۳۳

"ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندوستان کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملتوں اور قوموں کے بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں ہے۔ آج جماعتوں اور ملتوں کی بنیاد (اقتصادی) قواعد پر رکھی جاتی ہے" (جواہر لال کا خطبۂ صدارت آل انڈیا نیشنل کنونشن منعقدہ مارچ ۱۹۳۷ء)

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ جب سارے ہندوستان کی آبادی ایک قوم ہے، اور اس قوم کے درمیان فرقے اور گروہ بننے کی وجہ محض معاشی اغراض ہی ہو سکتی ہیں، تو پھر یہ ہندو مسلم اور دوسرے فرقے پیدا کیسے ہو گئے؟ یہ معاملہ کیا ہے کہ غیر معاشی چیزوں نے ہندوؤں کو ایک "فرقہ" اور مسلمانوں کو دوسرا "فرقہ" بنا دیا اور ان کے درمیان غیر معاشی وجوہ نے اختلافات پیدا کر دیئے؟ یہاں موقع تھا کہ پنڈت جی خود اس نظریہ ہی پر نظر ثانی کرتے جسے انہوں نے مارکس کی "وحی" سے بے سوچے سمجھے اخذ کیا اور ازعانی عقیدے کے طور پر تسلیم کر لیا ہے۔ ان کے سامنے واقعات کی دنیا میں ایک کھلی ہوئی حقیقت موجود تھی جو شہادت دے رہی تھی کہ انسان کے جسم میں صرف معدہ ہی ایک عضو رئیس نہیں ہے۔ صرف بھوک ہی وہ چیز نہیں ہے جو اس کی ذہنیت اور اس کے خیالات کی تشکیل کرتی ہو، صرف معاشی عامل (Factor) ہی ایک عامل نہیں ہے جو انسانوں کو قوموں اور گروہوں کی شکل میں مجتمع کرتا اور ان کے درمیان اختلافات پیدا کرتا ہو۔ مگر انہوں نے تمام حقائق سے آنکھیں بند کر کے یہ رائے — عقلی و استدلالی نہیں بلکہ رجحانی و وجدانی رائے — قائم کر لی کہ یہ مذہبی تفرقہ ایک غیر فطری چیز ہے، اور اس مادۂ فاسد یعنی مذہب نے دخل اندازہ ہو کر "ہندوستانی قوم" کو ایک صحیح بنیاد (یعنی روٹی کی بنیاد)

کے بجائے، ایک غلط بنیاد (یعنی طرزِ خیال اور طریقِ زندگی کی بنیاد) پر متفرق کر دیا ہے۔

اس تصور کے زیر اثر وہ جگہ جگہ مذہب پر یوں غصہ اتارتے ہیں:۔

"جس چیز کو مذہب یا منظم مذہب کہتے ہیں اسے ہندوستان میں اور دوسری جگہ دیکھ دیکھ کر میرا دل ہیبت زدہ ہو گیا ہے میں نے اکثر مذہب کی مذمت کی ہے اور اسے اکثر مٹا دینے کی آرزو تک ظاہر کی ہے۔ قریب قریب ہمیشہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا، بے دلیل عقیدت اور تعصب کا، توہم پرستی اور لوگوں سے بے جا فائدہ اٹھانے کا۔ قائم شدہ حقوق اور مستقل اغراض رکھنے والوں کے بقا کا حامی ہے۔" (ص ۱۶۱)

مذہب کے خلاف نفرت و غضب کا اظہار "ہندوستانی قوم" کے اس لیڈر نے اتنی کثرت کے ساتھ کیا ہے کہ تمام تحریروں کو نقل کرنا ایک طویل عمل ہے۔ وہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں ہر اس موقع پر جہاں ہندو مسلم کا نام آتا ہے، چیں بجبیں ہو کر کہتے ہیں کہ "مذہب کو بیچ میں کیوں لاتے ہو؟" اس ارشاد سے ان کی مراد یہی ہوتی ہے کہ سیاسی، اجتماعی اور معاشی گروہوں میں مذہب کی بنیاد پر تفریق کرنا سرے سے غلط ہے۔ اس غلط بنیاد کو ڈھانا چاہیے، نہ کہ اس کو سامنے لا کر ایک قابل لحاظ چیز قرار دینا۔

ہندوستانی "قوم" میں فرقوں کے وجود اور ان کے باہمی اختلاف کی یہی ایک توجیہ ہمارے وطنی لیڈر کے پاس نہیں ہے۔ دوسری توجیہ اس سے بھی زیادہ دلچسپ ہے۔ وہ اس کو برطانوی امپیریلزم کی پیدا کردہ چیز سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ انگریزوں کو اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لئے ہندوستانی قوم میں اختلاف پیدا کرنے کی ضرورت تھی اسی لئے اور صرف اسی لئے یہ اختلافات موجود ہیں۔

دیکھئے! یہاں نظر کا کتنا بڑا پھیر ہو گیا ہے۔ اگر پنڈت جی ذرا سمجھ سے کام لیتے۔ تو یہ بات بآسانی ان پر واضح ہو سکتی تھی، کہ ہندوستان میں حقیقی اختلافات موجود تھے، انگریزوں نے ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں دو قسم کے لوگوں سے ان کو مدد ملی۔ ایک وہ خود غرض

لوگ جو اپنے ذاتی فائدے کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نزاعات کو بھڑکاتے اور پیچیدہ تر بناتے ہیں۔ جنہوں نے نہایت چالاکی سے اپنے آپ کو ان دونوں کا سرپرست اور نمائندہ بنالیا ہے، نہ اس لئے کہ ان کے اختلافی مسائل کو اطمینان بخش طریقہ پر حل کریں، بلکہ محض اس لئے کہ ان اختلافات کو دائما برقرار رکھکر اپنے ذاتی مفاد اور برطانی سلطنت کے مفاد کی خدمت کرتے ہیں دوسرے بیوقوف لوگ جو ان اختلافات کی حقیقت کو سمجھنے اور انہیں دانشمندی کے ساتھ حل کرنے سے انکار کرتے ہیں، اور اس طرح ان کے برقرار رکھنے میں مددگار بنتے ہیں۔ اگر پنڈت جی اس مسئلے کو دیکھتے تو انہیں راستہ صاف نظر آتا۔ لیکن وہ اپنے تخیل کی آنکھ سے اس کو دیکھتے ہیں، اور محض یہ دیکھکر کہ ملک کے چند خود غرض اور ترقی دشمن لوگ انگریزی حکومت کے ساتھ مل کر ہندو مسلمانوں کے اختلافی مسائل سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں، یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں۔ کہ درحقیقت ان اختلافی مسائل کی کوئی اصلیت نہیں ہے، بلکہ یہ صرف برطانوی امپریلزم اور اس کے ہندوستانی ایجنٹوں کی پیدا کردہ چیز ہے۔ اس بنا پر وہ جگہ جگہ "فرقہ وارانہ" مسئلے کے متعلق اس قسم کے خیالات کا اظہار فرماتے ہیں:۔

"ان کا (انگریزوں کا) ترپ کا پتہ فرقہ وارانہ مسئلہ تھا اور اسے انہوں نے خوب کھیلا"۔ (ص۲۰)

"فرقہ پروری کے پردہ میں دراصل ترقی دشمنی نہاں ہے"۔ (ص۲۳)

"اور اغراض کے اس ہجوم میں . . . برطانوی ہند کے نمائندوں کی سرداری عموماً آغاخاں کے حصہ میں آتی تھی"۔ ص۲۱



"اصل دقت فرقہ پروری نہیں ہے۔ اصل میں سیاسی ترقی دشمنی ..میں حائل تھی۔ اور فرقہ وارانہ مسائل کی آڑ میں کام کر رہی تھی"۔ ص۲۷

"حکومت روز بروز معاشرتی خرابیوں کی پشت پناہ بنتی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا میل جول ہندوستان کی سب سے زیادہ رجعت پسند جماعتوں سے رہتا ہے۔ جوں جوں اس کی سیاسی مخالفت بڑھتی جاتی ہے اسے عجیب عجیب حمایتی ڈھونڈھنے پڑتے ہیں۔ آج کل

برطانوی حکومت کے سب سے بڑے حامی انتہائی فرقہ پرست، مذہبی رجعت پسند اور اصلاح و ترقی کے دشمن لوگ ہیں۔ مسلمانوں کی فرقہ پرست اجماعتیں سیاسی، معاشی اور سماجی اعتبار سے انتہائی رجعت پسند ہیں۔ ہندو مہاسبھا بھی ان سے کچھ کم نہیں۔" (ص۱۷۵)

"فرقہ پرست رہنماؤں کا اتحاد ان لوگوں کے ساتھ ہو گیا ہے جو ہندوستان اور انگلستان میں سب سے زیادہ رجعت پسند لوگ کہے جا سکتے ہیں۔ اور یہ لوگ فی الحقیقت سیاسی، اور سیاسی سے بھی زیادہ تمدنی اصلاح و ترقی کے دشمن ہیں۔ ان کے جملہ مطالبات میں سے ایک بھی عوام الناس کے فائدے کے لئے نہیں ہے۔" (ص۳۱۱)

یہ اور ایسی ہی بہت سی تحریریں پنڈت جی کے انداز فکر پر صاف روشنی ڈالتی ہیں۔ ان کا انداز فکر یہ ہے کہ بیمار کا خود غرض طبیبوں اور عطاروں کے پھندے میں پھنس جانا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ دراصل بیمار ہی نہیں۔ ان کی رائے میں یہ تحقیق کرنے کی ضرورت ہی نہیں کہ آخر کیا چیز ہے جس کی وجہ سے ان مکار طبیبوں اور عطاروں کو اس بیمار پر ہاتھ صاف کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ سبب پر غور کرنے اور غلط معالجوں کے پھندے سے نکال کر خود صحیح علاج کرنے کی زحمت کون اٹھائے اس کا علاج بس یہی ہے کہ مرض کے وجود سے انکار کر دیا جائے۔

ہندوستان کے بین الاقوامی مسئلہ کی یہ دو توجیہیں کرنے کے بعد پنڈت جی ان دونوں کے درمیان رشتہ جوڑتے ہیں۔ ان کا نظریہ اب ترقی کر کے یہ صورت اختیار کرتا ہے کہ مذہب نے ہندوستانی "قوم" کو "فرقوں" میں تقسیم کیا ہے، انگریزی امپیریلزم (سامراج) کے لئے یہ تقسیم مفید ہے، اور سرمایہ دار زمیندار، اور تمام مستقل اغراض (Vested Interests) رکھنے والے طبقے سامراج کے ساتھ سازش کر کے اس تقسیم کو اپنی اور سامراج کی مشترک اغراض کے لئے استعمال کر رہے ہیں، لہٰذا مذہب اور سامراج، اور یہ خود غرض طبقے، تینوں باہمی قریبی رشتہ دار ہیں، تینوں قابل نفرت ہیں اور تینوں کو مٹا دینا چاہئے۔ اسی نظریہ کے تحت یہ ارشادات جگہ جگہ پنڈت جی کے قلم سے نکلے ہیں:-

"منظم مذہب (Organised Religion) بلا استثناء منتقل اغراض سے وابستہ ہوتا ہے اور یوں لازمی طور پر ایک ترقی دشمن قوت بنکر تغیر اور ترقی کی مخالفت کرتا ہے... حق ملکیت اور موجودہ نظام معاشرت کے متعلق اس کا رویہ یہی ہے۔" (ص ۶۵-۱۶۷)

"جیل میں برطانوی افسر صرف دو قسم کی کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ مذہبی کتابیں اور ناول یہ عجیب بات ہے کہ حکومت برطانیہ مذہب کی بڑی قدردان ہے اور بڑی بے تعصبی کے ساتھ ہر قسم کے مذہب کی ہمت افزائی کرتی ہے۔" (ص ۱۱۸)

"مذہب امن کا وعظ کہتا ہے لیکن اس کے باوجود ایسے نظام کی تائید کرتا ہے۔ جس کا دارو مدار ظلم پر ہے۔" (ص ۳۹۲)

ان تینوں دشمنوں کی سازش سے ہندوستان کو نجات دلانے اور اس ملک کو پھر جنت نشان بنا دینے کی جو صورت پنڈت جی کے پیش نظر ہے وہ حسب ذیل ہے:-

"پھر پھرا کر ہم اسی چیز پر پہنچ جاتے ہیں جس کے سوا اس مسئلہ کا اور کوئی حل نہیں یعنی ایک اشتراکی نظام کا قیام۔ پہلے قومی دائرے میں اور پھر ساری دنیا میں۔ ایسا نظام جس میں دولت کی پیدائش اور تقسیم ریاست کی نگرانی میں مفاد عامہ کے لحاظ سے کی جائے۔ یہ انقلاب کس طرح ہونا چاہیے؟ یہ ایک جداگانہ سوال ہے لیکن یہ بات بالکل واضح ہے۔ کہ جس میں پوری قوم بلکہ کل نوع انسانی کی بھلائی ہو وہ محض اس وجہ سے نہیں روکی جاسکتی کہ کچھ لوگ، موجودہ نظام سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس تغیر کے مخالف ہیں۔ اگر سیاسی یا تمدنی ادارے[1] اس تبدیلی کی راہ میں حائل ہیں تو ان کو مٹا دینا چاہیے۔" (ص ۲۱۹-۲۰)

"جبتک ہمیں تھوڑی بہت سیاسی آزادی حاصل نہ ہوگی، ہمارے لئے قوم پرستی کا تخیل ہی سب سے بڑا محرک عمل رہے گا... یہاں تک کہ لوگوں کے دل میں قوم پرستی کے جذبہ کی جگہ تدنی یا اجتماعی انقلاب (Social Revolution) کا جذبہ[2] پیدا ہو جائے۔" (ص ۱۲۵)

[1] مذہبی اداروں کا نام نہیں لیا گیا۔ مگر پچھلی تصریحات سے واضح ہے کہ فی الذہن وہ بھی مراد ہیں۔ [2] (حاشیہ صفحہ ۴۸ پر ملاحظہ کرو)

"بعض لوگ جو عدم تشدد کا عقیدہ رکھنے کے مدعی ہیں، کہتے ہیں کہ شخصی ملکیت کو اس کے مالکوں کی مرضی کے خلاف قومی ملکیت بنانے کی کوشش کرنا جبر ہے، اس لئے یہ عدم تشدد کے خلاف ہے۔ یہ کافی نہیں سمجھا جاتا کہ اکثریت موجودہ نظام میں تبدیلی چاہتی ہے۔ اس کے ساتھ یہ شرط لگائی جاتی ہے کہ جن لوگوں کو اس تبدیلی سے نقصان پہنچنے والا ہے انہیں بھی راضی کر لینا چاہیے۔ یہ امید رکھنا کہ ایک پورے طبقے یا پوری قوم کے عقاید بدلے جا سکیں گے یا اپنے حریفوں کو عقلی دلائل سے قائل کرنے یا ان کے جذبۂ انصاف کو ابھارنے سے باہمی مخالفت دور ہو جائیگی اپنے آپ کو دھوکا دینا ہے۔ یہ محض ایک فریب خیال ہے کہ مؤثر دباؤ ڈالے بغیر، یعنی جبر و تشدد سے کام لئے بغیر کوئی حاکم قوم محکوم ملک سے قبضہ اٹھائے گی۔ یا کوئی طبقہ اپنے اقتدار یا امتیازی حقوق سے دست بردار ہو جائے گا۔" (ص ۵۶-۵۸)

"دراصل جمہوری حکومت کے معنی یہ ہیں کہ اکثریت، اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھتی ہے۔"[1] (ص ۵۵)

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۷) یہ مقام ذرا تشریح کا محتاج ہے۔ اشتراکی نقطۂ نظر سے قوم پرستی (نیشنلزم) ایک غلط چیز ہے اشتراکیوں کا مقصد تمام دنیا میں اشتراکی انقلاب برپا کرنا ہے جس کی تشریح بابو سبھاش چندر بوس نے ہری پورہ کانگریس کے خطبۂ صدارت میں کی ہے جب تک ساری دنیا کی قوموں میں اشتراکی نظام قائم نہ ہو جائے، کسی ایک ملک میں اس کا قائم رہنا مشکل ہے۔ مگر پنڈت جی اور ان کے ہم خیال حضرات کی رائے یہ ہے کہ سردست بین الاقوامی اشتراکیت کو رہنے دو، سب سے پہلے اپنے ملک میں ہم کو سیاسی آزادی حاصل کرنی چاہئے۔ کیونکہ اس کے بغیر ہم بین الاقوامی اشتراکیت کیلئے کچھ نہیں کر سکتے۔ اور اپنے ملک میں سیاسی آزادی حاصل کرنے کیلئے ناگزیر ہے کہ ہم "قوم پرستی" کا مسلک اختیار کریں۔ [1] مطلب یہ ہے کہ پہلے ملک کی اکثریت کو اشتراکی خیال کا بنا لیا جائے، پھر جو لوگ اشتراکیت کے عقیدہ و مسلک کو قبول نہ کریں ان کو زبردستی اشتراکی نظام کی اطاعت پر مجبور کیا جائے

[1] ذرا کانگریسی "جمہوریت" کے اس تصور کو خوب سمجھ لیجئے۔

سوسائٹی کی موجودہ کشمکش یعنی قومی جنگ اور طبقات کی جنگ کا تصفیہ جبر کے سوا کسی اور صورت سے ممکن نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ پہلے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کا کام بہت بڑے پیمانے پر کرنا پڑے گا کیونکہ جب تک بہت بڑی جماعت ہم خیال نہ ہو جائے اس وقت تک نظام تمدن کو بدلنے کی کوئی تحریک مضبوط بنیاد پر قائم نہ ہو سکے گی لیکن اس کے بعد تھوڑے لوگوں پر جبر کرنے کی ضرورت ہوگی۔" صفحہ ۷-۴۶۹

یہ ہے وہ نقشہ جو ہندوستان کی نجات کے لئے اس کے سب سے بڑے لیڈر کے ذہن میں ہے "قومی حکومت" یعنی وہ حکومت جو مذہبی قومیتوں کو مٹا کر "قومی" بنائی جائے، آخری منزل مقصود نہیں ہے، بلکہ پہلا مرحلہ ہے، دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ مذہبی عقائد کے بجائے معاشی عقائد کی تبلیغ کرکے ایک عظیم اکثریت کو ہم خیال بنایا جائے۔ اس کے بعد تیسرا مرحلہ یہ ہے کہ جو اقلیت اس معاشی مذہب کی پیروی قبول نہ کرے اس کو ڈرا کر دھمکا کر، لوٹ مار اور قتل و غارتگری کرکے، وسیع پیمانہ پر اجتماعی ڈاکہ زنی کرکے نظام تمدن میں انقلاب پیدا کیا جائے۔ پھر آخری مرحلہ یہ ہے کہ تھرڈ انٹرنیشنل کے اصول پر تمام دنیا میں کمیونزم کی اشاعت اور اس کے قیام کا بیڑا اٹھایا جائے جس طرح تھوڑی مدت قبل روس نے اٹھا رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان سے جس بین الاقوامی اشتراکیت کا علم بلند کیا جائے گا اس کی ٹکر سب سے پہلے اس بین الاقوامی نظام اجتماعی سے ہوگی جو ہندوستان کے ہمسایہ ممالک میں پھیلا ہوا ہے، یعنی اسلام۔

پنڈت جواہر لال سمجھتے ہیں۔ کہ مسلمان بہادر ہیں، بھوکے ہیں، اور اس کے ساتھ ان کے اندر اشتراکیت کے عناصر پہلے سے موجود ہیں، لہٰذا ہندوؤں کی بہ نسبت وہ اشتراکی انقلاب کے لئے زیادہ اچھے سپاہی بن سکتے ہیں۔ مزید برآں وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف وہی لوگ زیادہ کامیابی کے ساتھ لڑ سکیں گے جن کے نام اور لباس مسلمانوں کے سے ہوں، لہٰذا وہ اشتراکیت کی لاگ سے مسلمانوں کو اپنی فوج میں بھرتی کرنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ اسی بنا پر ارشاد ہوتا ہے:

"میرے خیال میں عام مسلمان، عام ہندوؤں سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں، اس لئے کہ ان کے

نظامِ اجتماعی میں ایک حد تک آزادی پائی جاتی ہے اور اگر ان میں ایک مرتبہ بیداری پیدا ہو جائے تو غالباً وہ اشتراکیت کی راہ پر تیزی سے قدم بڑھائیں گے۔" (ص ۵۰۶)

ان الفاظ میں پنڈت جی نے اپنے اصل مقصد کو پوری طرح واضح کر دیا ہے۔ لیکن انہیں خوب معلوم ہے کہ مسلمانوں کو قوم پرستی اور پھر بین الاقوامی اشتراکیت کے نظام میں جذب کرنا آسان کام نہیں ہے۔ سب سے پہلے تو اسلامی قومیت کا تخیل اس راہ میں حائل ہے جس کی وجہ سے مسلمان، غیر مسلموں کے ساتھ ایک قومیت بنانے اور اس میں جذب ہو جانے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے۔ پھر اسلامی تہذیب کے ساتھ مسلمانوں کی شیفتگی ایک دوسری رکاوٹ ہے۔ کیونکہ مسلمان اپنی تہذیب کو تمام تہذیبوں سے بہتر سمجھتے ہیں اور اس کو کسی دوسری تہذیب سے بدل لینے پر آسانی کے ساتھ راضی نہیں ہو سکتے۔ اس کے بعد آخری اور اہم ترین روک یہ ہے کہ اسلام کا اجتماعی نظام (سوشل سسٹم) زندگی کے سارے شعبوں پر حاوی ہے جس کی وجہ سے مسلمان کسی دوسرے اجتماعی نظام کو اپنی زندگی کے کسی شعبے میں بھی اس وقت تک جگہ نہیں دے سکتے جب تک کہ وہ خود اسلام سے منحرف نہ ہو جائیں۔ ان مشکلات کو اچھی طرح سمجھ کر پنڈت جی نے اپنا نقشۂ جنگ بنایا ہے۔

ان کا پہلا حملہ اسلامی قومیت پر ہے۔ وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم سرے سے کوئی قوم ہی نہیں ہو۔ یہ محض برطانوی سامراج کا ایک داؤں، اور چند سامراجی ایجنٹوں کا پروپیگنڈا ہے جس نے تمہارے دماغ میں یہ ہوا بھر دی ہے کہ تم ایک قوم ہو۔ حالانکہ سیاسی اور معاشی نقطۂ نظر سے ہندوستان میں صرف "ہندوستانی قوم" ہی پائی جاتی ہے، اور اس قوم کے اندر ایک دوسری قوم کا موجود ہونا سراسر ایک لغو تخیل ہے۔

"ہندوستان میں مسلم قومیت پر زور دینے کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ بس یہی کہ ایک قوم کے اندر ایک دوسری قوم موجود ہے جو یکجا نہیں ہے، منتشر ہے، مبہم ہے اور غیر متعین ہے۔ اب سیاسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ تخیل بالکل لغو معلوم ہوتا ہے اور معاشی نقطۂ نظر سے یہ

بہت دور از کار ہے اور بدقت قابل توجہ کہا جاسکتا ہے۔" (ص ۳۳۱)

"مسلم قوم کا تخیل تو صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پرواز خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے اور اگر زیادہ لوگوں کو اس پر اعتقاد ہوتا بھی تو حقیقت سے دوچار ہونے کے بعد اس کا خاتمہ ہو جاتا۔" (ص ۳۳۲)

اس کے بعد وہ اسلامی تہذیب کی طرف بڑھتے ہیں، اور مسلمانوں کو یہ سمجھاتے ہیں کہ حقیقت میں تمہاری کوئی خاص تہذیب ہی نہیں ہے:-

"لیکن یہ اسلامی تہذیب ہے کیا چیز؟ کیا عربوں، ایرانیوں اور ترکوں وغیرہ کے بڑے بڑے کارناموں

---

ملہ جب ہم دیکھتے ہیں کہ پنڈت جی اشتراکیت کے قائل ہیں اور مارکس کی تعلیم پر اعتقاد رکھتے ہیں، اور اس کے باوجود اسلامی قومیت کے خلاف یہ طرز استدلال اختیار کر رہے ہیں، تو ہمیں مجبوراً یہ رائے قائم کرنی پڑتی ہے کہ پنڈت جی نے خود اپنے شخصی اعتقاد کے خلاف محض سیاسی طور پر یہ طرز استدلال اختیار فرمایا ہے۔ مارکس کا نعرہ یہ تھا کہ "تمام دنیا کے مزدورو! ایک ہو جاؤ" اس کی تعلیم یہ تھی کہ اشتراکی خیال کا آدمی جہاں بھی ہے ایک اشتراکی جماعت سے تعلق رکھتا ہے۔ جرمنی کا اشتراکی اٹلی کا کامریڈ رفیق ہے اور خود اپنے وطن بلکہ شہر، بلکہ محلہ میں رہنے والے بورژوا سے اس کا کوئی رشتہ نہیں۔ اسی تخیل پر بین الاقوامی اشتراکیت کی بنا رکھی گئی ہے۔ اشتراکی ہونے کی حیثیت سے پنڈت جواہر لال بھی اس تخیل پر اعتقاد رکھتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود اسلامی قومیت پر اعتراض کر رہے ہیں، حالانکہ یہ قومیت بھی اسی اصول پر قائم ہوئی ہے کہ ایک عقیدے اور ایک مقصد زندگی اور ایک اصول اجتماعی کے قائل جہاں کہیں بھی ہوں، ایک جماعت ہیں چاہے ان میں بعد المشرقین ہی کیوں نہ ہو اور اس کے خلاف مسلک رکھنے والا اگر ہم نفس کیا معنی، ایک دیوار بیچ بھی رہتا ہو تو وہ بہرحال دوسری ہی جماعت کا آدمی ہے۔ ہمارے لئے یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ جو شخص اشتراکی جمعیت کو سمجھ سکتا ہے۔ وہ اسلامی جمعیت کو نہیں سمجھ سکتا۔ لامحالہ ہم یہی سمجھنے پر مجبور ہیں کہ اسلامی قومیت کا وجود چونکہ پنڈت جی کے مقاصد میں حارج ہے۔ اس لئے وہ قصداً ٹھیک اسی چیز پر اعتراض کر رہے ہیں جس کے اصول کی صداقت پر وہ اعتقاد رکھتے ہیں۔ اور اعتراض کے لئے ان دلائل سے کام لے رہے ہیں، جن کی صداقت پر وہ دل سے اعتقاد نہیں رکھتے۔

کی ایک یاد ہے۔ جو نسلی تعلق کی وجہ سے اب تک باقی ہے؟ یا اس کا مطلب زبان، آرٹ، موسیقی اور رسم و روایات ہیں؟ مجھے تو یاد نہیں آتا کہ کوئی شخص آجکل اسلامی موسیقی یا اسلامی آرٹ کا بھی ذکر کرتا ہو۔ (صفحہ ۲۳۳)

"میں نے یہ سمجھنے کی بہت کوشش کی کہ یہ اسلامی تہذیب[1] کیا چیز ہے۔ مگر میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں اس میں کامیاب نہ ہوا۔ میں دیکھتا ہوں۔ کہ شمالی ہند میں متوسط طبقہ کے مٹھی بھر مسلمان اور انہی کی طرح کے ہندو بھی فارسی زبان اور روایات سے متاثر ہوئے ہیں جیسے

---

[1] تہذیب کے متعلق اس قسم کے خیالات آنریبل مسٹر سمپورنانند وزیر تعلیمات صوبہ متحدہ نے بھی اپنی حال کی ایک تقریر میں ظاہر فرمائے ہیں۔ ان کا ارشاد ہے:۔

"مسلمانوں کی تہذیب کیا ہے؟ تہذیب مذہب میں شامل نہیں ہے۔ اس کا جلوہ شاعری، فن تعمیر، سنگتراشی، مصوری، اور موسیقی میں نظر آتا ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جن کا مجموعہ تہذیب ہے۔ کیا ہندو اور مسلمانوں کی تہذیب کے درمیان ان چیزوں میں کوئی بین فرق ہے؟ زمانہ ماضی کے چند بہترین لوگوں کو لے لیجئے۔ وہ سب مسلمان ہیں لیکن راگوں کے نام کیا ہیں؟ یہ راگ اور راگنیاں سب سنسکرت نام ہیں۔ کیا کوئی ہندو آج ایسا ہے جو یہ کہنے کا حق رکھتا ہو کہ ہندوستانی گانے ہندو گانے ہیں یا کوئی مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ ہندوستانی گانے مسلمان گانے ہیں؟ ہندوستانی مصوری اور فن تعمیر کے شباب کا زمانہ عہد مغلیہ میں تھا۔ پھر اب کیوں ہم ہندو مذہب اور مسلمان تہذیب کا ذکر کرتے ہیں۔" (مدینہ مورخہ ۱۲ راپریل ۳۸ء)

"ہم ایران کی مثال لیتے ہیں۔ ایران کا مذہب اسلام ہے اور عرب کا مذہب بھی اسلام ہے۔ لیکن کوئی کہہ سکتا ہے کہ ایران میں عربی تہذیب ہے۔" (حوالہ مذکور)

ان خیالات کو جب ہم پڑھتے ہیں تو ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ یا اگر سیاسی فریب کاری نہیں ہے تو سخت جہالت ہے۔ یہ لوگ اسلامی تہذیب ہی کو نہیں بلکہ نفس تہذیب کے مفہوم کو بھی نہیں جانتے اور پھر اس موضوع پر زبان کھولنے کی جرأت کرتے ہیں۔ میں اس سے پہلے اسلامی تہذیب کی کافی تشریح کر چکا ہوں (ملاحظہ ہو موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول صفحہ ۴۸ تا ۱۰۵) اور آگے چل کر ان صفحات میں دوبارہ اس کی تشریح کروں گا۔

عوام الناس پر نظر ڈالتا ہوں۔ تو اسلامی تہذیب کی نمایاں ترین علامتیں یہ نظر آتی ہیں۔ ایک خاص قسم کا پاجامہ نہ زیادہ لمبا نہ زیادہ چھوٹا۔ ایک خاص طریقہ سے مونچھوں کو مونڈنا یا ترشوانا مگر ڈاڑھی کو بڑھنے کے لئے چھوڑ دینا۔ اور ایک قسم کا ٹونٹی دار لوٹا۔ بالکل اسی کے جواب میں ہندوؤں کے بھی چند رسمی طریقے ہیں، یعنی دھوتی باندھنا، سر پر چوٹی رکھنا اور مسلمانوں کے لوٹے سے مختلف طرز کی لٹیا رکھنا۔ یہ امتیازات بھی در اصل زیادہ تر شہروں میں پائے جاتے ہیں اور مفقود ہوتے جا رہے ہیں۔ ہندو اور مسلم کاشتکاروں اور مزدوروں میں مشکل ہی سے فرق کیا جا سکتا ہے۔ تعلیمیافتہ مسلمان شاید ہی ڈاڑھی رکھتے ہیں۔ علیگڈھ والے البتہ سرخ ٹوپی کے گرویدہ ہیں (اس کا نام ترکی ہے حالانکہ خود ترکی میں اب اسے کوئی نہیں پوچھتا) مسلمان عورتیں ساری پہننے لگی ہیں اور آہستہ آہستہ پردہ سے باہر نکل رہی ہیں"۔ ص ۳۳۵۔

یہاں تک تو صرف یہ دعوٰی تھا کہ "اسلامی تہذیب" حقیقت میں کسی چیز کا نام ہی نہیں ہے اس کے بعد دوسرا پہلو اختیار کیا جاتا ہے اور یوں ارشاد ہوتا ہے کہ مسلمان جس چیز کو اپنی تہذیب کہہ رہے ہیں وہ اب زندہ نہیں رہ سکتی۔ زمانے کے انقلابات اس کو مٹا رہے ہیں، مٹا دیں گے۔ اور خود مسلمان قومیں آج اس کو چھوڑ رہی ہیں:۔

"اب تو قومی تہذیبوں کا زمانہ بھی بہت تیزی سے گذر رہا ہے اور پوری دنیا ایک تہذیبی وحدت

---

لہ یہاں مسلمانوں کے اور ان قوم پرستوں کے مقاصد کا تضاد بالکل نمایاں ہے۔ ہم ان حالات کو اس نظر سے دیکھتے ہیں کہ غلامی کی وجہ سے ہمارا نیشنل ٹائپ مضمحل ہو رہا ہے اور ہمیں آزادی کی ضرورت اسی لئے ہے کہ حکومت خود اختیاری کے وسائل سے کام لیکر اپنے نیشنل ٹائپ کو مستحکم کریں۔ مگر یہ حضرات اس امر واقعہ کو کہ ہمارا نیشنل ٹائپ اس قدر مضمحل ہو چکا ہے، اس بات کی دلیل قرار دیتے ہیں کہ سرے سے ہمارا کوئی نیشنل ٹائپ ہے ہی نہیں۔ اور ہمیں اب اس نمونے کے مطابق ڈھلنے پر راضی ہو جانا چاہیے جو ان کے پیش نظر ہے۔

بنتی جارہی ہے — اس ناگزیر رجحان کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔" (ص ۳۳۲)

"اس زمانہ میں ہندی مسلمانوں کو پیہم صدمات پہنچے ہیں۔ اور ان کے بہت سے خیالات جن کی پرورش بڑی تمناؤں سے کی تھی پاش پاش ہو گئے۔ اسلام کے مرد غازی، ترکستان نے نہ صرف یہ کہ اس خلافت ہی کو ختم کر دیا جس کے لئے ہندوستان ۱۹۲۰ء میں اتنا لڑا تھا، بلکہ یکے بعد دیگرے ایسے قدم اٹھائے ہیں جو مذہب سے اس کو دور لئے جارہے ہیں۔ مصر بھی اسی راستہ پر جا رہا ہے۔ یہی حال عربی ممالک کا ہے سوائے ملک عرب کے جو بہت پیچھے ہے ایران کی نظریں اپنے تمدنی احیاء کے لئے تاریخ قبل از اسلام پر پڑتی ہیں۔ غرض ہر جگہ مذہب بالکل پس پشت ڈالا جارہا ہے اور وطنیت جنگ آزما لباس میں ظاہر ہو رہی ہے[1]۔" (ص ۳۳۶)

مطلب یہ ہے کہ مسلمانو! یہ تم کس چیز کو لئے بیٹھے ہو؟ جو چیز فنا ہو رہی ہے، جس کا فنا ہونا یقینی ہے، جس کو سب مسلمان قومیں چھوڑ رہی ہیں اسے تم کیوں پکڑے ہوئے ہو؟ چھوڑ دو اسے اور آؤ اس راستہ کی طرف جدھر ہم بلا رہے ہیں۔

یہ سب کچھ کہنے کے بعد پھر بھی دل میں تردد باقی رہتا ہے کہ یہ کمبخت "مذہب پرست مسلمان" اپنی تہذیب اور قومیت پر جان دینے والے متعصب لوگ، اتنا سمجھانے پر بھی نہ مانیں گے۔ لہٰذا ایک آخری حربہ استعمال کیا جاتا ہے۔ مسلمان کے دل میں انگریز اور اس کی غلامی سے جو نفرت ہے اسے مدد پر بلایا جاتا ہے، اور اس سے یوں کام لیا جاتا ہے:۔

"ہندوستان میں مسلم قوم اور اسلامی تہذیب پر اور ہندو مسلم تہذیبوں کے انتہائی اختلاف پر زور دیا جاتا ہے، پھر اس سے یہ لازمی نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ برطانیہ کا ہندوستان میں

---

[1] اسلام کو بر سر انحطاط، بلکہ بزعم خود فنا پذیر دیکھ کر اس قوم پرست لیڈر کے قلب میں جو انشراح و انبساط کی کیفیت پیدا ہو رہی ہے، اس کو غور سے ملاحظہ کیجئے۔ یہ پنڈت جی اپنی بے تعصبی کا سکہ جمانے کی بہت کوشش کرتے ہیں، مگر دل میں اسلام کے لئے جو عناد اور دشمنی کا جذبہ بھرا ہوا ہے وہ کسی طرح چھپائے نہیں چھپ سکتا۔

ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہنا ضروری ہے تاکہ وہ دونوں میں توازن قائم رکھے۔ اور بیچ بچاؤ کر سکے۔" (ص ۳۴۳)

"مسلم قومیت کا ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مطلق العنان حکومت یہاں رہنی چاہیے۔ یا بدیسی حکومت۔" (ص ۳۳۱)

"ہاں اب مسلم قوم اور اسلامی تہذیب کا کیا ہوگا؟ کیا یہ دونوں آئندہ صرف شمالی ہند میں برطانیہ کی شفیق حکومت کے تحت پھلتی پھولتی رہیں گی؟" (ص ۳۳۷)

یہاں پہنچ کر ہندوستان کے "قومی" لیڈر نے اپنی سیاست دانی کے جوہر پوری طرح نمایاں کئے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اسلامی تہذیب اور اسلامی قومیت صرف سرکار برطانیہ ہی کے سہارے جی سکتی ہے، لہٰذا جو لوگ ان دونوں کو باقی رکھنا چاہتے ہیں، وہ سب ٹوڈی اور سرکار پرست ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ بدیسی حکومت یہاں ہمیشہ قائم رہے۔ اب اگر اس ملعون سامراج سے نجات چاہتے ہو، اگر آزادی کی خواہش ہے تو اس قومیت اور تہذیب کے تحفظ کا نام لینا چھوڑ دو ورنہ جو کوئی یہ نام لیگا، ٹوڈی قرار دیا جائے گا۔ یہ آخری تیر بڑی کاری ضرب ہے۔ ہماری قوم کے بہت سے حریت پسندوں کو یہی ضرب "آزادی کی فوج" میں کھینچ لے گئی ہے اور بہت سے ان لوگوں کی زبانوں پر اس نے مہر لگا دی ہے جو حریت پسند کہلانا چاہتے ہیں اور ٹوڈی پن کے گھناؤنے خطاب سے بچنا چاہتے ہیں۔

قومیت اور تہذیب کی خبر لینے کے بعد پنڈت جی اسلام کے نظام اجتماعی کی طرف بڑھتے ہیں، تاکہ اس کو درہم برہم کر کے جمہور مسلمین کو جدید ہندوستانی قومیت میں جذب کر لیا جائے۔

پنڈت جی کو خوب معلوم ہے کہ مسلمانوں کے ہوشمند لوگ جو اسلام سے واقف ہیں جن میں اپنی قومیت کا شعور پوری طرح موجود ہے، جو اپنی قومی تہذیب کو ہر چیز سے زیادہ قیمتی سمجھتے ہیں، وہ تو قیامت تک اس پوزیشن کو قبول کرنے پر راضی نہ ہوں گے۔ ان کے لئے قطعی ناممکن ہے کہ اسلامی قومیت کو چھوڑ کر ہندوستانی قومیت میں اپنے آپ کو ضم کر دیں، اور ان کو ایک

لمحہ کے لئے بھی یہ گوارا نہیں ہو سکتا کہ اس تہذیب کو خیر باد کہدیں جسے وہ اس گئی گذری حالت میں بھی اپنی عزیز ترین متاع سمجھتے ہیں۔ قومیت کو چھوڑنا، تہذیب سے دست بردار ہونا، جدید ہندی قومیت اور اشتراکی تہذیب و تمدن میں جذب ہو جانا یہ تو بہت دور کی چیزیں ہیں۔ مسلمانوں کے اس گروہ سے تو الٹا یہ خطرہ ہے کہ ہندوستان کے آزاد نظام حکومت میں وہ اپنی قومیت اور اپنی تہذیب کو زیادہ مضبوطی کے ساتھ قائم کرنے کی کوشش کریگا۔ اور اس غرض کے لئے حکومت کے اقتدار میں برابر کی شرکت حاصل کرنا چاہے گا۔

اس خطرے کو اچھی طرح محسوس کرکے پنڈت جی نے یہ تدبیر نکالی ہے کہ مسلمانوں کی قومی جمعیتوں سے اب خطاب ہی نہ کیا جائے بلکہ ان کے افراد تک براہ راست پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ یہ افراد چونکہ منتشر ہیں، مفلس ہیں، اسلام اور اس کی تہذیب کے اصولوں سے اچھی طرح واقف نہیں ہیں، اسلامی نظام اجتماعی کا شیرازہ درہم برہم ہو جانے کی وجہ سے ان پر اسلام کی گرفت قائم نہیں رہی ہے، اور جہالت یا مغربی تعلیم کی وجہ سے ان کا شعور اسلامیت بڑی حد تک مضمحل ہو چکا ہے، اس لئے ان کو بآسانی توڑ لیا جا سکتا ہے۔ قبل اس کے کہ مسلمانوں کا "بورژوا طبقہ" —— اشتراکی زبان میں قوم کے اہل دماغ اور متوسط طبقوں کا یہی نام ہے —— بیدار ہو کر اپنی قوم کو سنبھالنے کی فکر کرے، قوم کو اس کے قابو سے نکال لیا جائے یا زیادہ صحیح الفاظ میں اس کی "شدھی" کر لیجائے۔

یہی حقیقت ہے، اس پالیسی کی جس کو مسلم عوام کے ساتھ ربط قائم کرنے (Muslim Mass Contact) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ پنڈت جی نے آل انڈیا نیشنل کنونشن کے خطبۂ صدارت میں اس پالیسی کی تشریح ان الفاظ میں فرمائی تھی:۔

"ہم نے عام لوگوں سے نگاہ ہٹا کر مدتوں فرقہ وارانہ لیڈروں کی باہمی مصالحت اور گفت و شنید میں وقت گنوایا ہے یہ طریقہ غلط تھا اور میں چاہتا ہوں کہ دوبارہ ادھر نگاہ بھی نہ دالیں ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو مسلمانوں کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملتوں اور

قوموں کے بارے میں گفتگو ہے جدید دنیا میں اس دقیانوسی خیال کی کوئی گنجائش نہیں۔ آج جماعتوں اور ملتوں کی بنیاد معاشی مفاد پر رکھی جا رہی ہے اور اس لحاظ سے ہندو، مسلمان، سکھ عیسائی سب ملتوں کا بھلا اسی میں ہے کہ اپنی بیکاری اور غریبی کو سامنے رکھکر سب مل کر قومی آزادی کے لئے آگے بڑھیں۔ جب کبھی ہم اوپر کے لوگوں سے منہ موڑ کر عام لوگوں کی طرف نگاہ ڈالیں گے تو ہمیں ان معاشی مصیبتوں کا حل تلاش کرنا پڑے گا، جو سوال ایک زمانہ سے فرقہ وارانہ مسئلہ بن گیا ہے اس کا صحیح حل یہی ہے۔"

کیسے معصوم، کیسے بے ضرر ہیں یہ الفاظ! مگر کتنے زہریلے ہیں! اس سے پہلے جو تصریحات خود پنڈت جی کی زبان سے میں نقل کر چکا ہوں۔ ان کو سامنے رکھکر جب آپ اس نئی پالیسی کو دیکھیں گے تو صاف نظر آ جائیگا کہ یہ دراصل شدھی کی تحریک ہے ایک دوسری شکل میں۔ یہ مذہبی شدھی نہیں، سیاسی اور معاشی شدھی ہے اور اس کا نتیجہ عملاً وہی ہے جو مذہبی شدھی کا تھا فرق صرف یہ ہے، کہ وہ کھلی ہوئی تحریک ارتداد تھی جس پر مسلمانوں کے جاہل اور عالم سب چوکنے ہو گئے تھے اور یہ ایسی خفی تحریک ارتداد ہے کہ جہلا تو درکنار علما تک۔ اس کی کنہ کو پہنچنے میں دقت محسوس کر رہے ہیں۔ اس تحریک کے بانیوں نے بھونڈے پن سے کام لیا تھا۔ انہوں نے مسلمانوں سے کہا کہ تم اپنی قومیت اور اپنے مذہب کو چھوڑ کر ہندو قومیت اور مذہب میں آ جاؤ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں میں کوئی کودن سے کودن آدمی بھی ایسا نہ تھا جو اس پر بھڑک نہ اٹھا ہو۔ بخلاف اس کے اس تحریک کا بانی ایک ہوشیار شخص ہے۔ یہ کہتا ہے کہ تم کوئی قوم ہی نہیں ہو، تمہاری کوئی تہذیب ہی نہیں ہے، لہٰذا کسی چیز کے چھوڑنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ دراصل تم ایک قوم یعنی ہندوستانی قوم کے فرد ہو مگر سامراج کے ایجنٹوں نے تم کو اس قوم سے جدا کر رکھا ہے۔ آؤ اپنی قوم میں مل جاؤ، آزادی حاصل کرو، اور اشتراکی تہذیب کے قائم کرنے میں حصہ لو جس میں تم کو خوب روٹیاں ملیں گی ــــ ہے یہ بھی زہر ہی کا گھونٹ، مگر دیکھئے کیسے کیسے ہوش گوش کے لوگ اسے شیر مادر سمجھ کر نوش فرما رہے ہیں۔

# آزادی کی فوج کے مسلمان سپاہی

پنڈت جواہر لال کے جو خیالات گذشتہ صفحات میں پیش کیے گئے ہیں ان کو محض ایک شخص کے ذاتی خیالات سمجھ کر سرسری طور پر نظر انداز کر دینا صحیح نہیں ہے۔ اوّل تو یہ اس شخص کے خیالات ہیں جو گاندھی جی کے بعد کانگریس میں سب سے زیادہ باا ثر ہے اور دو مرتبہ کانگریس کا صدر رہ چکا ہے۔ دوسرے یہ کہ جواہر لال کے بعد انہی کے ہم خیال بلکہ ان سے زیادہ سخت خیالات رکھنے والے شخص، سوبھاش چندر بوس کا صدر منتخب ہونا اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ کانگریس پر ان خیالات کا پورا غلبہ ہے۔ ان سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اب یہ خیالات لیڈروں کے ذاتی خیالات نہیں رہے ہیں بلکہ درحقیقت کانگریس کی سرکاری پالیسی کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ کانگریس نے مارچ ۳۷ء کے بعد جمہور مسلمین کے ساتھ ربط قائم کرنے کی جو تحریک ( Muslim Mass Contart ) کے نام سے شروع کی ہے وہ ٹھیک انہی راستوں پر چل رہی ہے جو پنڈت جی نے تجویز کیے ہیں۔ پورا غیر مسلم پریس جو کانگریس کے زیر اثر ہے۔ مسلمانوں میں اسلامی قومیت اور اسلامی تہذیب کے خلاف بغاوت پھیلانے میں لگا ہوا ہے۔ جس گوشے سے اس بغاوت کا کوئی اثر ظاہر ہوتا ہے، اس کا بڑے جوش کے ساتھ خیر مقدم کیا جاتا ہے اور ہر اس آواز کو جو اسلامی شعور کے تحت کسی مسلمان سے بلند ہوتی ہے "فرقہ پرستی" اور "رجعت پسندی" کے آوازے کس کر دبا دیا جاتا ہے۔

اس طرزِ عمل کی توضیح کے لیے میں صرف دو مثالیں پیش کروں گا جن سے اس تحریک کے رجحانات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

پچھلے سال لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک مسلمان نژاد طالب علم نے برملا اعلان کیا تھا کہ میں

مسلمان نہیں ہوں۔ مسلمانوں نے اس پر اعتراض کیا کہ جو شخص خود اسلام سے منکر ہے، وہ کسی انتخاب میں مسلمان ہونے کی حیثیت سے امیدوار بننے کا حقدار کیسے ہو سکتا ہے۔ اس واقعہ پر اظہار رائے کرتے ہوئے ایک کانگریسی اخبار (ہندوستان ٹائمز) لکھتا ہے:-

"اگر ووٹروں کی فہرست میں نام درج ہونے اور انتخابات کے لئے بحیثیت امیدوار کھڑے ہونے سے پہلے لوگوں کے عقائد کی تحقیقات شروع ہو گئی تو ہمارا موجودہ انتشار و اختلال اور زیادہ پریشان کن ہو جائے گا۔ اس سے تو یہ بات بالکل عیاں ہو گئی کہ ہمارا یہ سارا انتخابی نظام جس کو ہمارے آقاؤں نے اس قدر کامل غور و فکر کے بعد مرتب کیا ہے اس وقت بیکار ہو کر رہ جائے گا جب کہ لوگ صرف ہندو یا مسلمان نہ رہیں گے بلکہ فرداً فرداً اپنے مخصوص عقائد اور شبہات پیدا کریں گے۔ مسٹر نقوی کو مستقبل کے لئے ایک فال نیک سمجھنا چاہئے اور کیا خبر کہ وہ آنے والی صبح صادق کے ایک پیغمبر ہوں"۔

آگے چل کر اس مضمون میں انگلستان کے ان ملاحدہ کو مثالاً پیش کیا گیا ہے جنہوں نے حریت فکر کا علم بلند کیا تھا اور اپنی مذہب پرست قوم کے ہاتھوں تکلیفیں اٹھائی تھیں، مثلاً چارلس بریڈلا، مارلے اور رابرٹ انگرسول۔ پھر اسلام سے بغاوت کرنے والے اس نوجوان کو ان "بہادروں" کی صف میں جگہ دے کر اس کی ہمت و جرأت پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے گئے ہیں۔

ایک دوسرا کانگریسی اخبار (تیج) اپنی ۴ راگست ۳۷ء کی اشاعت میں ایک مسلمان عورت کا خط شائع کرتا ہے جس کے الفاظ حسب ذیل ہیں:-

"جب میرٹھ میں پرچیہ پنڈت جواہر لال نہرو تشریف لائے تو میں اپنے خاوند سے چھپ کر جلسہ دیکھنے گئی اس وقت سے میرا دل بے چین رہنے لگا، میں نے اپنے مکان پر قومی جھنڈا لگا دیا۔ لیکن جب میرے خاوند نے اسے پھاڑ ڈالا تو میں نے سارا دن نہ کھانا کھایا۔ نہ رات کو سوئی بلکہ تمام رات اور دن برابر روتی رہی۔ جب میرے خاوند نے میرے

پیارے پنڈت جواہر لال کو گالیاں دینی شروع کیں تو میں نے کہا اگر ان کی شان میں کچھ کہا تو جان کھو دوں گی۔ چنانچہ میں اسی دن سے لڑ کر اپنے باپ کے گھر چلی آئی ہوں اب جبتک میرا خاوند معافی نہ مانگے گا، اپنے مکان پر کانگریس کا جھنڈا نہ لگائے گا، اور کانگریس کا ممبر نہ بنے گا میں اس کی شکل بھی نہ دیکھوں گی۔

اڈیٹر صاحب! میں نے پچاس مسلمان عورتیں تیار کر رکھی ہیں جو پردے کو چھوڑ کر ہر وقت کانگریس کا کام کرنے کو تیار ہیں۔ مگر ہمارے گھر والے ہم کو تنگ کرتے ہیں۔ اب آپ بتائیں میں کیا کروں؟ اور ہمارے پوجیہ پنڈت جواہر لال سے کہئے کہ ہم مسلمان عورتیں کیا کریں؟"

بہت ممکن ہے کہ یہ خط فی الواقع کسی مسلمان عورت کا لکھا ہوا نہ ہو، اور محض ایک جعل ہو۔ لیکن اگر یہ جعل ہے تو یہ اور بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ "لشکر آزادی" کے ان نقیبوں کے ما فی الضمیر پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ "قوم پرستی" کے یہ علمبردار مسلمان مردوں اور عورتوں کو کیا دیکھنا چاہتے ہیں۔ "آزادی کی فوج" کے لئے کس قسم کے سپاہی ان کو مسلمانوں میں درکار ہیں۔ اور کم از کم کس حد تک اصول اسلام سے منحرف ہونا ضروری ہے جس کے بعد وہ کسی مسلمان کو "قوم پرست" تسلیم کر سکتے ہیں۔

یہ لغاوت صرف غیر مسلموں ہی کی زبان و قلم کے ذریعہ سے نہیں پھیلائی جا رہی ہے بلکہ خود مسلمان بھی اس کی اشاعت کے لئے آلۂ کار بنائے جا رہے ہیں۔ مسلمان لیڈر، مسلمان اہل قلم اور مسلمان رسائل و جرائد انہی تمام خیالات کو مسلمانوں میں پھیلانے کا وسیلہ بن گئے ہیں اور بنتے جا رہے ہیں جو پنڈت جواہر لال نہرو کی زبان سے آپ سن چکے ہیں۔ اور یہ بالکل ظاہر ہے کہ مسلمانوں کو بہکانے کے لئے غیر مسلموں کی بہ نسبت خود مسلمان زیادہ کارگر ذریعہ بن سکتے ہیں۔ اس کے لئے آپ کو جتنی مثالوں کی ضرورت ہو میں پیش کر سکتا ہوں۔ مگر یہاں صرف ان حضرات کی تحریروں سے استشہاد کروں گا۔ جو کانگریس میں کوئی نہ کوئی

"سرکاری" ذمہ دار حیثیت رکھتے ہیں۔

بہار کے مشہور کانگریسی لیڈر ڈاکٹر سید محمود صاحب، جو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سیکرٹری رہ چکے ہیں، اور اس وقت صوبہ بہار کی وزارت میں واحد مسلمان وزیر ہیں، اپنے ایک مضمون میں فرماتے ہیں:-

"مختصر یہ کہ اخلاقی سیاسی اور دوسرے تمام حکیمانہ تصورات کو قطعیت اور علانیت کا جامہ پہنا کر مسلمانوں نے ہندوستان کے تخیل کو عمل کا آئینہ بنا دیا بعض نے اپنے ولولہ و جوش سے مجبور ہو کر ہندوستان میں متحدہ قومیت کی آفرنش کے پیش نظر ایک ایسے جدید نظام مذہبی کی نشو و نما کرنی چاہی جو ہندوستان میں سب کے مناسب حال ہو۔ یہ ان لوگوں کی معمولی خدمات نہیں کہی جا سکتیں۔ اجنبی تھے، لیکن انہوں نے جلد ہی اپنی قسمتوں کو اہل ملک کے ساتھ ہمیشہ کے لئے وابستہ کر لیا" (جامعہ۔ اکتوبر ۱۹۳۶ء)

آپ سمجھے کہ یہ "جدید نظام مذہبی" کا اشارہ کس چیز کی طرف ہے؟ یہ اشارہ اکبر کے دین الٰہی کی طرف ہے۔ کتنا مختصر اشارہ ہے، مگر "قوم پرست مسلمان" — مجموعہ ضدین — کی معراج تخیل کو کتنی صاف روشنی میں پیش کرتا ہے۔ اکبر کا دور اسلامی ہند کی تاریخ میں پہلا دور ہے، جس میں سیاسی اغراض پر مذہب کو قربان کرنے کی ابتدا ہوئی۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے اپنے "تذکرہ" میں اس نامبارک دور کے جو حالات بیان فرمائے ہیں ان کو پڑھئے تو آپ کو اس کی فتنہ سامانیوں کا اندازہ ہو گا۔ یہ پہلا فتنہ عظیم تھا جس نے پوری طاقت کے ساتھ الحاد و بے دینی پھیلا کر ہندوستان کے مسلمانوں کو وطنی قومیت میں جذب کرنے کی کوشش کی اس دور کے تمام صلحاء امت اس فتنے پر چیخ اٹھے تھے۔ حضرت شیخ احمد مجدد سرہندی رحمۃ اللہ نے اسی کے خلاف علم جہاد بلند کیا تھا اسی ناپاک دور کے اثرات تھے جنہوں نے دارا شکوہ کی صورت میں جنم لیا۔ اسی زہر کو دور کرنے کے لئے عالمگیر پچاس برس جد و جہد کرتا رہا۔ اور یہی زہر آخر کار مسلمانوں کی سیاسی طاقت کو گھن کی طرح کھا گیا مسلمانوں میں قوم پرستی کی جدید تحریک دراصل اسی پرانی تحریک کی نشاۃ ثانیہ ہے۔

لہذا یہ لوگ اس فتنہ عظیم کو فتنے کی حیثیت سے نہیں بلکہ "خیر القرون" کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور وسوسہ ر ، حاصل کرنے کے لئے اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

ان کے نزدیک متحدہ قومیت کی آفرینش کا یہ پہلا تجربہ ہندوستانی مسلمان کی "خدمات" میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ ان کے ذہن میں "متحدہ قومیت" کا تصور یہی ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنی قسمتوں کو اسی طرح اہل ملک کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے وابستہ کریں۔ پنڈت جواہر لال بھی اس کے سوا کچھ نہیں چاہتے۔

آگے چلکر ڈاکٹر صاحب اپنے اس مضمون میں فرماتے ہیں:۔

"سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں آخر ہمارا نصب العین اور مقصد کیا ہے؟ کیا ہم اس سمت میں قدم اٹھانے کو آمادہ ہیں کہ ایک مشترک قومیت کی معہ تمام لوازم کے تشکیل کریں؟ اگر اس کا جواب نفی میں ہے تو یہ بالکل ظاہر ہے کہ ہندوستان صرف ایک جغرافیائی نام ہے جس میں ایک سے زیادہ "اقوام" بستی ہیں۔ کیا ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہر قوم علیحدہ علیحدہ اپنے مسائل کو حل کرے اور مشترکہ دولت ہند Commonwealth ، میں صرف انسانی اور مادی امداد کیا کرے؟ اگر مسئلہ ہند کا یہی حال ہے تو ہماری اس وقت کی کوششیں اس کے برعکس بالکل ناکام رہی ہیں ......

لیکن اگر ہمارے سوال کا جواب اثبات میں ہے اور ہم واقعی یہ چاہتے ہیں کہ ہم اسی راہ پر گامزن ہوں جو اکبر اور دوسرے ازمنہ وسطیٰ کے حکمرانوں نے بنا دی تھی تب تو ہمیں عزم و استقلال کے ساتھ ہمیشہ نہ صرف اسی راہ پر چلنا چاہئے بلکہ ہمارے پیشرون ۔ اور رسوم میں بھی یکسانیت ہونی چاہئے بعض کے نزدیک تو اس حل میں بھی مسلم اقلیت کیلئے ایک مضرت ہے لیکن اس کا کوئی چارہ کار نہیں۔ اب چونکہ کوئی تیسرا حل موجود نہیں ہے اس لئے مسلمانوں کو ملک کی خاطر اور اپنی خاطر اسے قبول کرنا چاہئے"

یہاں مافی الضمیر بالکل واضح ہو گیا۔ صوبہ بہار کے چالیس لاکھ مسلمانوں کی قسمتیں جس شخص کے

ساتھ وابستہ ہیں، جسے بہار کی وزارت میں ہماری آئیندہ نسلوں کی تعلیم کا نگراں بنایا گیا ہے۔ وُہ سرے سے اس تخیل ہی کا مخالف ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی کوئی مستقل قومیت ، باقی رہے اور آزاد ہندوستان میں ان کو ایک ممتاز اجتماعی وجود کی حیثیت سے اپنے مسائل خود حل کرنے کا موقع حاصل ہو۔ اس کا نصب العین ہمارے نصب العین سے بالکل مختلف اور جواہر لال نہرو کے نصب العین سے بالکل متحد ہے ۔ ہم آزادی اس لیئے چاہتے ہیں کہ ڈیڑھ سو برس کے غیر مسلم اقتدار نے ہماری قومیت اور ہماری تہذیب کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی کر سکیں۔ اور وہ آزادی اس لیئے چاہتا ہے کہ اب تک جو نقصان ہمیں پہنچا ہے، آگے چلکر وہ اپنے طبعی نتیجہ کو پہنچ جائے یعنی ہماری مضمحل شدہ قومیت ہندوستان کی مشترک قومیت میں جذب ہو جائے، ہماری تہذیب کی کوئی امتیازی شان باقی نہ رہے ، ہمارے مختلف پیشوں کے لوگ اپنے اپنے ہم پیشہ غیر مسلموں کے ساتھ گھل مِل جائیں اور ان کے درمیان پیشوں کے ساتھ "رسوم میں بھی یکسانیت" پیدا ہو جائے ہندوستان کی مختلف قوموں کے لیئے لفظ "اقوام" کا استعمال ہی فاضل ڈاکٹر کے نزدیک قابل اعتراض ہے۔ وہ ہندوستان کو ایک جغرافی نام نہیں، بلکہ ایک قومی وحدت بنانا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک مسئلہ ہند کا یہ حل بالکل غلط ہے کہ "ہر قوم علیحدہ علیحدہ اپنے مسائل کو حل کرے اور مشترکہ دولت ہند میں صرف انسانی اور مادی امداد کرے" برعکس اس کے صحیح حل یہ ہے کہ مسلمان اسی راستہ پر گامزن ہوں جو اکبر اور از منہ وسطیٰ کے حکمرانوں نے بنا دی تھی "یعنی ہندوستان کی کان نمک میں نمک بننے کے لیئے تیار ہو جائیں۔ اور یہ سب کچھ مسلمانوں کو کیوں کرنا چاہیئے؟ خدا اور رسول کی خاطر نہیں، بلکہ ملک کی خاطر اور اپنی خاطر۔ غالباً یہاں "اپنے پیٹ کی خاطر" لکھنے میں ڈاکٹر صاحب کو شرم محسوس ہوئی ہوگی۔ ایں ہم غنیمت است۔!

کیا جواہر لال نہرو کا تصور قومیت اس سے کچھ بھی مختلف ہے۔؟

مسلمانوں کو اپنے نام "مسلم" پر بڑا فخر ہے۔ خدا کا رکھا ہوا نام، اور وہ نام جس سے بڑھکر عزت و افتخار کا نام آج تک دنیا کی کسی قوم کو نصیب نہیں ہوا۔ مگر ڈاکٹر سید محمود صاحب کے نزدیک

اس علیحدہ نام سے مسلمانوں کا موسوم ہونا قابل اعتراض ہے۔ ہندو مسلمان، عیسائی، پارسی اور اس قسم کے دوسرے تمام اسماء ان کے نزدیک محو ہو جانے چاہئیں اور صرف ایک نام "ہندی" تمام باشندگان ہند کے لئے استعمال ہونا چاہئے تاکہ جداگانہ قومیتوں کا احساس باقی نہ رہے۔ فرماتے ہیں

"ہندی" کو زبان کے لئے نہیں بلکہ اہل ہند" کے لئے اختیار کرنا چاہئے۔ دنیا بھر میں صرف ہمارا ملک ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں لوگ مختلف مذاہب سے شناخت میں آتے ہیں۔ صرف اس کا اظہار ہی ہماری دماغی کیفیت کا آئینہ بن جاتا ہے اور ہمارے متعلق یہ بات ثابت کر دیتا ہے کہ "ہم اس بر اعظم کی علیحدہ علیحدہ مذہبی اقوام ہیں" اسی لئے اب وقت آگیا ہے کہ ہم سب ایک مشترکہ نام اختیار کر لیں"

"ہم علیحدہ علیحدہ مذہبی اقوام ہیں" یہ گویا ہمارے دامن پر ایک شرمناک دھبا ہے جسے مٹا دینے کی ضرورت ہے! وہ دماغی کیفیت ہی لائق صد شرم و ندامت ہے جس کے تحت دنیا کے اس اکیلے ملک، ہندوستان و ورح نشان کے باشندے مختلف مذاہب سے شناخت میں آتے ہیں!! یہ ثابت ہو جانا کہ ہم اس بر اعظم کی علیحدہ علیحدہ مذہبی اقوام ہیں، گویا اس بات کا ثابت ہو جانا ہے کہ ہم دور وحشت کی یادگار ہیں اور اس تلخ حقیقت کو شیرینی یا کم از کم فریب شیرینی سے بدل دینے کے لئے اب ناگزیر ہو گیا ہے کہ ہم ان ناموں کو بدل ڈالیں جو "علیحدہ مذہبی اقوام ہونے کے احساس کو زندہ رکھتے ہیں — یہ ہیں اس زعیم قوم کے خیالات جس کو مولانا ابوالکلام آزاد نے صوبہ بہار کی وزارت میں۔ ۴۰ لاکھ مسلمانوں کی نمائندگی کے لئے منتخب فرمایا ہے[1]۔

یہ تو صرف ایک نظیر تھی۔ کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ بس یہ ایک ہی نظیر ہے۔

---

[1] اس موقع پر مولانا ابوالکلام کے تذکرہ میں ان علماء و مشائخ کے حالات پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ جنہوں نے دور اکبری میں سیاسی اغراض پر دین کی قربانی چڑھانے والوں کے ساتھ مداہنت کی تھی۔ ان لوگوں کے متعلق مولانا نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔ وہ انشاء اللہ ازدیاد بصیرت کے موجب ہوں گے۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے حال ہی میں ایک مستقل شعبہ اسلامیات قائم کیا ہے۔ جس کا رکن مسلمان ہیں اور نشر و اشاعت کے آلۂ کار سب کے سب مسلمان اخبارات ہیں۔ مسلمانوں کے لئے کانگریس نے جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ ان کی فہرست میں اس شعبۂ اسلامیات کے قیام کو بھی ایک نمایاں جگہ دی جاتی ہے چنانچہ جمعیت علمائے ہند کا واحد ترجمان "الجمعیت" اس خدمت جلیلہ کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے:۔

"دور جدید میں مسلمانوں نے شکایت کی کہ کانگریس عام مسلمانوں سے ربط نہیں رکھتی اسلامی جرائد نے اس شکایت کو پیش کیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اس کی معقولیت کو تسلیم کیا۔ اور محض مسلمانوں کی دلدہی اور سہولت کار کے لئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ماتحت اسلامیات کا ایک مستقل شعبہ کھول دیا۔" (الجمعیتہ مورخہ ۵ رمضان ۱۳۵۶ھ)

بیچارے ناواقف عوام جب ان الفاظ کو دیکھیں گے تو کہیں گے کہ کیسی مہربان ہے یہ کانگریس اس نے آج تک کوئی شعبۂ ہندویات و سکھیات و پارسیات نہیں کھولا، مگر ہماری "دلدہی" اس کو یہاں تک منظور ہے کہ خاص ہمارے لئے ایک شعبۂ اسلامیات کھول دیا۔ اب ذرا اس شعبہ کی کارگذاری ملاحظہ ہو۔

ڈاکٹر محمد اشرف صاحب (معتمد شعبہ اسلامیات) کا ایک مضمون الجمعیت ہی میں ۱۸ رجب ۱۳۵۶ھ کی اشاعت میں درج ہوا ہے۔ اور ادارہ کی جانب سے اس پر کوئی تردیدی نوٹ یا اختلافی اشارہ تک نہیں ہے۔ اس میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:۔

"ہندوستان میں سیاسی اور اقتصادی حالات اس درجہ ترقی کر گئے ہیں اور فضا کا تقاضہ اس درجہ شدید انقلاب انگیز ہے کہ رجعت پسندوں اور سامراج پرستوں کی یہ ہمت نہ ہوئی کہ علانیہ کانگریس یا آزادی کی جد و جہد کی مخالفت کریں اس لئے ملک کو پیچھے لے جانے والی طاقتیں اور سامراج کی حامی جماعتیں کسی تعصب کی آڑ لیتی ہیں۔ گذشتہ سات آٹھ سال میں جب کبھی سیاسی یا سماجی ترقی کے لئے قدم بڑھایا گیا، ہندو مسلم سوال ضرور چھیڑ دیا گیا۔ مجھے یاد ہے۔ کہ

جب ابتدائی تعلیم کے متعلق کانگریسیوں نے صوبہ متحدہ کی کونسل میں ایک زمانہ میں سوال چھیڑا۔ تو رجعت پسند مسلمانوں نے فوراً مذہبی تعلیم و تربیت کا سوال شروع کر دیا اور ڈاکٹر ضیاء الدین اور دوسرے لوگ اس موقع پر کونسل چھوڑ کر چل دیئے۔ سارو ا ایکٹ کے خلاف ہندو اور مسلمان قدامت پسندوں نے جو ہنگامہ کیا وہ سب کو معلوم ہے۔ ترقی پسندی کی طرح رجعت پسندی بھی ہماری پبلک زندگی کے ہر پہلو پر محاذ قائم کرنا چاہتی ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی بوسیدہ خود فنا نہیں ہوتا۔ بڑھتی ہوئی سماجی قوتیں جد وجہد کے بعد اسے معزول کر دیتی ہیں۔"

غور فرمایئے مسلمان بچوں کے لئے تعلیم کی اسکیم میں مذہبی تعلیم و تربیت کا مطالبہ کرنا رجعت پسندی ہے، سامراج کی حمایت ہے۔ ملک کو پیچھے پیجانے والی طاقتوں کا کام ہے۔ فضا کا انقلاب انگیز تقاضا اب یہ ہے کہ اس "بوسیدہ" چیز کو بڑھتی ہوئی سماجی قوتیں جد وجہد کے بعد معزول کر دیں۔

آگے چلکر ڈاکٹر صاحب یہ بحث شروع کرتے ہیں کہ کانگریس کی شرکت کے سلسلہ میں مسلمانوں کی تہذیب اور روایات کا سوال جو اٹھایا جا رہا ہے، یہ در اصل ترقی پسند اور انحطاط پذیر قوتوں کی کشمکش کا ایک عکس ہے۔ "ترقی پسند" اور "انحطاط پذیر" ان دو اصطلاحوں کا مفہوم جواہر لال اور ان کے "شعبۂ اسلامیات" کی لغت میں جو کچھ ہے اس کی تشریح میں بعد میں عرض کروں گا۔ یہاں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ "ترقی پسند" قوتیں اسلامی تہذیب کے سوال کو کس نظر سے دیکھتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:۔

"یہ صحیح ہے کہ مسلمان ایک مخصوص تہذیب کے حامل رہے ہیں۔ باوجود اختلافات اور تنوع کے ان میں ایک قسم کی یگانگت اور یکسانیت پائی گئی ہے۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ مسلمانوں کی زبان ایک تھی یا تمدن کے مظاہر ایک سے تھے۔ لیکن تاریخی طور پر کسی حد تک یہ صحیح ہے کہ مسلمان حکمران طبقہ کے رجحانات ایک سمت کی طرف دکھائی پڑتے ہیں۔ لوگ اسلامی تہذیب پر بحث کرتے ہوئے یہ بھول جاتے ہیں کہ اس تمدن اور تہذیب نے ایک خاص ماحول میں تربیت

پائی تھی اور بہر صورت مسلمانوں کی حکمران حیثیت سے وابستہ تھی۔ جو لوگ بے صبری کے ساتھ اسلامی تہذیب کی خصوصیات گنانے وقت یہ حدیث سناتے ہیں۔ کہ کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہٖ۔ وہ اکثر یہ واقعہ بھول جاتے ہیں کہ یہ حدیث یا اس قسم کے دوسرے اقوال اس زمانہ کے سماجی حالات کا عکس ہیں جب انسانوں کی تقسیم حاکم اور محکوم، راعی اور رعیت میں ہوتی تھی اور مسلمان من حیث القوم حکمران تھے ۔۔۔ البتہ اسلامی تمدن اور تہذیب کا مفہوم اس درجہ محدود نہ تھا جیسا کہ آجکل ہو گیا ہے۔ آج اسلامی تہذیب کی زندگی خطرہ میں پڑ جاتی ہے اگر مسلمان بجائے کلاہ اور عمامہ کے گاندھی ٹوپی پہننے لگتے ہیں یا ہندی رسم الخط کے پرچار کے لئے دو چار ہندو اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک خاص قسم کا لباس اگر نہ پہنئے یا اگر فصیح و بلیغ اردو نہ بولئے تو آپ کا تمدنی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ مذہبی حیثیت سے بھی مسلمان رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ معیاری اور ٹکسالی مسلمان صرف وہ خوش نصیب لوگ ہیں جو دہلی اور لکھنؤ کی فضا میں پلے اور بڑھے ہیں ۔ رہا ہے وہ کایستھ یا کشمیری برہمن ہی کیوں نہ ہوں)، یا پھر دیوبند اور فرنگی محل کا لباس پہننے والے اور علماء کی وضع کے پابند لوگ"

دیکھئے! ترقی پسندوں کے علم و فضل اور ان کی دانش و بینش کا معیار کس قدر بلند ہے! ان کے ارشادات جب ہم پڑھتے ہیں تو بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی آواز کو ایک ریکارڈ میں بھر دیا ہے اور وہی ریکارڈ جگہ جگہ بجتا پھر رہا ہے۔ اپنے شیخ طریقت پنڈت جواہر لال کی طرح یہ لوگ بھی اسلامی تہذیب و تمدن کے مسئلہ پر اظہار خیال کرکے درحقیقت

---

لے جہالت ملاحظہ ہو۔ جو حدیث انسان کی انفرادی ذمہ داری و مسئولیت کا عظیم الشان اخلاقی تصور پیش کر رہی ہے اس کی معنویت کو کس بری طرح خاک میں ملایا گیا ہے۔ پھر اس علم اور اس فہم پر جسارت کا یہ حال ہے۔ کہ اسلامی تہذیب و تمدن کے متعلق ماہرانہ گفتگو فرمائی جاتی ہے۔

اپنی بے علمی کا راز فاش کرتے ہیں اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف اسلامی تہذیب و تمدن ہی سے نابلد نہیں ہیں، بلکہ نفس تہذیب و تمدن کے مفہوم سے نا آشنا ہیں — یا اگر نا آشنا نہیں ہیں۔ تو عمداً غلط مبحث کر کے مسلمانوں کو دھوکا دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔

یہ تہذیب نام رکھتے ہیں تمدنی مظاہر کا، حکمراں طبقے کے آداب و اطوار کا، لباس کی وضع اور کھانوں اور مٹھائیوں کا، موسیقی اور سنگتراشی اور مصوری کا، اور اظہار مافی الضمیر کے وسائل کا پھر ان تمدنی مظاہر میں گردش ایام کے ساتھ جو تغیرات رونما ہوتے ہیں ان میں یہ اس حیثیت سے کوئی امتیاز نہیں کرتے کہ کونسے تغیرات ایک تہذیب کے زیر اثر ہوئے اور کونسے دوسری تہذیب کے زیر اثر۔ بس سطح پر چند تغیرات دیکھکر یہ اپنی تقریر شروع کر دیتے ہیں کہ دیکھو، تاریخ کے دوران میں تمہارا تمدن بار بار بدل چکا ہے، اور جب تمدن بدلا ہے تو گویا تہذیب بدل گئی ہے، لہٰذا اسلامی تہذیب و تمدن کسی متعین حقیقت کا نام نہیں ہے۔ جس طرح پہلے تم بہت سے تغیرات قبول کر چکے ہو اسی طرح اب بھی ان تغیرات کو قبول کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ جن کا تقاضا، فضا کے انقلاب انگیز حالات یا بالفاظ دیگر جواہر لال اور ان کی امت کے رجحانات کر رہے ہیں — حیرت ہوتی ہے کہ یہ لوگ علانیہ ایسی صریح جاہلانہ باتیں لکھنے اور شائع کرنے کی جرات کیسے کرتے ہیں۔ کیا انہوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ سارا ہندوستان بس جہلا ہی سے آباد ہے اور یہاں کوئی پڑھا لکھا آدمی نہیں بستا؟

اگرچہ یہاں تفصیل کا موقعہ نہیں ہے مگر میں عام ناظرین کی واقفیت کے لئے بطور جملہ معترضہ صرف اتنا عرض کئے دیتا ہوں کہ دراصل تہذیب اس طریق فکر، اس نظریہ حیات اور اس معیار امتیاز و انتخاب کا نام ہے جو انسانوں کی کسی معتدبہ جماعت کے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتا ہے، اور اس کے زیر اثر وہ جماعت دنیا میں زندگی بسر کرنے کے مختلف طریقوں میں سے کسی خاص طریقے کو اختیار کرتی ہے۔ اور تمدن اس خاص طرز زندگی کا نام ہے جو اسی تہذیب کے زیر اثر اختیار کیا جائے۔ ہم جس چیز کو اسلامی تہذیب کہتے ہیں وہ لکھنؤ اور دلی کی فصیح و بلیغ اردو اور دیوبند و فرنگی محل کے علماء کا لباس نہیں ہے، بلکہ وہ اس ذہنیت، اس طرز خیال اور

ان اصولِ حیات پر مشتمل ہے جو قرآن اور سیرتِ رسول سے ماخوذ ہیں۔ جب تک کوئی تمدّن اس تہذیب کے حدود کے اندر ہے، وہ اسلامی تمدّن ہے، خواہ اس کی زبان اس کے لٹریچر، اس کے آداب و اطوار، اس کے کھانوں اور مٹھائیوں، اس کے لباس و طرزِ معاشرت اور اس کے فنونِ لطیفہ، میں کتنے ہی تغیرات واقع ہو جائیں۔ مظاہر کا تغیر بجائے خود کسی تمدّن کو اسلامی تہذیب کے دائرے سے خارج نہیں کر دیتا۔ البتہ جب وہ اس نوعیت کا تغیر ہو کہ اسلامی تہذیب کے اصول و قواعد میں اس کے لئے کوئی سندِ جواز نہ ہو، تو یقیناً وہ تمدّن کو غیر اسلامی تمدّن بنانے کا موجب ہو گا۔ مثال کے طور پر مسلمان مشرق سے لے کر مغرب تک بیسیوں طرح کے لباس پہنتے ہیں، مگر ان سب میں سترِ عورت کے انہی حدود کا لحاظ رکھا جاتا ہے جو اسلامی تہذیب نے مقرر کر دیئے ہیں۔ لہٰذا یہ سب اپنے تنوعات کے باوجود اسلامی تمدّن ہی کے لباس کہے جائیں گے۔ مگر جب کوئی لباس ان حدود سے قاصر ہو گا تو ہم اسے غیر اسلامی لباس کہیں گے۔ اسی طرح غذا کے متعلق حلال و حرام کے حدود اسلامی تہذیب نے مقرر کئے ہیں، ان کے تحت خواہ کتنی ہی انواع و اقسام کے کھانے مسلمانوں کے گھروں میں پکتے ہوں اور تاریخ کے دوران میں ان کی نوعیتیں کتنی ہی بدل جائیں اور کھانے کے طریقوں میں کتنا ہی تغیر رونما ہو جائے، ان سب کو اسلامی تمدّن ہی کے دائرے میں جگہ ملے گی۔ البتہ جب مسلمانوں کی غذا حدودِ حلّت سے متجاوز ہو گی تو ہم کہیں گے کہ وہ اسلامی تہذیب و تمدن سے بغاوت کر رہے ہیں۔ اسی پر زندگی کے تمام معاملات کو قیاس کر لیجئے۔ عرب، ہندوستان، ایران، ترکستان، اور شمالی افریقہ کے تمدنوں میں بظاہر خواہ کتنا ہی فرق ہو، بہرحال جب تک ان کے اندر اسلامی ذہنیت کی روح موجود ہو گی، اور جب تک یہ شریعت اسلامی کے ضابطہ میں رہیں گے، ان پر یکساں "اسلامی تمدّن" کا اطلاق ہو گا۔ مگر جب یہ کسی دوسری تہذیب کا اثر قبول کریں گے اور ایسی چیزیں اپنے اندر داخل کر لیں گے جو اسلامی تہذیب کی روح یا شریعت اسلام کے خلاف ہوں۔ تو بلاشبہ یہ

کہا جائے گا کہ ان ممالک میں اسلامی تمدن مسخ ہو رہا ہے۔

اب آپ غور فرمائیں کہ پنڈت جواہر لال اور ان کے یہ مسلمان متبعین اسلامی تہذیب و تمدن کے مسئلے کو کیسی غلط روشنی میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ دنیا کو اور نیز و ناواقف مسلمانوں کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ :-

"اسلامی تہذیب و تمدن فی نفسہ کوئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ صدیوں پہلے مغلوں اور پٹھانوں کے دورِ حکومت میں جو طور طریقے مسلمانوں میں رائج ہو گئے تھے انہی کا نام اسلامی تہذیب و تمدن رکھ دیا گیا ہے۔ آج جو مسلمان اسلامی تہذیب و تمدن کے تحفظ کا شور مچا رہے ہیں، ان کا مقصد محض اس گذرے ہوئے تاریخی دور کی میراث کو اس بدلے ہوئے زمانہ میں جوں کا توں برقرار رکھنا ہے، اس لئے یہ رجعت پسند اور ترقی دشمن ہیں"

ایک پوری قوم کے نقطۂ نظر کی اس قدر غلط ترجمانی اور اتنی جسارت کے ساتھ شاید یورپ کے سیاسی بازیگروں سے بھی بن نہ آتی۔ یہ ہمارے ہم وطن اور ہم قوم اس معاملہ میں ان سے بھی بازی لے گئے۔

ان کو اگر معلوم نہیں ہے تو ہم انہیں بتانا چاہتے ہیں کہ ہم اس تمدن کی حفاظت کے لئے نہیں اُٹھے ہیں جو کسی زمانہ میں حکمران طبقہ کے رجحانات سے پیدا ہوا تھا۔ بلکہ اس لئے اُٹھے ہیں کہ ہماری قوم کا تمدنی ارتقاء قرآنی تہذیب کے راستہ سے منحرف نہ ہونے پائے۔ ہمیں دِلّی اور لکھنؤ کی ٹکسالی اردو کو بچانے کی فکر نہیں ہے، بلکہ اس ذہن کو اسلامی ذہن رکھنے کی فکر ہے۔ جس نے اپنی شخصیت ظاہر کرنے کے لئے اس زبان کو وسیلہ بنایا ہے۔ ہم دیوبند اور فرنگی محل کے لباس کو محفوظ رکھنے کے لئے نہیں لڑ رہے ہیں۔ بلکہ اس لئے لڑنا چاہتے ہیں کہ ہمارے مرد اور ہماری عورتیں اس لباس حیا سے خارج نہ ہو جائیں جو اسلامی تہذیب نے انہیں پہنایا ہے۔ اور اس لڑائی کی ضرورت ہمیں اس لئے پیش آئی ہے کہ ہم ہندوستان کی سیاست پر تم جیسے لوگوں کو غالب آتے دیکھ رہے ہیں جن میں ہماری تہذیب کو سمجھنے کی

صلاحیت نہیں، جن میں اتنی راست بازی و انصاف پسندی نہیں کہ دوسروں کے نقطۂ نظر کو سمجھنے کی کوشش کریں، اور جن میں ان کمزوریوں کے ساتھ ہٹلر اور مسولینی کی فاشستی روح گھس گئی ہے کہ اپنی مرضی کو دوسروں پر مسلط کرنے کے لئے کسی طاقت کے استعمال سے دریغ نہیں کرتے خواہ اس کے استعمال میں صداقت، انسانیت اور اخلاق کو قربان ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔

خیر یہ ایک ضمنی بحث تھی۔ یہاں میں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ کانگریس کا یہ شعبۂ اسلامیات جو ہماری " دلدہی " اور " سہولت کار " کے لئے قائم کیا گیا ہے، دراصل کیا خدمات انجام دے رہا ہے۔ اسلامی تہذیب و تمدن کے متعلق پنڈت جواہر لال نہرو کے جو نظریات آپ پڑھ چکے ہیں، اُن کو مسلمان مضمون نگاروں اور مسلمان اخباروں کے ذریعہ سے مسلمانوں کے دلوں میں اتارنا اس کا مقصد ہے، اور آپ نے دیکھ لیا کہ یہ شعبہ جو ہماری " دلدہی " کے لئے قائم کیا گیا ہے اس مقصد کو کس خوبی کے ساتھ پورا کر رہا ہے۔ وہ ہمیں سمجھا رہا ہے کہ یہ تہذیب جس کی حفاظت کا تم دعویٰ کر رہے ہو، کوئی چیز بھی تو نہیں ہے۔ مسلمان حکمران طبقہ کے رجحانات تھے سو وہ طبقہ ہی ختم ہو گیا۔ ایک خاص ماحول میں اس تہذیب نے تربیت پائی تھی، سو وہ ماحول ہی اب باقی نہیں۔ اب لے دے کے تمہاری تہذیب یہ رہ گئی ہے کہ ایک خاص وضع کا لباس پہن لیتے ہو اور ٹکسالی اردو بول لیتے ہو، تو وہ بھی دلّی اور لکھنؤ تک محدود ہے اور دلّی و لکھنؤ میں بھی وہ کوئی خاص تمہاری چیز نہیں ہے بلکہ کایستھ اور کشمیری برہمن بھی تمہارے ساتھ شریک ہیں۔ کیا اسی مہمل چیز کو تم فضا کے انقلاب انگیز تقاضوں اور سیاسی و اقتصادی حالات کی ترقی کے مقابلہ میں بچانا چاہتے ہو؟ یہ تو عین رجعت پسندی ہے کیونکہ وہ دور گذر چکا جس میں یہ تہذیب پیدا ہوئی تھی۔ اور یہ سامراج پرستی بھی ہے۔ کیونکہ فضا کے انقلاب انگیز تقاضوں کے مقابلہ میں اس بوسیدہ چیز کی حفاظت صرف اسی طرح ہو سکتی ہے کہ تم سامراج کی حمایت کرو اور سامراج تمہاری حمایت کرے! ـــ مسلمانوں کو شکایت

تھی کہ کانگریس عام مسلمانوں سے ربط نہیں رکھتی۔ اس شکایت کی معقولیت تسلیم کر کے کانگریس نے کیسے معقول طریقہ سے اسے دور کیا ہے!

ڈاکٹر اشرف صاحب کا وعظ ابھی ختم نہیں ہوا۔ آگے سنئے:۔

"جاگیرداری اور عہد بادشاہت کے زمانہ میں باعتبار زبان، لباس، تمدن، بلکہ مذہبی عقائد کے لحاظ سے بھی مسلمانوں میں کوئی یکسانیت نہ تھی۔ عربی، فارسی، ترکی، تاتاری، چینی سب مسلمانوں کی زبانیں تھیں۔ مغربی، مشرقی، ایرانی، رومی، ہندی ہر طرح کے لباس مسلمانوں کے ہر طبقہ میں رائج ہو چکے تھے۔ چنانچہ جب ہمایوں ہندوستان سے جلاوطن ہو کر ایران پہنچا۔ تو شاہ ایران نے بجائے ایرانی کھانوں کے اپنے مہمان کے لئے خاص طور پر ہندوستانی مٹھائیاں اور کھانے تیار کرائے۔ عقائد کی یکسانیت کا تو مسلمانوں میں سرے سے کوئی سوال ہی نہیں، بہتّر فرقے ضرب المثل ہیں"

کچھ غور بھی کیا آپ نے کہ یہ تنوّع کی تمام مثالیں کس مقصد کے لئے پیش کی جا رہی ہیں؟ اس کا مقصد یہ ہے کہ جب اتنی زبانیں بول کر، اتنے مختلف لباس پہن کر، ایران میں ہندوستانی مٹھائی کھا کر، بہتّر فرقوں میں بٹ کر، اور عقائد میں یکسانیت سے محروم ہو کر بھی تم مسلمان رہے تو اب اگر تم گاندھی کیپ اور دھوتی پہن لو، تمہاری عورتیں سماجی خدمت Socil Service. کے لئے گھروں سے باہر نکل آئیں، تم نئی "ہندوستانی" زبان بولنی اور لکھنی شروع کر دو، مخلوط تعلیم گاہوں میں تمہارے لڑکے اور تمہاری لڑکیاں "جدید طرز تعلیم" حاصل کرنے لگیں، سیاسی معاشرتی اور معاشی انقلاب کی جدید تحریکات تم میں پھیلنے لگیں تو اس میں کونسا مضائقہ ہو جائیگا؟ — اسی مقصد کو چھپا کر ان الفاظ میں ظاہر کیا گیا ہے:۔

"اس اعتبار سے آج ہم ایک نئے اور زندہ تمدن کی تعمیر میں مصروف ہیں۔ ہماری سیاسی اور سماجی جدوجہد اس نئے تمدن کا پیش خیمہ ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہم اس نئی تاریخی منزل اور اس کے تقاضے سے باخبر ہوں"

اب آپ کو معلوم ہو گیا کہ یہ ساری دماغ سوزی اس سماجی انقلاب ( Revolution. Soical) کے لئے مسلمانوں کو تیار کرنے کی خاطر کی گئی ہے، جس کا نقشہ پنڈت جواہر لال نہرو کے خیالات میں آپ دیکھ چکے ہیں۔ اور یہ دعوت پھیلائی کس اخبار کے ذریعہ سے جا رہی ہے؟ اس اخبار کے ذریعہ سے جو جمعیت علماء ہند کا واحد ترجمان ہے۔ کیسے صحیح راستہ پر جا رہی ہے یہ "آزادی کی فوج" شردھانند کی شدھی پر شور قیامت برپا تھا۔ جواہر لال کی شدھی شربت کے گھونٹوں کی طرح اتاری جا رہی ہے۔

"آزادی کی فوج" اپنے مسلمان سپاہیوں سے جو خدمت لے رہی ہے ان میں سے دو صاحبوں کے کارنامے آپ نے ملاحظہ فرمالئے۔ ایک صاحب نے اسلامی قومیت پر تیشہ چلایا۔ دوسرے صاحب نے اسلامی تہذیب پر ضرب لگائی۔ اب تیسرے سپاہی کا کارنامہ ملاحظہ ہو۔

اسی "شعبۂ اسلامیات" کے ایک ذمہ دار کارکن منتظر رضوی[1] صاحب کا ایک طویل مضمون "مسٹر جناح کی کھوکھلی قیادت" کے عنوان سے اخبار "مدینہ" بجنور نے نومبر ۳۷ء کی کئی اشاعتوں میں درج کیا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:۔

"ہمارا دوسرا حربہ حکومت اور اس کے حاشیہ بردار زمینداروں، تعلقداروں، جاگیرداروں کی مالگذاری اور لگان بند کرنا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ ان پایوں کو گراتے وقت ایک بہت بڑی کرانتی (انقلاب) مچیگی، بلوے اور فساد ہونگے۔ اس میں خونریزیاں بھی ہوں گی، خون کی ندیاں بہیں گی اور سب کچھ ہو گا۔ اور اس وقت یہ جتنے زمیندار، سرمایہ دار، پونجی اور کانوں کے مالک، تعلقوں اور جاگیروں کے آقا یعنی راجہ محمود آباد، نواب چھتاری، سر سکندر حیات، راجہ نریندر ناتھ، گھنشام داس برلا، بھائی پرمانند سیٹھ والمیا جو مسلم ملت اور

[1] ابھی معلوم ہوا کہ یہ صاحب کانگریس سکریٹریٹ سے الگ کر دیئے گئے۔ لیکن ان کی علیحدگی کا سبب یہ مضامین اور پالیسی نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔ لہٰذا ان مضامین کی ذمہ داری سے کانگریس سکریٹریٹ اب بھی بری الذمہ نہیں ہے۔

ہندو جاتی کے نعرے لگائے جاتے ہیں، اپنی اپنی غریب اور دکھی جنتا اور غریب اور فاقہ مست عوام کو چھوڑ کر برٹش سامراج کے ساتھ ہوں گے اور ان پر گولے اور بم برسائیں گے۔ دوسری طرف غریبوں کی طاقت ہوگی اور ان کی جیون ساتھی کانگریس۔"

ہماری آنے والی لڑائی دراصل امیری اور غریبی کی لڑائی ہوگی۔ اس میں ہندوستان بھر کے امیر چاہے وہ کسی مذہب اور فرقے کے کیوں نہ ہوں بدیسی سامراج کے ساتھ ہوں گے اور وہ ہم غریبوں اور مفلسوں کو توڑنے اور تباہ کرنے کے لئے ہر ہتھیار کو استعمال کریں گے۔ پھر کسانوں اور مزدوروں کی جاگ سے امیروں کو، راجہ محمود آباد، نواب چھتاری اور سر سکندر جیسے لوگوں کو بہت بڑا خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔ وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ زمانہ پلٹا کھانے کو ہے دولت اور امیری ہاتھ سے نکلنے کو ہے امیروں کو نیچے آنا ہے، غریبوں کو اوپر جانا ہے۔ ان سب باتوں کے ڈر سے ہندو جاتی اور مسلم ملت کے یہ ہندو مسلم نام لیوا اپنے اپنے مذہب کے لوگوں کو سامراج مخالف تحریک سے ہٹا کر رکھنا چاہتے ہیں تاکہ یہ لوگ مل کر آخری لڑائی نہ لڑنے پائیں۔ اس لئے قرآن اور حدیث کی آیتیں اور وید اور شاستر کے اشلوک پڑھے جا رہے ہیں۔"

جنگ آزادی کی نوعیت کو اس طرح واضح کرنے کے بعد فاضل مضمون نگار فرماتے ہیں:-

"مسٹر جناح نے پکار کر کہا ہے "ہندوستان بھر کے مسلمانو مل جاؤ" سوال یہ ہے کہ ہندوستان بھر کا مسلمان آپس میں کیوں ملے؟ اس اتحاد کی ضرورت کیا؟ اس کا مقصد کیا؟ جہاں تک توحید رسالت، مذہبی معتقدات، اور مذہبی حرکت و عمل کا تعلق ہے وہ آپس میں ملے ہوئے ہیں بالکل متحد ہیں۔ ان میں کوئی اختلاف نہیں۔ اور ہم مسٹر جناح کو یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ بھی کوئی اختلاف نہ ہوگا۔ لیکن سیاسی اور اقتصادی اغراض و مفاد کے لئے مسلمانوں کا آپس میں ملنا ناممکن ہے۔ وہ ہرگز متحد نہیں ہو سکتے۔ اور نہ ان کو متحد ہونا چاہئے۔ مسلمانوں کے اغراض اور فائدے بالکل ایک سے نہیں ہیں۔"

ہندوستان میں امیر و غریب کے دو طبقے ہیں۔ امیروں کی غرض یہ ہے کہ امیری کے جتنے

بھی وسائل ہیں ان پر ان لوگوں کا قبضہ رہے اور غریبوں کی محنت سے، وہ فائدہ اٹھاتے
رہیں۔ غریبوں کا فائدہ اس میں ہے کہ امیر کے وسیلے ان کے ہاتھ سے چھن جائیں اور ان
کا انتظام اس طرح ہو کہ ملک سے غربت دور ہو۔ غربت کے دور کرنے کا سوائے اس کے
اور کوئی چارہ نہیں کہ دولت کے ان محدود پہلوؤں کو ان کے چنگل سے نکال لیا جائے۔ شخصی
ملکیت کو ختم کیا جائے۔ یہ عام اور اصولی بات ہے۔ اب ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں
کا فائدہ کیا ہے؟ مسلمانوں میں بھی کچھ امیر ہیں اور کچھ غریب، سب کی ایک ہی حالت نہیں
ہے۔ مسلمانوں کے تھوڑے سے لوگ امیر ہیں۔ جو زیادہ سے زیادہ ایک کروڑ ہوں گے۔ سات
کروڑ مسلمان محنت سے روٹی حاصل کرتے ہیں۔ جب تک پونجی شاہی دولت کی پیداوار
اور تقسیم کے طریقوں کو ہم متذکرہ بالا انقلابات سے غارت نہیں کرتے ان کے روزگار کا
کوئی انتظام نہیں ہو سکتا۔ اس کے خلاف وہ ایک کروڑ مسلمان بھی ہیں جن کے پاس زمین
جائداد، کارخانے اور کمپنی ہیں۔ ان کی جیبوں میں بڑی بڑی سرکاری ملازمتیں ہیں۔ وہ سکھ
اور چین کی زندگی بسر کرتے ہیں اور مزے اڑاتے ہیں۔ اب ان سات کروڑ غریب مسلمانوں
کو ایک کروڑ امیر مسلمانوں سے ملنے کے لئے کہا جاتا ہے۔"

"خیر تو عام مسلمانوں کے حقوق اور مفاد عام ہندوؤں سے جدا نہیں ہیں۔ خود مسلم ملت کے
حقوق و مفاد باہم دگر متضاد اور مختلف ہیں، ان میں کوئی یگانگت نہیں.... مختصر یہ کہ مسلمان
ہونے کی حیثیت سے بھی ہمارے مفاد آپس ہی میں بالکل مختلف ہیں۔"

یہی منظر صاحب اپنے ایک دوسرے مضمون (مدینہ مورخہ ۱۳ / دسمبر ۳۷ء) میں فرماتے ہیں:

"غریبوں، مفلسوں، اور غلاموں کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن نہیں۔ اس کا سب سے بڑا مذہب
روٹی کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس کا سب سے بڑا تمدن ایک پھٹا پرانا کرتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا
ایمان موجودہ افلاس اور نکبت سے چھٹکارا پا لینا ہے۔ وہی روٹی اور کپڑے جس کے لئے وہ
چوری کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ آج افلاس اور غلامی کی دنیا میں اس کا کوئی مذہب اور کوئی

مذہب اور کوئی تمدن نہیں ...... اس پیٹ کے لئے اسے انقلاب اور کرانتی کرنی پڑے گی"

چند اور فقرے اسی مضمون کے ملاحظہ ہوں:-

"اس وقت ہندوستان میں دو ہی سوال اس اعتبار سے ہیں۔ سرمایہ داری کا استحصال اور غلامی یا ترقی اشتراکیت اور آزادی بیچ کی کوئی راہ نہیں۔ ہمارا کوئی درمیانی مسلک نہیں ہو سکتا"

"اسی ردعمل کا نتیجہ روس کی نئی حکومت ہے۔ جو زمین پر ایک جنت ہے۔ وہاں بیکاری بھوک، جہالت اور تنگ دستی کا نام نہیں"

"مذہب اور عقائد کو ان باتوں سے کیا خطرہ؟ کیا تعلق؟ مذہب تو ہمیشہ اگر اس میں اخلاقی اور روحانی طاقت رہی ہے، زندہ، تابندہ اور پائندہ ہی رہا ہے۔ مذہب کی سب سے بڑی فکر ہمارے فقیہوں اور محدثوں کو ہو سکتی ہے، نہ کہ عیاش رئیسوں کو، سو ہمارے فقیہ اور محدث اور علماء آج ہی نہیں بلکہ اسی وقت سے، جب سے قومی تحریک کی شروعات ہوئی ہے۔ ہمارے ساتھ رہے ہیں۔ لیکن آج ہمارا نصب العین مذہبی نہیں ہے۔ بلکہ محض اقتصادی اور سیاسی ہے۔ ہمیں تو آج کے حالات میں رہ کر، آج کے حالات سے اپنی بغاوت قائم کرنی۔ ہے علماء کا ایک طبقہ ایک ہی چیز کو حرام قرار دیتا ہے اور دوسرا حلال۔ آج انہی کا ایک طبقہ تحریک کانگریس کو شجر ممنوعہ سمجھتا ہے۔ اور دوسرا خیر و برکت کا مجموعہ۔ اور پھر اس کا کیا یقین ہے کہ جب ہم ایک ہی سماج اور نئے نظام معاش کی تاسیس کرنے لگیں گے، جب ہم شخصی ملکیت کو خارج اور ختم کر کے ملک کی دولت اور اس کی پیداوار کو نئے طریقوں پر تقسیم کرنے لگیں گے۔ تو اس وقت بھی یہ طبقہ ہمارے ساتھ ہو گا"[1]

[1] خط کشیدہ فقرے علمائے کرام کے لئے خاص طور پر غور کے لائق ہیں۔

۱۳ر دسمبر ۳۹ء کے "مدینہ" میں پنجاب پراونشل مسلم ماس کانٹیکٹ کمیٹی کے سکریٹری منشی احمد دین صاحب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:-

"ہم زیادہ تنداری کے ساتھ یہ سمجھ چکے ہیں کہ ہندوستان کے آنے والے انقلاب میں جو جنگ آزادی لڑی جائے گی وہ محنت اور سرمایہ، غریب اور امیر، بالفاظ دیگر ظالم اور مظلوم کی جنگ ہوگی، جس میں ہندو اور مسلمان مظلوم ایک طرف ہوں گے۔ گویا اس لڑائی میں ہندو اور مسلمان عوام دونوں برابر ہوں گے۔ لہٰذا فرقہ وارانہ جنگ، طبقہ وارانہ جنگ میں تبدیل ہوگی۔"

ان طویل اقتباسات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آزادی کی فوج کے مسلمان سپاہی کس وفاداری کے ساتھ اس مشن کو مسلمانوں میں پھیلا رہے ہیں جو ان کے غیر مسلم لیڈروں نے ان کے سپرد کیا ہے۔

---

# حصولِ آزادی کا طریقہ

پچھلے دونوں ابواب پر تبصرہ کرنے سے پہلے میں ناظرین کو ان تنقیحات کی طرف دوبارہ توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں۔ جو میں نے اس سلسلہ کی تمہیدی مباحث میں قائم کی تھیں۔ ان تنقیحات میں سے اولین تنقیح یہ تھی کہ:-

"ہمیں جنگ آزادی میں شریک ہونے سے پہلے یہ دریافت کرنا چاہئے کہ آزادی حاصل کرنے کے لئے طریقہ کونسا اختیار کیا جا رہا ہے۔ اگر تحقیق سے معلوم ہو کہ حصول آزادی کا وہ طریقہ اختیار کیا جا رہا ہے۔ جو ہماری تہذیب اور ہمارے نظام اجتماعی کے اصولوں سے متصادم ہوتا ہو، تو ہم اس کے ساتھ تعاون نہیں کر سکتے"

اس تنقیح کو پیش نظر رکھ کر دیکھئے کہ کانگریس کے مسلم اور غیر مسلم لیڈروں اور کارکنوں کی جو تحریریں پچھلے دو ابواب میں نقل کی گئی ہیں ان سے حصول آزادی کے کس راستے کا نشان ملتا ہے۔

ان کے نزدیک ہندوستان کو آزاد کرانے کے لئے ضروری ہے کہ اس ملک کی تمام قومیتوں اور قومی امتیازات کو مٹا کر پوری آبادی کو ایک قوم بنا دیا جائے۔

اس غرض کے لئے وہ سب سے پہلے اسلامی قومیت پر حملہ کرتے ہیں کیونکہ جبتک مسلمانوں کے ذہن میں یہ خیال موجود ہے کہ پیروان اسلام ایک قوم ہیں اور منکرین اسلام دوسری قوم، اس وقت تک آٹھ کروڑ کی اس عظیم الشان آبادی کا ہندوستانی قومیت میں تحلیل ہو جانا محال ہے اسی لئے تمام قوم پرست یکزبان ہو کر کہتے ہیں کہ "مسلمان" کسی قوم کا نام نہیں ہے، اور اسی لئے ان کی تعلیم یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے آپ کو "مسلم" کہنے کے بجائے "ہندی" کہیں

ان کا دوسرا حملہ اسلامی تہذیب و تمدن پر ہے۔ ہندوستان کی آبادی ایک قوم نہیں بن سکتی جب تک کہ سب ایک تہذیب، اور ایک تمدن نہ اختیار کرلیں۔ عقائد، جذبات و احساسات لباس، طرز زندگی، زبان، ادب اور قوانین اور معاشرت و تمدن کے لحاظ سے جب تک مسلمانوں میں یک جہتی باقی ہے اس وقت تک بہرحال وہ اپنے آپ کو ایک قوم ہی سمجھتے رہیں گے، اور جب تک ان امور میں وہ ہندوستان کے دوسرے باشندوں سے مختلف ہیں، اس وقت تک بہرحال ان کا قومی تشخص دوسروں سے الگ ہی رہے گا۔ اس علیحدگی کو مٹانے کے لئے مسلمانوں میں پورے زور شور کے ساتھ یہ تبلیغ کی جارہی ہے کہ ان کی نہ کوئی خاص تہذیب ہے اور نہ کوئی مخصوص تمدن "زمانے کے شدید انقلاب انگیز تقاضوں" سے جو تہذیب پیدا ہو رہی ہے، اور ہندوستان کے دوسرے باشندوں میں جو تمدن نشو ونما پا رہا ہے، اسے ان کو بے تکلف قبول کرنا چاہیئے۔ تاکہ وہ سب کے ساتھ ہم رنگ ہو جائیں۔

ان کا تیسرا حملہ اسلام کے نظام اجتماعی پر ہے۔ مسلمانوں میں اشتراکیت کی تبلیغ جو کی جارہی ہے اس کا مقصد دراصل یہی ہے کہ صرف اسی ذریعہ سے اسلامی سوسائٹی کے نظام کو پارہ پارہ کیا جاسکتا ہے، اور مسلمانوں کی جماعت کے افراد کو ایک دوسرے سے الگ کرکے فرداً فرداً غیر مسلم آبادی میں جذب کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی دوسری تدبیر نہیں ہے۔ کانگریس کے متعلق یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی ہے کہ اس کا نصب العین اشتراکی نہیں ہے۔ نہ وہ سرمایہ داروں سے بگاڑنا چاہتی ہے، نہ سرمایہ داری نظام کو ختم کرنا چاہتی ہے، نہ اس سماجی (تمدنی) انقلاب کی حامی ہے جس کا ذکر جواہر لال اور سوبھاش چندر بوس بار بار کیا کرتے ہیں ہری پورہ کانگریس میں جواہر لال کے سامنے اور سوباش چندر بوس کی صدارت میں سردار ولبھ بھائی پٹیل نے سوشلسٹ جماعت کو بری طرح ڈانٹا تھا۔ اور یہ الفاظ کہے تھے۔ کہ:۔

"تم کانگریس میں دست راست اور دست چپ کی جماعتیں پیدا کرنے کے ذمہ دار ہو حالانکہ کانگریس ہمیشہ سے ایک وحدت رہی ہے۔ ہم برابر دو سال سے تمہارے وجود کو برداشت

کر رہے ہیں، مگر وقت آ رہا ہے جب ہم تمہیں برداشت نہ کر سکیں گے۔" (ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۲ نومبر ۳۸ء دی گئی)

اس زجر و توبیخ پر ہندوستانی اشتراکیت کے ان دونوں اقنوموں میں سے ایک نے بھی دم نہ مارا۔ کانپور، احمد آباد اور دوسرے مقامات پر مزدوروں کا سر خود کانگریسی وزارتیں ہی کچلتی رہی ہیں۔ مدراس اور صوبہ سرحد اور دوسرے صوبوں میں جہاں کہیں اشتراکیوں نے چادر سے پاؤں نکالا وہاں کانگریسی حکومتوں ہی نے ان کی سرکوبی کی ہے۔ ابھی چند ہی روز ہوئے ہیں کہ حکومت مدراس نے اشتراکیت کی تبلیغ کے خلاف ایک کمیونک شائع کیا ہے۔ جس میں وہ لکھتی ہے کہ:۔

"چند پمفلٹ جو ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے شائع کئے جا رہے ہیں، حال میں حکومت کے ہاتھ آئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پارٹی حد سے گذرتی جا رہی ہے اور اس ملک میں ابتری پھیلانا چاہتی ہے۔ اس لئے حکومت اپنا فرض سمجھتی ہے کہ پبلک کو اس سے متنبہ کر دے تاکہ عام باشندگان ملک نادانستگی میں ایسی تحریک سے متاثر نہ ہو جائیں جس کا فلسفہ اور طریق کار بالکلیہ اس ملک کی تہذیب اور روایات کے خلاف ہے۔"

اس کے بعد اس کمیونک میں اشتراکی پمفلٹوں کا خلاصہ دیا گیا ہے جس کے یہ الفاظ خاص طور پر غور طلب ہیں:۔

"محنت کش طبقوں کی انقلابی فوج یعنی ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی اس ملک میں طبقہ وارانہ جنگ برپا کرے گی۔ اور قومی انقلابی ہڑتال کا اعلان کرے گی۔ کاریگر اپنے اوزار رکھ دینگے دماغی کام کرنے والے دفتروں سے نکل آئیں گے طلبہ مدرسوں سے سڑکوں پر آ جائیں گے۔ کسان مالگزاری اور لگان دینے سے انکار کر دیں گے۔ ریلیں کھڑی ہو جائیں گی، کارخانے اور مل اور بجلی گھر بند ہو جائیں گے . . . ." (ملاحظہ ہو اخبار ہریجن مورخہ ۲۰ اگست ۳۹ء)

یہ ٹھیک وہی خیالات ہیں جو کانگریس سکرٹریٹ کے دفتر سے منظر رضوی صاحب شائع کر چکے ہیں، مگر یہ عجیب بات ہے کہ جب یہ خیالات مسلمانوں میں پھیلائے جاتے ہیں تو ان کو جائز رکھا جاتا ہے۔ اور جب حقیقت میں ملک کے اندر اشتراکی انقلاب برپا کرنے کے لئے ان

کی اشاعت کی جاتی ہے تو کانگریسی حکومت ان کو ہندوستان کی تہذیب اور روایات کے منافی قرار دیتی ہے اور ان کے خلاف نہیں کمیونزم کا نشر کرنا ضروری سمجھتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اشتراکیت فی الواقع کانگریس کی سرکاری پالیسی نہیں ہے، بلکہ خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں میں اس مسلک کو صرف اس غرض سے پھیلایا جا رہا ہے کہ اسلامی سوسائٹی کو درہم برہم کرنے کی اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں۔ حال میں بنگال کے کانگریسی مسلمانوں کا اجتماع بابو سوباش چندر بوس کے زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔ زیر بحث یہ سوال تھا کہ عامۂ مسلمین میں کانگریس کے خیالات اور اصول کامیابی کے ساتھ کس طرح پھیلائے جا سکتے ہیں۔ اور جو مشکلات اس راہ میں حائل ہیں، ان کا حل کیا ہے۔ طویل بحث و تمحیص کے بعد جو بات باتفاق طے ہوئی وہ یہ تھی کہ:۔

"مسلمانوں میں کانگریس کو مقبول بنانے کے لئے ایک معاشی پروگرام پیش کرنا ناگزیر ہے اور یہ پروگرام ایسا ہونا چاہئے جو محنت پیشہ عوام کو اپیل کر سکے"! (نیشنل کال مورخہ ۱۳ اگست ۳۸ء)

"معاشی پروگرام" کے لفظ کو خاص طور پر نوٹ کیجئے۔ اس چھوٹے سے مرکب لفظ میں وہ تمام معانی بھرے ہوئے ہیں جن کی تشریح آپ پنڈت جواہر لال نہرو اور منظر رضوی اور کامریڈ احمد دین صاحبان کی زبانوں سے سن چکے ہیں۔ یہ لوگ خوب جانتے ہیں کہ عام مسلمان خواہ کتنے ہی جاہل ہوں، مگر پھر بھی انہیں اسلام سے گہری محبت و عقیدت ہے، اور کوئی شخص اپنی جان کو خطرے میں ڈالے بغیر ان سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ تم اسلام چھوڑ دو۔ اس لئے ان میں اعلانیہ الحاد و بے دینی کی تبلیغ کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ البتہ اگر ان کے سامنے "روٹی" پیش کی جائے، اور اس میں بے دینی کو لپیٹ کر رکھ دیا جائے تو یہ بھوک کے مارے ہوئے غریب لوگ لپک کر اسے لے لیں گے اور بے تکلف حلق کے نیچے اتار جائیں گے۔ ادھر سے مطمئن ہو جانے کے بعد پھر وہ ہر زہر کو خوشی سے ہضم کر سکتے ہیں۔

یہی کچھ سمجھ کر یہ لوگ خستہ حال مسلمانوں کے دلوں پر قبضہ کرنے کے لئے پیٹ کی طرف سے راستہ پیدا کر رہے ہیں جو بھوکے آدمی کے جسم کا سب سے زیادہ نازک حصہ ہوتا ہے۔ یہ ان سے

کہتے ہیں، کہ آؤ ہم وہ طریقہ بتائیں" جس سے امیری اور غریبی مرتی ہے اور آسودہ حالی آتی ہے" پھر جب بیچارا بھوکا مسلمان دو روٹیوں کی اُمید پر ان کی طرف دوڑتا ہے تو یہ اسے خدا پرستی کے بجائے شکم پرستی کے مذہب کی تلقین کرتے ہیں، اور اس سے کہتے ہیں کہ "غریب اور مفلس کا کوئی مذہب اور کوئی تمدن نہیں۔ اس کا سب سے بڑا مذہب روٹی کا ایک ٹکڑا ہے۔ اس کا سب سے بڑا تمدن ایک پھٹا پرانا کرتہ ہے۔ اس کا سب سے بڑا ایمان اس موجودہ افلاس اور نکبت سے چھٹکارا پالینا ہے" مذہب اشتراکیت کا یہ ابتدائی سبق جس آن اس بیچارے جاہل مسلمان کو دیا جاتا ہے اسی آن اسے یہ پٹی بھی پڑھائی جاتی ہے کہ "مذہب اور عقائد کو ان باتوں سے کیا خطرہ؟ کیا تعلق؟ مذہب تو ہمیشہ، اگر اس میں اخلاقی اور روحانی طاقت رہی ہے، زندہ تابندہ اور پائندہ ہی رہا ہے" اور پھر مزید ضمانت کے طور پر اس سے یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ "بھائی مذہب کی سب سے بڑی فکر تو فقیہوں اور محدثوں ہی کو ہو سکتی ہے، سو دیکھ لو کہ یہ فقیہہ اور محدث اور علماء ہمارے ساتھ ہیں"

روٹی کو دین اور روٹی ہی کو ایمان قرار دینے کے بعد یہ آگے بڑھتے ہیں اور ان پڑھ مفلس مسلمان سے کہتے ہیں، کہ "دیکھو میاں، تمہارے اصلی بھائی وہ غیر مسلم عوام ہیں جو تمہاری ہی طرح بھوک اور افلاس میں مبتلا ہیں۔ تمہیں جو کچھ ملے گا انہی کے ساتھ مل کر جد و جہد کرنے سے ملے گا۔ اور تمہارے اصلی دشمن وہ مسلمان ہیں جو کسی زمین یا مکان یا کارخانے کے مالک ہیں یا جن کے پاس تم سے زیادہ وسائل معیشت موجود ہیں۔ تمہیں جو کچھ مل سکتا ہے۔ انہی سے لڑ کر مل سکتا ہے۔ پس آؤ اپنے غیر مسلم بھائیوں کے ساتھ مل کر اپنے ان مسلمان دشمنوں سے لڑو۔"

اس تبلیغ کا نتیجہ کیا ہو گا؟ اس کا پہلا نتیجہ یہ ہو گا کہ جوں جوں یہ خیالات عام مسلمانوں کے دلوں میں گھر کریں گے، اسلامی سوسائٹی پارہ پارہ ہوتی چلی جائے گی۔ اسلام میں سوسائٹی کا نظام دین کی وحدت پر قائم ہے۔ تمام وہ لوگ جو توحید اور رسالت محمدی کے قائل ہیں، ایک ہیئت اجتماعی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ خواہ ان میں سے ایک عثمان غنیؓ کی طرح

سرمایہ دار ہو اور دوسرا ابوذر غفاری کی طرح قلاش (رضی اللہ عنہما) اسی دینی وحدت کی بنا
پر ان میں نماز کی جماعت سے لیکر شادی بیاہ تک ہر قسم کے معاشرتی اور تمدنی تعلقات قائم
ہوتے ہیں، اور انہی تعلقات سے یہ سب مل کر ایک سوسائٹی بناتے ہیں۔ اس کے برعکس اشتراکی
تبلیغ ان کو معاشی حیثیت سے الگ الگ طبقوں میں تقسیم کرتی ہے اور ان کو یہ سکھاتی ہے
کہ ایک معاشی طبقہ کا مسلمان دوسرے معاشی طبقہ کے مسلمان سے لڑے اور اس کو اپنا
دشمن سمجھے۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد یہ سوسائٹی کے ممبر نہیں رہ سکتے۔ طبقہ وارانہ جنگ
ان کے درمیان صرف معاشرتی تعلقات ہی کو منقطع نہ کرے گی۔ بلکہ خالص دینی حرکت و
عمل میں بھی ان کا آپس میں ملنا غیر ممکن ہو جائے گا۔ یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں کہ جن کے درمیان
روٹی کی جنگ چھڑ گئی ہو وہ ایک دوسرے کے ساتھ مسجدوں میں جمع ہوں، یا وہ مالدار مسلمان
اپنے اس غریب مسلمان بھائی کو زکوٰۃ دے جس کے متعلق اسے یقین ہے کہ وہ اس کا گھر لوٹنے
کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ جو لوگ معاشی اغراض کے لئے
ایک دوسرے کے دشمن بن چکے ہوں اور جن کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف
بغض اور حسد کی آگ بھڑک چکی ہو وہ ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھیں اور ان کے درمیان
انما المومنون اخوۃ کا رشتہ قائم رہ جائے۔

اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہوگا کہ مسلمانوں کے عوام مذہب سے قطعی بیگانہ ہوتے چلے
جائیں گے معاشی طبقات کی جنگ عامۂ مسلمین کو صرف بڑے تعلقہ داروں اور جاگیرداروں
اور لکھ پتیوں ہی سے الگ نہ کرے گی، بلکہ متوسط طبقہ کے ان تمام مسلمانوں سے بھی کاٹ دیگی
جو نسبتہً خوشحال ہیں۔ منظر رضوی صاحب کے اپنے اندازے کے مطابق متوسط طبقہ کے
مسلمان تقریباً ایک کروڑ ہیں اور عام مفلس مسلمان سات کروڑ۔ طبقہ واری جنگ کے معنی ان
ایک کروڑ مسلمانوں سے سات کروڑ مسلمانوں کے برسرپیکار ہو جانے کے ہیں۔ اب یہ ظاہر
ہے کہ اپنے دین کا علم، اپنی تہذیب کا شعور، احکام شرعیہ کی واقفیت، جو کچھ بھی ہے اسی

تعلیم یافتہ متوسط طبقہ ہی میں پائی جاتی ہے۔ یہی طبقہ اس ملک میں اسلامی تہذیب کو کسی نہ کسی حد تک سنبھالے ہوئے ہے۔ عوام انہی سے دین سیکھتے ہیں، انہی سے احکام معلوم کرتے ہیں، اور انہی کے اثر سے تھوڑے بہت اسلامی نظامِ تہذیب و تمدن کی گرفت میں رہتے ہیں۔ جب طبقہ داری جنگ کی بدولت سات کروڑ عام مسلمان ان ایک کروڑ متوسط طبقہ کے مسلمانوں سے کٹ کر الگ ہو جائیں گے تو وہ اسلام سے بالکل بیگانہ ہو کر رہ جائیں گے۔ خود ان کے پاس کوئی علم نہ ہو گا۔ اور جب متوسط طبقہ کے لوگ ان کو دین کے احکام سنائیں گے تو اشتراکیت کا مبلغ فوراً پکار کر کہے گا کہ ہوشیار! پھر وہی مذہب کی افیون تمہیں کھلائی جا رہی ہے، اور پھر اسی "منظم مذہب" کے پھندے میں تم کو پھانسا جا رہا ہے جو "اندھے یقین اور ترقی دشمنی کا، بے دلیل عقیدت اور تعصب کا، توہم پرستی اور لوگوں سے ... فائدہ اٹھانے کا، قائم شدہ حقوق اور مستقل اغراض رکھنے والوں کا حمایتی ہے"۔

اس کا آخری اور فیصلہ کن نتیجہ یہ ہو گا کہ عامۂ مسلمین جب اسلامی قومیت کے تخیل سے خالی الذہن ہو کر فرد فرد بن جائیں گے، اور جب وہ اسلامی تہذیب و تمدن کو ایک لفظِ بے معنی سمجھ کر اس غیر اسلامی تہذیب و تمدن کو قبول کرتے چلے جائیں گے جو "زمانے کے شدید انقلاب انگیز تقاضوں" سے پیدا ہو رہا ہے، اور جب تعلیم یافتہ متوسط طبقہ کے مسلمانوں سے کٹ کر وہ اپنے معاشی طبقہ کے غیر مسلموں میں جا ملیں گے تو خود بخود ان کی شدھی ہو جائے گی اور وہ آہستہ آہستہ غیر اسلامی قومیت میں اس طرح جذب ہو جائیں گے جیسے نمک کی ڈلی پانی میں گھل گھل کر آخر کار غائب ہو جاتی ہے۔ رہے متوسط طبقہ کے مٹھی بھر مسلمان جو اسلام کے خلاف کسی سماجی اور معاشی نظام کو قبول کرنے سے انکار کریں گے تو ان کے حق میں پنڈت جواہر لال نے پہلے ہی فیصلہ کر دیا ہے کہ "جو سیاسی یا تمدنی ادارے اس تبدیلی کی راہ میں حائل ہوں، انہیں مٹا دینا چاہیے" اور یہ کہ "اکثریت نظامِ تمدن کو بدلنے کی خواہشمند ہو تو ضروری نہیں کہ اقلیت کو اس پر راضی کرنے کی کوشش کی جائے بلکہ اس پر موثر دباؤ ڈالنا چاہیے اور

جبر و تشدد سے کام لینا چاہئے"؛ اور یہ کہ "جمہوری حکومت کے معنی ہی یہ ہیں کہ اکثریت، اقلیت کو ڈرا کر اور دھمکا کر اپنے قابو میں رکھے"۔

یہ ہے وہ راستہ جو آزادی حاصل کرنے کے لئے قوم پرستوں نے تجویز کیا ہے اور جس پر وہ عملاً چل رہے ہیں۔ ان کے نزدیک آزادی حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ ملک کی پوری آبادی کو ایک قوم نہ بنا دیا جائے اور ملک کی پوری آبادی کو ایک قوم نہیں بنایا جا سکتا جب تک کہ مسلمان قوم کا وجود کلیتہً ہندوستانی قومیت میں تحلیل نہ ہو جائے۔ لامحالہ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ حصول آزادی کے اس طریقہ کو اختیار کرنے سے مسلمان قوم پہلے ختم ہو گی اور آزادی اس کے بعد حاصل ہو گی۔ اب میں علمائے دین اور مفتیان امت سے اور ہر اس مسلمان سے جو اسلام اور قوم پرستی کا بیک وقت دم بھرتا ہے، دریافت کرتا ہوں کہ کیا اسلام اور یہ قوم پرستی صریحاً ایک دوسرے کی ضد نہیں ہیں؟ اور کیا اس طریقہ سے آزادی حاصل کرنا، قرآن، حدیث، عقل غرض کسی چیز کی رو سے بھی مسلمانوں کا فرض ہے؟ بلکہ فرض کیا معنی میں پوچھتا ہوں کہ آزادی کے لئے قومی خودکشی کا یہ طریقہ اختیار کرنا کسی مسلمان کے لئے جائز بھی ہے؟ اور کیا اس طریقہ سے آزادی کی جنگ لڑنے والوں کے ساتھ موالات کرنا صریح تعلیمات قرآنی کے خلاف نہیں ہے؟

میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں کہ یہ تحریک قطعی طور پر "شدھی" کی تحریک ہے۔ اس میں اور شردھانند والی شدھی میں حقیقت اور نتیجہ کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ مسلمان جب اسلام سے منحرف اور جماعت اسلامی سے خارج ہو گیا تو خواہ وہ ہندو مت میں جائے یا بے مت ہو جائے، دونوں صورتیں یکساں ہیں۔ البتہ دونوں شدھیوں میں فرق صرف یہ ہے کہ ایک کھلی ہوئی شدھی تھی، اور دوسری دام ہمرنگ زمین کا حکم رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ کوئی مسلمان تعاون کا نام بھی نہ لے سکتا تھا، اور اس کی ترویج میں فقیہ اور محدث اور مفسر تک گرم عمل نظر آ رہے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ تحریک اپنی پیش رو تحریک سے ہزار درجہ

زیادہ خطرناک ہے۔

پھر جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، اس طریقہ سے جو آزادی حاصل ہوگی وہ ان آٹھ کروڑ یا سات کروڑ شخصوں کے لئے تو آزادی ہوسکتی ہے جو مسلمانوں کی نسل سے پیدا ہوئے ہیں ............ مگر اس قوم کے لئے آزادی نہیں ہوسکتی جو "مسلمان" ہے۔ مسلمانوں کے لئے مسلمان ہونے کی حیثیت سے وہ آزادی نہ ہوگی۔ بلکہ ان کی قومیت، ان کی تہذیب اور ان کے نظام اجتماعی کی کامل بربادی اور اس کام کی تکمیل ہوگی جس کو انگریزی امپیریلزم نے ڈیڑھ سو برس پہلے شروع کیا تھا۔ حقیقت میں یہ ایک ایسا حربہ ہے جو انگریزی سلطنت سے پہلے اسلام پر حملہ کرتا ہے اور اس سے پہلے اس کو ختم کر دینا چاہتا ہے۔ میں تصور نہیں کرسکتا کہ کوئی صاحب عقل مسلمان جو مسلمان رہنا چاہتا ہو اس حربے کو خود اپنے دین اور اپنی قوم پر چلانے میں کس طرح حصہ لے سکتا ہے۔

طرفہ ماجرا یہ ہے کہ وہی جواہر لال اور وہی ان کے قوم پرست ساتھی جنہوں نے حصولِ آزادی کے اس طریقہ کو کھلم کھلا اختیار کیا ہے، ہم مسلمانوں کو آزادی کی مخالفت اور سامراج پرستی کا طعنہ بھی دے رہے ہیں۔ کیونکہ ہم اپنی قبر کھودنے میں ان کا ہاتھ بٹانے سے انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ درحقیقت آزادی کے دشمن اور سامراج پرستی کے مجرم وہ خود ہیں۔ انہوں نے خود ہی آزادی حاصل کرنے اور سامراج سے لڑنے کا وہ طریقہ اختیار کیا ہے جس کو ہندوستان کی ۴/۱ آبادی کسی طرح قبول کر ہی نہیں سکتی۔ اس غلط اور احمقانہ طریقہ سے وہ خود ملک کی آزادی کو دور پھینک رہے ہیں اور سامراج کی مدد کر رہے ہیں، اور پھر طعنہ ہم کو دیتے ہیں کہ تم آزادی کی جنگ سے الگ رہ کر برطانوی سامراج کو مدد دے رہے ہو! اگر ان کے پاس عقل ہے تو انہیں سمجھنا چاہیئے کہ کوئی جماعت اپنے جماعتی وجود کو فنا کرنے کے لئے آزادی نہیں چاہا کرتی اور نہیں چاہ سکتی۔ آزادی کی ضرورت قومی زندگی کے لئے ہوتی ہے نہ کہ قومی موت کے لئے۔ لہذا آزادی کی خاطر ہر چیز قربان کی جاسکتی ہے مگر قومی زندگی قربان نہیں کی جاسکتی۔ تم جب کسی قوم کے

سامنے آزادی کا وہ راستہ پیش کرتے ہو جس میں اس کی قومیت کی موت ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تم خود اس کو مجبور کر رہے ہو کہ وہ تمہاری تحریک آزادی سے لڑے۔ اس کا یہ لڑنا عین مقتضائے فطرت ہے۔ خواہ دنیا کی کوئی قوم بھی ہو، ایسی حالت میں بہرحال لڑے گی۔ اور اگر اس لڑنے کا یہ نتیجہ ہو کہ بیرونی اقتدار کو اس سے فائدہ پہنچے تو اس کی کچھ پروا نہ کرے گی۔ اس لئے کہ بیرونی اقتدار کا نقصان بھی زیادہ سے زیادہ وہی ہو سکتا ہے جو اس نام نہاد تحریک آزادی کا ہے یعنی اس کی قومیت کی موت۔ پھر ایک موت اور دوسری موت میں آخر وجہ ترجیح کیا ہے؟

---

# جنگِ آزادی کا مطمحِ نظر

اب ہمیں اپنی دوسری تنقیح کی طرف توجہ کرنی چاہیئے، اور وہ یہ کہ جس آزادی کے لئے یہ قوم پرست حضرات لڑ رہے ہیں اس کی نوعیت کیا ہے، اور کیا مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس نوعیت کی آزادی کسی درجہ میں بھی ہمارے لئے مطلوب یا مفید ہو سکتی ہے؟ اس تنقیح کو ہم دو حصوں میں تقسیم کریں گے ایک یہ کہ اس جنگ آزادی کا مطمح نظر کیا ہے؟ یعنی موجودہ حکومت کو ہٹا کر یہ کس قسم کی حکومت کن اصولوں پر قائم کرنا چاہتی ہے۔ دوسرے یہ کہ خود اس جنگ آزادی کی نوعیت کیا ہے؟ یعنی یہ انقلابی ذرائع سے کامل انقلاب چاہتی ہے یا نیم انقلابی نیم دستوری ذرائع سے بتدریج ایک نظام حکومت کو گرانا اور دوسرا نظام حکومت تعمیر کرنا چاہتی ہے۔ پہلے حصہ کو ہم مقدم رکھیں گے اور دوسرے حصہ سے اخیر میں بحث کریں گے۔

جو لوگ اس وقت آزادیٔ وطن کے علمبردار بنے ہوئے ہیں۔ ان کے مطمح نظر کو سمجھنے کے لئے تمہید کے طور پر ایک مختصر تاریخی بیان ضروری ہے تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ ان کے تخیلات کا اصلی ماخذ اور ان کے جذبات حریت طلبی کا اصلی محرک کیا ہے۔

یہ ہر شخص جانتا ہے کہ ہندوستان کی موجودہ وطنی تحریک براہ راست انگریزی تعلیم سے پیدا ہوئی ہے۔ مخالف اور موافق دونوں اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ انگریزی حکومت کی قائم کی ہوئی یونیورسٹیوں میں ہندوستانیوں نے تعلیم حاصل کی۔ وہاں یہ تاریخ، سیاسیات، اور معاشیات سے روشناس ہوئے۔ انگریزی زبان کے توسط سے مغربی افکار ان تک پہنچے۔ اور ان میں آہستہ آہستہ وہ سیاسی شعور پیدا ہوا جو حکومت خود اختیاری کی خواہش کا مورث

ہوا کرتا ہے۔ تقریباً ۵۰ سال تک ان جدید اثرات کے تحت پرورش پانے کے بعد جب ان کے اندر سیاسی اختیارات حاصل کرنے کا جذبہ ابھرنے لگا۔ تو خود ان کے انگریز مربیوں ہی نے اس جذبہ کے لئے مخرج کا راستہ پیدا کیا۔ پہلا شخص جس کے دماغ میں "انڈین نیشنل کانگریس" قائم کرنے کا خیال آیا وہ ایک انگریز مسٹر ہیوم (Hume) تھا۔ ابتداءً اس کے پیش نظر محض ایک ایسی انجمن بنانے کا تصور تھا جس میں ہندوستان کے سیاسی دماغ مجتمع ہو کر تبادلۂ خیالات کیا کریں اور اس طرح حکمرانوں کو اپنے محکوموں کے داعیات سے واقف ہونے کا موقع ملتا رہے۔ اس غرض کے لئے اس کی تجویز تھی کہ جس صوبہ میں اس انجمن کا اجتماع ہو وہیں کا گورنر اس کی صدارت کرے۔ مگر لارڈ ڈفرن نے، جو اس وقت ہندوستان کا وائسرائے تھا اس کے خیالات کو بدل کر ایک دوسری راہ پر ڈال دیا۔ اس نے یہ رائے دی کہ:-

"ہندوستان میں ایک ایسی جماعت ہونی چاہئے جس کی حیثیت یہاں وہی ہو جو انگلستان میں حزب الاختلاف (Opposition) کی ہے تاکہ وہ حکومت پر نکتہ چینی کر کے اس کے نقائص کو دور کرتی رہے۔ نیز اس جماعت کو مستقل بالذات ہونا چاہئے۔ گورنر کی صدارت اس کی آزادی رائے میں خلل انداز ہوگی"

انگلستان میں لارڈ رپن، لارڈ ڈلہوزی، سر جیمز کیرڈ (Caird) جان برائٹ، مسٹر ریڈ، مسٹر سلیگ (Slagg) اور دوسرے سیاسی مبصرین نے بھی لارڈ ڈفرن کی اس رائے کو پسند کیا، اور اس طرح ۱۸۸۵ء میں کانگریس کی تاسیس ہوئی۔

سیاسی عمل کی یہ ابتدا جس طرح انگریزی افکار اور انگریزی تدبر کی رہنمائی میں ہوئی اسی طرح مقاصد اور ان کے حصول کی صورت کا تعین بھی آپ سے آپ انگریزی اثرات کے تحت اور انگریزی دستور حکومت کے نمونے پر ہوتا رہا۔ کانگریس کو اول یوم پیدائش ہی میں "انڈین نیشنل کانگریس" کے نام سے موسوم کیا گیا، گویا کہ "انڈین نیشن" کے نام سے کوئی قوم موجود

---

لے ڈاکٹر پتابھی سیتارامیا کی تاریخ کانگریس (انگریزی) صفحہ ۲۳-۲۴-

تھی اور یہ اس کی ایک اجتماعی ہیئت (کانگریس) بنائی جا رہی تھی۔ انگریزی تعلیم کے جو اثرات ان لوگوں کے دماغ پر پڑے تھے، ان کا اثر اتنا گہرا تھا کہ انہوں نے ایک ملک کی آبادی کا ایک قوم ہونا، بطور ایک بدیہی کلیہ کے تسلیم کر لیا تھا، اور اس کے لئے وہ واقعات کی شہادت کو بھی غیر ضروری سمجھتے تھے۔ کانگریس کے پہلے اجلاس میں جو مقاصد اس جمعیت کے لئے تجویز ہوئے تھے۔ ان میں سے دوسرا مقصد یہ تھا:۔

"قومی وحدت کے ان داعیات کا نشوو ارتقاء اور استحکام جو ہمارے محبوب لارڈ رپن کے ہمیشہ یادگار رہنے والے عہد حکومت میں پیدا ہوئے ہیں[1]"۔

دوسرے اجلاس کے خطبۂ صدارت میں ہم کو یہ الفاظ ملتے ہیں:۔

"ایک قومی کانگریس کو ان امور تک اپنے تئیں محدود رکھنا چاہئے جن میں پوری قوم براہ راست حصہ دار ہو اور اصلاح معاشرت اور دوسرے طبقہ وار مسائل کو طبقات کی کانگرسوں کے لئے چھوڑ دینا چاہئے[2]"۔

یہ وطنی قومیت اور واحد قومیت کا تخیل اس تحریک کے مایۂ خمیر کا پہلا عنصر ہے۔ جس طرح ۱۸۸۵ء میں بنرجی اور نوروجی "ہندوستانی قوم" کا ذکر کرتے تھے، اسی طرح آج گاندھی جی اور نہرو جی بھی کرتے ہیں، بلکہ وہ محض ذکر کرتے تھے اور یہ اس کو زبردستی مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ گاندھی جی استفہام انکاری کے لہجہ میں پوچھتے ہیں کہ "ہندوستان ایک ملک اور ایک قوم ہے یا بہت سے ملک اور بہت سی قومیں[3]؟" اور خود ہی اس کا جواب دیتے ہیں کہ جو لوگ اس کو ایک ملک اور ایک قوم سمجھتے ہیں انہیں اس پر اعتراض نہ ہونا چاہئے اگر مدراس کا وزیر اعظم ایک

---

[1] ڈاکٹر پٹابھی سیتارامیہ کی تاریخ کانگریس (انگریزی) صفحہ ۲۷

[2] How India Wrought for Freedom. By Annie Besant: P. 18.

[3] "Congressman Beware", by Gandhi, in *The Harijan*.

قوم کے لئے ایک زبان بنانے میں کرمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ کی جابرانہ طاقت استعمال کرنے
نہرو جی استفہام کی بھی ضرورت نہیں سمجھتے اور قطعی طور پر اعلان کرتے ہیں کہ ہندوستان میں
صرف ایک قوم بستی ہے۔ جس کا نام ہندوستانی ہے۔ جدا جدا مستقل قوموں کا یہاں وجود
ہی نہیں ہے۔

دوسرا بنیادی تصور جو انگریزی تعلیم اور انگریزی مربیوں کی سیاسی تربیت سے اخذ کیا گیا وہ
جمہوریت ( Democracy ) کا تصور تھا۔ جمہوری ادارت کی مختلف صورتیں جو دنیا میں
رائج ہیں اور رائج رہی ہیں، ان میں شاید سب سے زیادہ ناقص اور قدامت پرستانہ صورت وہ ہے
جو انگلستان میں قائم ہے۔ لیکن ہمارا ہندوستانی وطن پرست چونکہ انگریز کا شاگرد ہے، اسی سے
جمہوریت کا نام اس نے سنا ہے، اور اسی کے جمہوری نظام کا نقشہ اس نے دیکھا ہے۔ اس لئے
یہ جب "جمہوریت" کا لفظ بولتا ہے تو اس کے سامنے جمہوری دستور کے وہی اصول اور وہی
طریقے ہوتے ہیں جو انگلستان میں رائج ہیں۔ نمائندگی، انتخاب، ذمہ دار حکومت، اور دستور سلطنت
کی ساری تفصیلات کو یہ جوں کا توں انگلستان سے ہندوستان اٹھا لانا چاہتا ہے۔ یہ اس حقیقت
کو نہیں جانتا کہ قوموں اور ملکوں کے حالات مختلف ہوتے ہیں۔ جس قسم کے ادارات ایک ملک کے
مناسب حال ہوں، لازم نہیں کہ وہ دوسرے ملک کے قامت پر بھی راست آسکیں۔ قوت
تمیز اور اجتہاد و فکر کے بغیر محض دوسروں کی نقالی کرنا اصولاً بھی غلط ہے اور عملاً بھی مشکل بلکہ
مضرت رساں۔ مگر مختلف اسباب ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو اس حقیقت کے بار بار سامنے لائے
جانے پر بھی ہمارے وطن پرستوں کو اس کے ادراک سے روکتے ہیں۔ ایک گروہ غلامانہ ذہنیت
اور محدود وانفیت کی بنا پر یہ سمجھتا ہے کہ "جمہوری ادارات" کا اطلاق صرف انگریزی طرز کے ادارات
پر ہی ہوتا ہے اور ہو سکتا ہے۔ لہذا اس طرز کی مخالفت کرنا نفس جمہوری ادارات کی مخالفت
کرنا ہے۔ دوسرا گروہ انگریزی نمونہ کی جمہوریت کو غلط سمجھتا ہے۔ مگر اس پر شکست خوردہ ذہنیت
کا غلبہ ہے اور وہ سمجھتا ہے۔ کہ جمہوری نظام جو ہمارے برطانوی آقا اپنے ملک سے لائے ہیں

اور جس کی پشت پر مشین گن کی طاقت ہے۔ ہندوستان میں رائج ہوتا ہے اور ہو کر رہے گا، لہذا عافیت اسی میں ہے۔ کہ اس کے آگے سپر رکھدو۔ تیسرا گروہ جو کانگریس کا اصلی کارفرما اور کارکن گروہ ہے، غلامانہ ذہنیت کے ساتھ خود غرضانہ ذہنیت سے بھی ماؤف ہے۔ انگریزی طرز جمہوریت کو قبول کرنے میں سراسر اسی کا فائدہ ہے، کیونکہ یہ طرز جمہوریت اکثریت کو مالک الملک لاشریک لہ بنا دیتا ہے۔ اور اتفاق سے یہی گروہ یہاں اکثریت میں ہے۔ لہذا یہ کہتا ہے کہ ہندوستان میں واحد قومیت کی بنیاد پر ایک "ڈیماکریٹک اسٹیٹ" قائم ہونا چاہئیے ۱۸۸۵ء سے ۱۹۳۸ء تک ۵۳ سال کی مدت میں کانگریس کے مطالبات کی صورتیں بہت کچھ بدلی ہیں۔ پہلے سرکار سے مطالبہ کیا جاتا تھا کہ ہمارے لئے ایک ایسا دستور حکومت بنا دو جس میں گورنمنٹ اہل ملک کے سامنے جواب دہ ہو اب یہ مطالبہ ہے کہ ہم خود اپنا دستور بنائیں گے۔ بظاہر پہلے موقف سے دوسرا موقف بہت آگے بڑھا ہوا ہے، مگر اصولی حیثیت سے "ڈیماکریسی" کا جو تصور ۱۸۸۵ء میں تھا، بعینہ آج بھی وہی ہے، خواہ دستور حکومت سرکار بنائے یا خود بنائیں۔

وطن پرستی کی اس تحریک میں انگریزی آقاؤں کا اثر محض علمی و نظری حیثیت ہی سے نہیں ہے بلکہ تقریباً ۸۰ سال سے جو سیاسی تربیت ہندوستانیوں کو ان کے یہ آقا دے رہے ہیں وہ عملاً بھی انہی اصولوں پر مبنی ہے۔ ۱۸۶۱ء سے ۱۹۳۵ء تک جتنے دستوری تغیرات اس ملک میں ہوئے ہیں، اور نظم و نسق حکومت میں ہندوستانیوں کو شریک کرنے کی جتنی صورتیں اختیار کی گئی ہیں ان سب میں انگریز کی اس فطری کمزوری کا اثر نمایاں نظر آتا ہے کہ وہ اپنے ملک کے جمہوری ادارات کو ہم تبدیل سمجھتا ہے۔ اور اس میں اتنی اجتہادی صلاحیت نہیں ہے۔ کہ مختلف حالات کے لئے مختلف اصول وضع کر سکے۔ اگرچہ ابتدا سے آج تک ہر زمانہ میں انگریز مدبرین نے اس بات کو اصولاً تسلیم کیا ہے کہ ہندوستان انگلستان نہیں ہے اور یہاں آنکھیں بند کر کے انگریزی طرز کے جمہوری ادارات قائم کرنا درست نہیں، مگر وہ سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے باوجود اپنی فطرت سے مجبور ہیں کہ ان کے ذہن میں بہر پھر کر جمہوریت

کے وہی تصورات اور وہی رنگ ڈھنگ آجاتے ہیں جن کے ماحول میں خود انہوں نے پرورش پائی ہے۔ وہ غیر شعوری طور پر اہل ہند کو ایک قوم فرض کر لیتے ہیں جس طرح اہل انگلستان ایک قوم ہیں۔ وہ جائز سمجھتے ہیں کہ یہاں ڈیموکریسی کے وہی اصول اختیار کیئے جائیں جو واحد قومیت ہی کے لئے موزوں ہو سکتے ہیں۔ حالات کی رعایت زیادہ سے زیادہ ان کو جس چیز کے لئے آمادہ کر سکتی ہے وہ بس جداگانہ انتخاب ہے یعنی یہ کہ ہندوستان کی مختلف قوموں کو — جنہیں وہ ایک قوم کے مختلف فرقے سمجھتے ہیں — اپنے ہی منتخب کردہ نمائندہ کے ذریعہ سے اپنی خواہشات کے اظہار کا موقع مل جائے مگر کوئی شخص کسی دلیل سے بھی یہ بات ان کے دماغ میں نہیں بٹھا سکتا کہ جداگانہ انتخاب اس وقت بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے جب ان مختلف قوموں کے مجموعہ کو ایک قرار دیکر اکثریت کی حکومت کا جمہوری قاعدہ نافذ کر دیا جائے۔ انہوں نے میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں سے لے کر صوبوں اور مرکز کی قانون ساز مجلس تک جتنے جمہوری ادارے اس ملک میں قائم کیئے ان سب میں کثرت رائے کے غلبہ کا اصول یکساں طور پر رائج کر دیا۔ اور اس کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوا کہ ہندوستان میں جو قوم کثیر التعداد واقع ہوئی ہے وہ زیادہ سے زیادہ سیاسی طاقت کی مالک ہوتی چلی گئی، بلکہ اس سے بھی بڑھکر اس کا بدترین نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ کثیر التعداد قوم اس سیاسی غلبہ کو اپنا فطری اور اخلاقی حق سمجھنے لگی اور قلیل التعداد قومیں اس فریب میں مبتلا ہو گئیں کہ جمہوریت کا مفہوم غلبہ اکثریت کے سوا اور کچھ نہیں، ان کو خود بھی اپنی مغلوبیت پر راضی ہونا چاہیئے، کیونکہ انگلستان سے جو چیز آئے اس کے عین حق ہونے میں تو کلام ہی نہیں ہو سکتا۔

جس ملک میں ذہنی غلامی اس حد تک پہنچ چکی ہو کہ کسی چیز کے بجا و درست ہونے کے لئے محض صاحب بہادر کے قول و فعل کی سند کافی سمجھی جائے، حتیٰ کہ کسی ریلوے اسٹیشن پر صاحب بہادر جاڑے میں برف ڈال کر پیتے ہوئے دیکھے جائیں تو غلام ہندوستانی گھر پہنچ کر برف زدہ چائے پینے لگے، وہاں یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ صاحب نے جمہوریت کا جو مفہوم بنایا ہے اس کے درست ہونے میں شک کیا جائے گا۔ یہاں آزادی کے مدعی ایک سے ایک بڑھکر موجود ہیں، مگر

دماغوں کی غلامی ان سب کا مشترک سرمایہ ہے۔ جو لوگ یہاں آزاد خیالوں کے سرتاج سمجھے جاتے ہیں ان کی غلام فطرتی بھی یہاں تک بڑھی ہوئی ہے۔ کہ جبتک ایک وزیر ہند (لارڈ آلیویر) نے جداگانہ انتخاب کو جمہوریت و قومیت کے منافی نہ قرار دیا تھا اس وقت تک یہ غریب اس حقیقت سے بالکل ناواقف تھے کہ واقعی یہ چیز اس درجہ منافی قومیت و جمہوریت ہے۔ اور جب یہ بات صاحب کی زبان سے سن لی گئی تو ڈاکٹر مونجے سے لیکر پنڈت جواہر لال نہرو تک ہر ایک اس زعم کے ساتھ اس کا اعلان کرنے لگا کہ جس قول کو سرکار والاتبار کی سند حاصل ہے اس کے برحق ہونے میں کس کو کلام کی جرأت ہو سکتی ہے۔ پھر جو صاحب یہاں آزاد خیالوں کے امام ہیں ان کا حال بھی یہ ہے کہ سرکار کے قائم کئے ہوئے جمہوری ادارات کو جمہوریت کی ایک ہی فطری و برحق صورت سمجھتے ہیں اور ان ادارات کے اصول سے اختلاف کرنا ان کے نزدیک سیاسی اصلاح و ترقی کی مخالفت کرنا ہے، کیونکہ سیاسی اصلاح و ترقی کی صراط مستقیم ایک ہی ہے جس کی طرف غلاموں کے ہادی برحق —— صاحب بہادر —— نے ان کی رہنمائی کی ہے۔ اور وہ بس یہ ہے کہ مختلف قوموں کو ایک مجموعہ قرار دے کر اس میں غلبۂ اکثریت کا جمہوری اصول نافذ کر دیا جائے۔ صاحب کے دیئے ہوئے اس علم پر غلام دماغوں کا یقین و اذعان اور انشراح و اطمینان اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ وہ ریاضی کے اصول موضوعہ کی طرح اسے بیان کرتے ہیں اور اپنی ذہنی غلامی کے راز کو چھپانے کی بھی کوشش نہیں کرتے اس لئے کہ انہیں اپنی ذہنی غلامی کا احساس تک نہیں رہا۔

قومیت اور جمہوریت کے ساتھ ایک تیسرا اساسی تخیل بھی ہے جو انہوں نے صاحب کی تعلیم و تربیت سے حاصل کیا ہے اور وہ یہ کہ اسٹیٹ کو دنیوی (Secular) (یعنی غیر دینی) ہونا چاہیئے۔

غیر دینی کا ایک سادہ مفہوم یہ ہے کہ اسٹیٹ کا اپنا کوئی مذہب نہ ہو، وہ بجائے خود دنیوی ہو، اس کی اساس کسی مخصوص شریعت پر نہ ہو، وہ کسی خاص مذہب کی نصرت و حمایت

نہ کرے، مگر اس کے ساتھ ہی وہ مخالف دین (Anti-religious) بھی نہ ہو بلکہ اپنے دائرے میں مذہبی نظامات کو تسلیم (Recognise) کرے اور ان کو حکومت کے اختیارات میں سے کم از کم اتنے اختیارات تفویض کر دے جو اندرونی تنظیم کے لئے ضروری ہیں، مثلاً اپنے پیرووں پر ٹیکس عائد کرنا، مذہبی قوانین کو ان پر نافذ کرنا اور ان کی دینی تعلیم کا انتظام کرنا، عام اس سے کہ وہ علیحدہ مدارس کی شکل میں ہو یا مشترک تعلیمی نظام کے ماتحت ہو۔ نازی دور سے پہلے تک جرمنی میں غیر دینی اسٹیٹ کا یہی مفہوم تھا اور اب بھی یوگوسلیویا، پولینڈ، لتھوانیا، فن لینڈ اور ایسٹھونیا میں یہی مفہوم ہے۔ غیر دینی اسٹیٹ کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ وہ دین کی نفی (Negation) پر قائم ہو، مخالف دین ہو، اس میں کسی دینی نظام کو تسلیم نہ کیا جائے۔ باشندوں کی اس حیثیت کو کہ وہ کسی خاص دین کے پیرو ہیں بالکل نظر انداز کر دیا جائے اور عمومی حاکمیت (Popular Sovereignty) کی تعبیر یہ کی جائے کہ باشندگان ملک ہونے کی حیثیت سے تو سب باشندے حاکمیت میں حصہ دار ہیں، مگر ایک مذہب کے پیرو ہونے کی حیثیت سے اس حاکمیت میں ان کا کوئی حصہ نہیں۔ لہٰذا وہ خود اپنی حکومت سے بھی اپنے دینی نظام کی ترقی و استحکام کے لئے کوئی طاقت حاصل نہیں کر سکتے۔ لادینی کے اس مفہوم نے یورپ میں دو مختلف صورتیں اختیار کی ہیں۔ ایک ظالمانہ (Aggressive) جس میں حکومت کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ مذہبی لوگوں کو لامذہب بنایا جائے۔ اس کی مثال روس ہے۔ دوسری صورت معتدل ہے جس میں حکومت کی پالیسی یہ ہوتی ہے کہ مذہبی نظامات کو زندگی کی طاقت پیدا کرنے والے تمام وسائل سے محروم کر دیا جائے تاکہ وہ خود سوکھ سوکھ کر مر جائیں۔ اس کی مثال چیکوسلواکیا ہے، جہاں تعلیم کا نظام کلیتہً حکومت کے ہاتھ میں ہے اور اس سے دینی عنصر کو قطعاً خارج کر دیا گیا ہے اور حکومت سرکاری طور پر کسی قوم کے دینی نظام کو تسلیم نہیں کرتی۔

ہندوستان میں ہمارے آقاؤں نے جو طریق کار اختیار کیا ہے وہ ایک عجیب قسم کی معجون مرکب ہے۔ بادشاہ سلامت حامی دین (Defender of the Faith) ابھی ہیں، اسٹیٹ

کی طرف سے ایک مذہبی محکمہ ( Ecclesiastical Department ) بھی قائم ہے۔
اس کے ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سلطنت کا کوئی مذہب نہیں ہے اور اس کا مذہب نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ مذہبی رواداری کے اصول پر قائم ہے (یعنی لادینی کا پہلا مفہوم) مگر عملاً باشندگان ملک کے مذہب سے وہ برتاؤ کیا جاتا ہے جو چیکوسلواکیا کی روش سے ملتا جلتا ہے۔ اس عجیب مکسچر کی تحلیل اگر سائنٹیفک طریقہ سے کی جائے۔ تو اس کے تین اجزاء برآمد ہونگے۔

۱- مذہبی رواداری کا اعلان و اظہار،

۲- ایک خاص عقیدہ و مسلک کی طرف نظر عنایت،

۳- دوسرے تمام عقائد و مسلک کے ساتھ سنگدلانہ سرد مہری۔

ہندوستان میں "دنیوی" اسٹیٹ کا یہ مرکب تصور فکر و عمل دونوں حیثیتوں میں ڈیڑھ سو برس سے پرورش پا رہا ہے اور ہمارے وطن پرستوں نے بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی تصور کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ ان کا ادعا یہ ہے کہ ہماری تحریک غیر دینی ہے اور ہم ایسا دنیوی اسٹیٹ بنانا چاہتے ہیں جس کی بنا کسی مذہب پر نہ ہوگی مگر اس میں مذہبی رواداری ہوگی۔ یہ آقایان نامدار کے بنائے ہوئے مکسچر کا پہلا جز ہے۔ اور دوسرا جز یہ ہے۔ کہ ان کا لیڈر[1] ایک مہاتما ہے، جو صداقت ( Truth ) اور اہمسا ( Non-Violence ) کے خالص ہندوانہ تصورات کا علمبردار اور مبلغ بن کر اٹھا ہے۔ جس کے تصورات، جنگ آزادی کی فکری بنیاد ہیں، جو صاف کہتا ہے کہ عدم تشدد پالیسی نہیں بلکہ دین و ایمان ہے۔ اس کی رہنمائی میں تمام باشندگان ہند کے لئے سرکاری طور پر عمومی تعلیم کے خاکے بنائے جاتے ہیں اور ان سب میں اس کے دین و ایمان کو اساسی حیثیت دی جاتی ہے[2]۔ اب رہ گیا تیسرا جز تو اس کی بھی پوری مقدار اس معجون میں شریک

[1] پنڈت جواہر لال کے بقول "کانگریس سے عظیم تر ( Bigger than Congress itself )۔"

[2] واردھا اسکیم و ودیا مندر اسکیم اور اصلاح دیہات کی اسکیم جسے ڈاکٹر سید محمود نے بہار میں جاری کیا ہے تینوں میں اہمسا کی تعلیم کو اساس کی حیثیت دی گئی ہے۔

کی گئی ہے۔ صاف صاف کہا جا چکا ہے کہ باشندوں کی مذہبی تعلیم کا انتظام کرنا اسٹیٹ کے فرائض سے خارج ہے، اور اس کے برعکس یہ چیز اسٹیٹ کے فرائض میں داخل ہے کہ باشندوں کو جبراً ایسی تعلیم دے جو ان کے ذہن سے اپنے مذہب کی برتری کا خیال نکال دے۔ خود مہاتما گاندھی جنھوں نے اپنے مذہب کو باصرار وردھا اسکیم کا جزء لاینفک بنوایا ہے، اپنے مذہب کے سوا دوسرے تمام مذاہب کو نظام تعلیم سے خارج کر دینے کے لئے یہ دلیل ارشاد فرماتے ہیں:۔

"تمام مذاہب کا یکساں لحاظ رکھنے کی تعلیم دینا ایک ایسی ضرورت ہے جس کے حق میں میرے خیالات بہت سخت ہیں۔ جب تک ہم اس خوشگوار حالت (یعنی سب مذاہب کو ایک نظر سے دیکھنے اور سب کو مساوی طور پر برحق سمجھنے کی حالت) کو نہ پہنچ جائیں گے، اس وقت تک مختلف فرقوں میں حقیقی وحدت پیدا ہونے کی مجھے کوئی توقع نظر نہیں آتی۔ میرے نزدیک یہ بات مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے بچوں کے درمیان دوستانہ اسپرٹ کے نشوونما کو غارت کرنے والی ہوگی اگر ان کو یہ سکھایا جائے کہ ان کا مذہب دوسرے مذاہب سے بہتر ہے یا یہ کہ وہی ایک سچا مذہب ہے۔ اگر قوم (یا ہندوستانی قوم) پر یہی اختصاصی جذبہ مستولی رہے تو اس سے لازم آئے گا کہ یا تو ہر مذہب والوں کے الگ الگ مدرسے ہوں جن میں ہر ایک کو دوسرے پر طعن کرنے کی آزادی حاصل رہے، یا پھر مذہب کا نام لینے ہی کو کلیتہً ممنوع قرار دے دیا جائے۔ اس قسم کا طرز عمل اختیار کرنے کے نتائج اتنے خوفناک ہیں کہ ان کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاق کے بنیادی اصول تمام مذاہب میں مشترک ہیں۔ وہ ضرور بچوں کو سکھائے جانے چاہئیں، اور جہاں تک وار دھا اسکیم کے ماتحت مدارس کا تعلق ہے ان میں بس اتنی ہی مذہبی تعلیم کو کافی سمجھنا چاہیے۔"[1]

اسی خیال کی ترجمانی ایک دوسرے ذمہ دار شخص مسٹر سمپورنانند دیو پی کے وزیر تعلیم نے اپنی ایک تقریر میں کی ہے۔ جو انھوں نے ۴ر اپریل ۳۸ء کو یو۔پی کی لیجسلیٹو اسمبلی میں ارشاد فرمائی تھی

[1] "ہریجن" مورخہ ۱۶ر جولائی ۳۸ء

"ہر وہ شخص جو ہندو یا مسلم تہذیب کے قائم رکھنے اور اس کو مدارس میں جاری کرنے پر زور دیتا ہے۔ وہ یقینی طور پر ملک کو نقصان پہنچاتا ہے۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ موجودہ ہندوستان میں یہ چیز مفقود ہونی چاہئے۔ ہم ایک ہندوستانی تہذیب چاہتے ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں اور دوسروں کے لئے جو اس ملک میں آئے ہیں اور جنہوں نے اس کو اپنا گھر بنالیا ہے بالکل ایک ہے۔ اگر کوئی شخص واقعی ملک کی ترقی میں کوشاں رہے تو اس کو ایسی بات پر زور دینا چاہئے جس سے ہم میں تفرقے پیدا نہ ہوں جو سب کے لئے ضرر رساں ہیں۔ بلکہ ایسے امور ہوں جن سے ہندوستانی تہذیب کی تعمیر و ترکیب ہوتی ہو۔ تمام وہ باتیں جن سے ہم میں تفرقہ اور کشیدگی پیدا ہوتی ہے یقیناً ملک کے ساتھ دشمنی کرتی ہیں۔ اس لئے ملک کا عام مفاد مدنظر رکھتے ہوئے مجھے امید ہے کہ وہ لوگ جو لڑکوں اور لڑکیوں کے مدارس میں ہندو اور مسلم تہذیب قائم رکھنا چاہتے ہیں، اس بات پر زور نہ دینگے[1]"

اسی تقریر کا ایک فقرہ یہی ہے:۔

"جب ہندو مسلم تہذیبیں مٹ جائیں گی تب ہی ہندوستانی تہذیب زندہ رہ سکے گی[2]"

ان تقریروں اور تحریروں سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ ہندوستانی وطن پرست جو اسٹیٹ بنانا چاہتے ہیں وہ ایک معنی میں دینی اسٹیٹ ہے اگر دین سے مراد مہاتما گاندھی کا دین لیا جائے اور ایک معنی میں لادینی بلکہ مخالف دین (Anti-religious) اسٹیٹ ہے اگر دین سے مراد ہندوستان کے ان باشندوں کا دین لیا جائے جو دین گاندھی کے پیرو نہیں ہیں۔ ان کے حق میں اس اسٹیٹ کا رویہ غیر جانبدارانہ رواداری نہ ہوگا بلکہ چیکو سلواکیا کی طرح غیر ہمدردانہ اور ایک حد تک مخالفانہ ہوگا۔ اس کا مطمع نظر صریحاً یہ بتایا جارہا ہے کہ مختلف قوموں کی تہذیبیں کسی نہ کسی طرح فنا ہو جائیں، ان کا مذہبی زاویہ نظر بدل جائے، اور وہ تمام مذاہب کو برابر سمجھنے لگیں، یعنی کسی مذہب کے پیرو نہ رہیں، کیونکہ ایک مذہب کی پیروی کے لئے اس کو سب سے بہتر اور صحیح تر جاننا فطری طور پر ناگزیر ہے۔ اس کے بعد یہ خیال

[1] مدینہ، مورخہ ۱۷ اپریل ۳۸ء [2] ٹریبیون مورخہ ۱۵ اپریل ۳۸ء

کرنے کا کوئی موقع ہی نہیں رہتا کہ ایسا اسٹیٹ کسی مذہبی نظام کو قانوناً تسلیم کرے گا اور اس کو تعلیم اور اندرونی تنظیم کے لئے وہ حقوق اور اختیارات دیگا جن کی مثالیں ہم نے اوپر یورپ کے متعدد ممالک سے پیش کی ہیں۔

ان تشریحات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے وطن پرست ہندوستان کے لئے جس قسم کی آزاد حکومت حاصل کرنا چاہتے ہیں اس کی بنیادی خصوصیات تین ہیں،۔

ا۔ نیشنل اسٹیٹ" اس معنی میں کہ باشندگان ہندوستان کی پوری آبادی کو ایک قوم قرار دیا جائے اور جداگانہ قومیتوں کی نفی کر دی جائے۔

۲۔ "جمہوری اسٹیٹ" اس معنی میں کہ باشندگانِ ہند کو ایک مجموعہ قرار دیکر اس میں غلبۂ اکثریت کا اصول نافذ کیا جائے۔

۳۔ "دنیوی اسٹیٹ" اس معنی میں کہ جہاں تک ہندوستان کی مختلف قوموں کے مذہب کا تعلق ہے ان کے لحاظ سے وہ ایک لادینی اسٹیٹ ہو[1]۔

اب ہم کو دیکھنا چاہئے۔ کہ اس نوعیت کا اسٹیٹ دراصل کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم اس کو اپنا مطمح نظر بنا سکتے ہیں؟ کیا ایسے اسٹیٹ میں ہمارے مسلمان ہونے کی حیثیت برقرار بھی رہ سکتی ہے؟ کیا ہمارے لئے یہ جائز ہے کہ ہم اس کو قائم کرنے کی جدوجہد میں حصہ لیں۔ یا صبر و سکون کے ساتھ اس کے قیام کو گوارا کریں؟ آئندہ باب میں ہم ان سوالات پر بحث کریں گے۔

---

[1] ۱۹ اگست ۱۹۳۸ء کو مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی (سنٹرل اسمبلی کی کانگریس پارٹی کے لیڈر) نے شملہ میں ایک تقریر فرمائی تھی۔ جس میں اسٹیٹ کی انہی تین بنیادوں کو پوری تشریح کے ساتھ بیان کیا تھا۔ یہ تقریر یکم ستمبر ۱۹۳۸ء کے ٹریبیون میں شائع ہوئی ہے اور اس کا مطالعہ ہندوستانی وطن پرستوں کے طریق فکر اور نصب العین کو سمجھنے میں بہت کچھ مدد دیتا ہے۔

# قومی، جمہوری، لادینی اسٹیٹ

## کیا مسلمان اس کو قبول کر سکتے ہیں؟

اس بحث کو شروع کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ عام ناظرین کی سہولت کے لئے چند اصطلاحات کی تشریح کر دی جائے۔

لفظ اسٹیٹ جس کا مترادف ہماری زبان میں "ریاست" کا لفظ ہے، علم السیاست کی اصطلاح میں اُس نظام کو کہتے ہیں جو ایک متعین رقبۂ زمین میں رہنے والی آبادی کو قاہرانہ طاقت (Coercive Power) سے ضبط میں رکھتا ہو۔ قوتِ قاہرہ کا وجود ایک طرف، اور اطاعت کا پایا جانا دوسری طرف، ان دو چیزوں کے بہم ہو جانے سے وہ نظمی ہیئت بن جاتی ہے جسے اسٹیٹ یا ریاست کہا جاتا ہے۔

اسٹیٹ کی اس تعریف کو سمجھنے کے بعد قدرتی طور پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ وہ قوتِ قاہرہ جس کی اطاعت ایک آبادی کر رہی ہے خود اس آبادی کے اندر اس کے مجموعہ میں سے ابھرتی ہے یا کہیں باہر سے آتی ہے؟ اگر اس کے اجتماعی وجود سے الگ کوئی طاقت ایسی ہے جو اس پر حاکمانہ اختیار استعمال کرتی ہے تو وہ غلام ہے۔ اور اگر وہ آبادی خود حاکمیت (Sovereignty) کی مالک ہے اور اپنی رضامندی سے ایک نظمی ہیئت کو قوتِ قاہرہ فراہم کر کے دیتی ہے تاکہ وہ اس کے معاملات کی تنظیم کرے تو وہ خود مختار جماعت ہے۔ کسی آبادی کا اس طور پر اپنے اوپر حکمراں ہونا، یا بالفاظ دیگر حاکمیت سے متمتع ہونا، جمہوریت کا اصل الاصول ہے۔ جب ہم کسی اسٹیٹ کو جمہوری اسٹیٹ کہتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ اسٹیٹ

جن باشندوں سے مرکب ہے وہی اس کی حاکمیت کے مالک ہیں۔ گورنمنٹ جو ان کے اسٹیٹ کا انتظام کرتی ہے، ان کی اجتماعی رضامندی کی تابع ہے، اور اس کا منصب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ان کی خواہشات کو وضع قوانین اور تنفیذ قوانین میں روبعمل لائے۔

جمہوری نظام کا عمل اس کے نظریہ سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ نظری حیثیت سے تو اسٹیٹ کے ہر فرد کو حاکمیت حاصل ہے اور وہ اس کے استعمال کا حق رکھتا ہے۔ لیکن عملاً یہ ممکن نہیں ہے کہ ہر ہر شخص کی خواہش کے مطابق قوانین بنیں اور حکومت کی جائے۔ لہٰذا عملی اغراض کے لئے جمہوریت کا قاعدہ یہ قرار دیا گیا کہ حکومت ہمیشہ اکثریت کی خواہشات کے مطابق ہوگی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے مشکلات کا آغاز ہوتا ہے۔ جمہوری حکومت جن خوشنما نظریات سے شروع ہوتی ہے، عمل کی سرحد میں آکر وہ رخصت ہو جاتے ہیں۔ اور ان سب کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ مملکت کے باشندوں کا ایک حصہ دوسرے حصّہ کو حاکمیت سے عملاً محروم کر کے ان پر اپنی خواہشات مسلط کر دے۔ ہر ملک میں مختلف گروہ مختلف قسم کے مفاد، مذاق، خواہشات، اور اغراض رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ان سب کے اشتراک عمل ہی سے تمدّن کی مشین چلتی ہے ان میں سے ہر ایک مملکت کی اجتماعی خوشحالی اور فلاح و بہبود میں کسی نہ کسی حیثیت سے اپنا حصہ ادا کرتا ہے۔ ہر ایک کے لئے اس کی اغراض اور خواہشات اتنی ہی اہمیّت رکھتی ہیں جتنی دوسرے کے لئے اس کی اغراض و خواہشات۔ لیکن جمہوری نظام میں جب اکثریت کی حکومت کا اصول اختیار کیا جاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جو گروہ کثیر تعداد میں ہے وہ حاکم بن جائے اور حکومت کے زور سے اپنی اغراض اور خواہشات حاصل کرے اور جو گروہ کثیر تعداد میں نہ ہو وہ غلام بنالیا جائے اور اکثریت کی اغراض و خواہشات پر اس کی اغراض و خواہشات اسی طرح قربان کی جائیں۔ جس طرح کسی زار یا کسی قیصر کی انتہائی ظالمانہ حکومت میں کی جاسکتی ہیں۔ یہی چیز ہے جس کو اکثریت کا استبداد (Tyranny of the Majority) کہتے ہیں اور جو اس زمانہ کی جمہوریتوں کے چہرے پر سب سے زیادہ بدنما داغ ہے۔

اکثریت کی حکومت کا اصول صرف اس جگہ صحیح ہو سکتا ہے جہاں کے باشندے اساسی امور (Fundamentals) میں متفق ہوں، اور ان کے درمیان اختلاف محض آراء کا ہو، نہ کہ اغراض کا۔ ایسی جگہ تو یہ ممکن ہے کہ آج کی اقلیت کل اکثریت بن جائے، اور آج کی اکثریت کل اقلیت بن جائے۔ رائے عام اگر محض رائے عام ہے تو وہ بدل سکتی ہے اور بدلی جا سکتی ہے۔ کل رائے عام لبرل پارٹی کی مؤید تھی تو آج وہ لیبر پارٹی کے حق میں ہموار ہو سکتی ہے۔ ایسی حالت میں کوئی اکثریت نہ مستقل اور دائمی اکثریت ہوگی نہ کبھی ظلم و جور کا طریقہ اختیار کر سکے گی، اور نہ اقلیت کو اس سے یہ اندیشہ ہوگا کہ وہ اساسی امور پر ضرب لگائے گی۔ لیکن اغراض — یا خود غرضی — کا اختلاف، اور مذہبی اصولوں کا، یا قومی جذبات کا، یا طرز زندگی کا اختلاف وہ چیز نہیں ہے جو دلائل سے دور کیا جا سکے۔ اس اعتبار سے جو گروہ اکثریت میں ہے وہ مستقل طور پر اکثریت میں رہے گا اور جو اقلیت میں ہے وہ مستقل طور پر اقلیت میں رہے گا۔ ایسی اکثریت کو حکومت کا حق دینے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایک زار کی جگہ لاکھوں زار اور ایک قیصر کی جگہ کروڑوں قیصر پیدا ہو جائیں اور محض اس بنا پر کہ ان کے سروں کی تعداد زیادہ ہے، ان کے لئے یہ جائز ہو جائے کہ اپنے ہی ہم وطن لوگوں کی ایک معتدبہ جماعت پر جس طرح چاہیں ظلم و ستم کریں۔ یہ جمہوریت کے بنیادی اصولوں کی صریح اور کلی نفی ہے۔ اس چیز پر لفظ جمہوریت کا اطلاق ہی غلط ہے۔ اسے بڑے پیمانہ پر چنگیزیت کہنا چاہئے۔

جن ممالک میں باشندوں کے درمیان قومی تفریق موجود ہے، یعنی مذہب، نسل، زبان، رنگ وغیرہ امور میں اختلاف پایا جاتا ہے، اور اسی طرح جہاں نظریات اور اصول زندگی کا اساسی اختلاف ہے یا باشندوں کے مختلف گروہوں کی اغراض باہم متصادم ہیں، وہاں مختلف عناصر کو ملا کر ایک اسٹیٹ بنانے اور اس میں جمہوریت کا اصول نافذ کر دینے کا نتیجہ ظلم کے سوا کچھ نہیں نکلا، اور ہمیں دنیا کی پوری تاریخ میں ایک مثال بھی نہیں ملی جس کو مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہو۔

روس میں مزدوروں کی حکومت قائم ہونے کے بعد متوسط طبقہ کے لوگ، چھوٹے زمیندار،

تجارت پیشہ اور دو کاندار، اور ان سب سے زیادہ مذہبی گروہ جس بُری طرح پیسے گئے اور آج بھی جس طرح وُہ غلام بنا کر رکھے گئے ہیں، اس حالت کا تقابل اگر زار کی حکومت کے مظالم سے کیا جائے تو شاید زاریت ہی کو اشتراکیت کے آگے سرِ نیاز جھکا دینا پڑے۔ یہ اس امر کا کھلا ہُوا ثبوت ہے کہ جہاں خود غرضی بنائے اختلاف ہو، وہاں ایک قسم کی اغراض رکھنے والوں کا حکمراں بن جانا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ دوسرے تمام گروہوں کا خُون چوس لیں اور ان کو اپنی خود غرضی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیں۔

چیکوسلوواکیا میں اب سے ۲۰ سال قبل مختلف چھوٹی اور بڑی قوموں کو ملا کر ایک جمہوری اسٹیٹ بنایا گیا تھا۔ اس سیاسی حماقت کا جو انجام ہُوا آج اسے ساری دنیا دیکھ رہی ہے۔۔ سب سے بڑھکر جن قوموں سے توقع تھی کہ ایک قوم بن جائے گی انہی نے مصنوعی قوم سازی کے نظریہ کی دھجیاں بکھیر دیں۔ اس نئی ریاست کے اصل اجزائے ترکیبی دو ہیں۔ ایک چیک (Czech.) دوسرے سلاوک (Slovaks) نسل اور قومی روایات کے لحاظ سے دونوں بالکل مختلف ہیں۔ گذشتہ ہزار برس کی تاریخ میں کہیں ان کے درمیان کسی ارتباط کا نشان نہیں ملتا۔ صرف ایک چیز ان کے درمیان مشترک تھی۔ اور وُہ یہ تھی کہ دونوں آسٹریا ہنگری کے غلام تھے۔ اور دونوں کو ظالم سلطنت کی نفرت اور آزادی کی خواہش نے ایک دوسرے سے قریب تر کر دیا تھا۔ سیاسی مدبرین یہ سمجھے کہ مشترک دشمن کی عداوت اور اس کے پنجہ سے آزادی حاصل کرنے کا مشترک جذبہ دو قوموں کو ایک قوم بنا دینے کے لئے کافی بنیاد ہے۔ چنانچہ انہوں نے ان دونوں کو ملا کر ایک نئی قوم "چیکو سلاوک" وضع کر دی اور اس کو بالفعل موجود فرض کر کے ان کی ایک قومی جمہوری ریاست بھی بنا دی۔ لیکن اس جدید ریاست کی تشکیل پر کچھ زیادہ زمانہ نہ گذرا تھا کہ تجربہ نے ثابت کر دیا کہ دو قوموں کو ساتھ ملا کر باندھ دینے سے ایک قوم نہیں بن جایا کرتی۔ مصنوعی قومیت محک امتحان کی پہلی ہی رگڑ پر کھوٹی ثابت ہوئی۔ چیک کثیر التعداد تھے زیادہ تعلیم یافتہ اور زیادہ سرمایہ دار تھے، اور آسٹریا ہنگری کے مظالم نے ان کو سلطنت کے ساتھ مذہب سے بھی متنفر کر دیا تھا۔ ان کے برعکس سلاوک لوگ

سخت پابند مذہب، تعلیم میں بہت پیچھے، زیادہ تر زراعت پیشہ اور خستہ حال، اور تعداد میں بھی چیکوں کی بہ نسبت ½ - اس تفاوت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر چیک اکثریت نے دستورِ حکومت میں یہ طے کر لیا کہ قومی اسٹیٹ بالکل ایک دنیوی اسٹیٹ (Secular State) ہو گا اس میں تمام مذاہب کے ساتھ رواداری تو ضرور برتی جائے گی، مگر کسی مذہب یا مذہبی نظام کو سرکاری طور پر تسلیم نہ کیا جائے گا۔ تعلیم کا پورا انتظام اسٹیٹ کے ہاتھ میں ہو گا۔ اور ایسی تعلیم دی جائے گی جو سائنٹیفک تحقیقات کے نتائج سے متصادم نہ ہوتی ہو[1]۔ دستور العمل کی ان دفعات سے فائدہ اٹھا کر چیک اکثریت کی حکومت نے سلاوک علاقے کے مدارس میں لامذہب اسکول ماسٹر بھیجنے شروع کر دیئے اور نظامِ تعلیم سے مذہبی تعلیم کو قطعی خارج کر دیا۔ سلاوک لوگوں نے اپنی مذہبی تعلیم کے لئے بطور خود کوئی انتظام کرنا چاہا تو اسے سرکاری امداد دینے سے انکار کر دیا گیا۔ حکومت کے نظم و نسق اور خصوصاً بڑے ذمہ داری کے مناصب کو چیکوں کے لئے مخصوص کر لیا گیا اور خود سلاوک علاقوں میں چیک افسر حکمران بنکر آنے لگے۔ انہی باتوں نے آخر کار سلاوک لوگوں کو اس بات کا قائل کر دیا کہ ایک چھوٹی اور ایک بڑی قوم کو ملا کر ایک قومی جمہوری اسٹیٹ بنانا دراصل چھوٹی قوم کو بڑی قوم کی غلامی میں دینا ہے۔ چنانچہ اب وہ کئی سال سے اپنے علاقہ کے لئے حکومت خود اختیاری (Autonomous Self-government) کا مطالبہ کر رہے ہیں[2]۔

اسی "قومی جمہوری ریاست" میں تقریباً ۳۵ لاکھ جرمن بھی شامل کر دیئے گئے تھے (یعنی کل آبادی کا ¼ حصہ) جن کی قومیت، نسل، زبان، تاریخی روایات چیک اور سلاوک دونوں قوموں سے بالکل مختلف تھیں، بلکہ صدیوں سے چیک اور جرمن نسل میں کھلی عداوت چلی آتی تھی۔ مدارس میں، کارخانوں میں، کلیساؤں میں جہاں کہیں چیک اور جرمن جمع ہوتے وہاں اکثر ہنگامے ہو جایا کرتے

---

[1] ملاحظہ ہو سنہ ۱۹۲۰ء کا چیکو سلاوک کانسٹی ٹیوشن دفعات ۱۱۹-۱۲۱-۱۲۲-۱۲۴

[2] The New Slovakia R. W. Seton-Watson,

تھے۔ایک دوکان میں دونوں سے یکجا کام لینا مشکل تھا۔حتیٰ کہ ایک اسٹیشن سے ان کا ریل پر سوار ہونا بھی دشوار تھا جس کی وجہ سے اکثر چھوٹے چھوٹے مقامات پر بھی دو اسٹیشن بنائے جاتے تھے تاکہ ایک سے چیک سوار ہوں اور دوسرے سے جرمن[1]۔ اس قدر شدید اختلافات کے باوجود ان دونوں کو ایک قومیت میں شامل کر کے ایک قومی جمہوری اسٹیٹ بنا دیا گیا۔ جس میں چیک اپنی اکثریت کی بنا پر حاکم اور جرمن اپنی اقلیت کی بنا پر محکوم تھے۔ حالانکہ صدیوں تک اسی سرزمین میں یہی حاکم اور چیک محکوم رہ چکے تھے۔ اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا اسے ابھی حال ہی میں ساری دنیا دیکھ چکی ہے۔ ثابت ہو گیا کہ محض ایک قومی اسٹیٹ بنا دینے سے دو مختلف قومیں ایک قوم نہیں بن سکتیں اور نہ ایک جمہوری اسٹیٹ بنا دینے سے جمہوریت کی حقیقی روح پیدا ہو سکتی ہے۔ البتہ مصنوعی طور پر دو قوموں کی ایک قومیت اور ایک جمہوریت بنا دینے کا یہ اور صرف یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ کثیر التعداد قوم عملاً قلیل التعداد قوم کو غلام بنا لے اور جمہوری نظام میں اس کو حاکمیت کے فطری حقوق سے محروم کر کے رکھ دے۔ چیک اکثریت نے جرمن اقلیت کے ساتھ یہی کیا۔ تعلیم کے ذریعہ سے جرمنوں کو چیک قومیت میں جذب کرنے کی کوشش کی گئی۔ جرمن زبان و ادب کو مٹانے اور دبانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی۔ سرکاری ملازمتوں میں جرمن اور چیک کا قومی امتیاز کبھی نہ بھولا گیا اور ہمیشہ چیکوں کو جرمنوں پر ترجیح دی گئی۔ تجارتی کاروبار اور سرکاری کام کے ٹھیکوں تک میں جرمنوں کو دبانے اور چیکوں کو بڑھانے کا ہر ممکن طریقہ اختیار کیا گیا۔ حتیٰ کہ خاص ان علاقوں میں جہاں ۸۰ اور ۹۰ فیصدی جرمن آبادی تھی، سرکاری ضروریات کے لئے چیکوں کو ٹھیکے دیئے جانے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۳۵ء میں جرمنوں کی معاشی حالت روز بروز گرنی شروع ہو گئی اور ان کے کاروبار بیٹھنے لگے۔ یہ سب کچھ اس قومی جمہوری اسٹیٹ میں ہوا جس کی

---

[1] C. D. Hazen, Europe Since 1815.

"متحدہ وطنی قومیت" کا ایک جزیہ جرمن بھی تھے، جس کے جمہوری نظام میں ان کو دستور کی رُو سے پورے شہری حقوق عطا کئے گئے تھے اور جس کی دولت مشترکہ (Commonwealth) کی ملکیت میں وہ بھی ازروئے دستور یکساں حصہ دار تھے۔ لیکن ۲۰ سال کے تجربہ نے بتا دیا کہ "قومی" اور "جمہوری" کے معنی لغت میں کچھ اور ہوتے ہیں اور حقیقت میں کچھ اور۔ آخر کار جرمنوں میں وہ عظیم الشان ہیجان رونما ہوا جو قریب تھا کہ تمام دنیا کے امن و امان کو پھونک دیتا اگر عین وقت پر عقلمندی سے کام لیکر جرمنوں کو جرمنی کے حوالہ نہ کر دیا جاتا۔

اسی قسم کے حالات ان دوسرے ممالک کے بھی ہیں جہاں مختلف قوموں کو ایک قومیت فرض کرکے ایک جمہوری اسٹیٹ میں ضم کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر یوگوسلافیا لیجئے۔ انیسویں صدی کے آخری دور میں آسٹریا ہنگری کے ظالمانہ تسلط سے نجات حاصل کرنے کے لئے کروٹ (Croats) اور سلافینی (Slovenes) قوموں میں آزادی کا زبردست جذبہ پیدا ہوا۔ اور انہوں نے اپنے ہمسایہ سربیوں (Serbs) سے اتحاد کر لیا۔ ان مختلف عناصر کے درمیان آسٹریا کی عداوت اور آزادی کی مشترک خواہش کے سوا اور کوئی وجہ اتحاد نہ تھی۔ نسل میں اختلاف، مذہب میں اختلاف، زبان میں اختلاف، اور طرزِ زندگی میں اختلاف۔ مگر طلب آزادی کے نشے میں ان سب اختلافات کو نظر انداز کرکے یہ سب گھل مل گئے، اپنی متحدہ قومیت کا نام انہوں نے "یوگوسلافیا" رکھ لیا، اور اپنی الگ الگ زبانوں کے نام ملا کر ایک متحدہ قومی زبان کا عجیب و غریب نام (Serbo Croatian Slovene) رکھا۔ جس کا مسمّی کہیں دنیا میں موجود نہ تھا۔ بلکہ تین الگ الگ زبانیں مختلف رسم الخطوں اور مختلف لسانی خصوصیات کے ساتھ موجود تھیں اور "ہندوستانی" کی طرح بس ان کا ایک متحد نام رکھ دیا گیا۔ جنگ عظیم کے دوران میں جب یہ تینوں قومیں آسٹریا ہنگری کے خلاف برسرپیکار ہوئیں۔ تو جولائی ۱۹۱۷ء میں سربیا کے وزیر اعظم اور جوگوسلاف کمیٹی کے صدر کا ایک مشترک بیان اس مضمون کا شائع ہوا کہ:-

"سرب کروٹ اور سلافینی ایک قوم ہیں۔ آئندہ کے لئے یہ اپنا ایک قومی اسٹیٹ بنانا

چاہتے ہیں۔ جو جمہوری اسٹیٹ ہوگا۔ اس متحدہ اسٹیٹ کا جھنڈا الگ ہوگا اور تینوں شرکاء کے جھنڈے الگ الگ ہوں گے جن کی حیثیت مساویانہ ہوگی۔ اسی طرح (Cyrillic. ) اور لیٹن دونوں رسم الخط سرکاری طور پر مساوی ہوں گے۔ اور تینوں مذاہب یعنی آرتھوڈوکس کیتھولک اور اسلام کا درجہ بھی مساویانہ تسلیم کیا جائے گا۔"

مگر جنگ ختم ہونے کے بعد جب آزادی ملی اور نومبر ۱۹۲۰ء میں نئی ریاست کی بنا رکھی گئی تو صورت حال کچھ اور ہی تھی۔ ریاست کی ایک کروڑ بیس لاکھ آبادی میں پچاس لاکھ کے قریب سرب تھے۔ تیس لاکھ کیتھولک کروٹس اور دس لاکھ سلافینی۔ ان کے علاوہ جرمن، مگیار، رومانی، بلغاری اور البانوی بھی کئی کئی لاکھ کی تعداد میں شامل ہو گئے تھے۔ اگرچہ ان سب کو ملا کر سربی گروہ اقلیت میں تھا، لیکن الگ الگ ہر گروہ کے مقابلہ میں اس کی بڑی اکثریت تھی، اور ان اقلیتوں کے درمیان کامل اتفاق نہ ہونے کی وجہ سے اس کی پوزیشن اور زیادہ مضبوط ہو گئی تھی۔ اس پوزیشن سے فائدہ اُٹھا کر سربیوں نے عملاً حاکم قوم کی حیثیت اختیار کرلی۔ تمام اقلیتوں کو محکوم بنالیا، متحدہ قومیت کا تخیل ہوا میں اُڑ گیا، اور حکومت کے زور سے سربی قومیت تمام قلیل التعداد جماعتوں پر مسلط کی جانے لگی۔ تاسیس ریاست کے بعد پہلی مرتبہ جب کانسٹی ٹیوشن بنانے کے لئے نیشنل کونسل منعقد ہوئی تو سربی قوم پرستوں نے یوگوسلافی قومیت کا لبادہ اتار کر پھینک دیا اور خود مختار صوبوں کا ایک وفاق بنانے کے بجائے ایک مضبوط مرکزی طاقت رکھنے والی بادشاہی کی بنا رکھدی جس کا فرمانروا سربیا کا بادشاہ تھا اور جس کا پایۂ تخت سربیا کا پایۂ تخت تھا۔ آج اس "قومی جمہوری حکومت" کا کھلا ہوا مسلک یہ ہے کہ اقلیتوں کی قومیت کے ایک ایک نشان کو مٹائے اور تمام اقلیتیں تقریباً ۱۸ سال سے پیہم کوشش کر رہی ہیں کہ اس پھندے سے، جس کو خود انہوں نے خوشی خوشی پہنا تھا، کسی طرح بچ نکلیں[1]۔

ان چھوٹی ریاستوں کو چھوڑ کر ان بڑے ممالک کو لیجیے جو آج جمہوریت اور دستوریت کے ابوالآبا سمجھے جاتے ہیں۔ ان میں بھی جہاں کہیں مختلف مذاہب یا مختلف نسلی قومیتوں کو ملا کر ایک قومیت بنانے کی

[1] حاشیہ صفحہ ۱۰۰ پر ملاحظہ ہو۔

جبر اور ظلم ہی سے بنی ہے اور قومی جمہوری اسٹیٹ وہاں اسی طرح بنا ہے کہ آبادی کے ایک کثیر التعداد اور منظم گروہ نے چھوٹے گروہوں پر زبردستی اپنی خواہشات اور اپنے اصولوں کو مسلط کیا اور ان کے امتیازی وجود کو مٹا کر رکھدیا۔

سوئس قوم اور اس کی جمہوری وفاقی ریاست کس طرح بنی؟ ابتداءً یہ ۲۲ آزاد جمہوری ریاستوں کا محض ایک تحالف (Confederation) تھا۔ انیسویں صدی کے ابتداء میں مذہبی آزاد خیالی کے اثرات سوئٹزرلینڈ پہنچے اور مذہب کو تعلیم اور سیاست دونوں سے خارج کرنے کا ارادہ کیا گیا۔ سات کیتھولک ریاستوں نے اس کی مخالفت کی۔ ۱۵ آزاد خیال ریاستوں نے ان پر زبردستی اپنے خیالات کو مسلط کرنا چاہا جس کا انہیں از روئے آئین کوئی حق نہ تھا۔ آخر ۱۸۴۷ء میں ساتوں کیتھولک ریاستیں تحالف سے الگ ہوگئیں اور تحالف کے اصول کی رُو سے وہ پوری طرح اس کی مجاز تھیں۔ مگر آزاد خیال ریاستوں نے اپنی غالب اکثریت سے ان کے اس فعل کو ناجائز ٹھیرایا اور ان کے علاقوں پر حملہ کر کے انہیں زبردستی ایک وفاقی اسٹیٹ میں شامل ہونے پر مجبور کردیا۔ پھر ۱۸۴۸ء میں جو نیا دستور بنایا گیا۔ اس میں وفاقی ریاستوں کے اختیارات محدود کر کے مرکز کے اختیارات نہایت وسیع کر دیئے گئے، تاکہ اکثریت پوری طرح اقلیت پر اپنی مرضی اور اپنے اصولوں کو نافذ کر سکے اور اقلیت مجبور ہو کر اس واحد قومیت میں اپنے آپ کو گم کردے جسے آزاد خیال لوگ (Radicals) وجود میں لانا چاہتے تھے۔

برطانیہ میں کیا ہوا؟ انیسویں صدی کے ثلث اول تک برطانیہ عظمیٰ میں انتخاب کا قانون

(حاشیہ صفحہ ہذا تفصیلات کیلئے حسب ذیل کتابیں ملاحظہ ہوں :-

C. D. Hazen, Europe Since 1815

A. H. Morely, The New Democratic Constitution of Europe

"Encyclopaedia Britannica," Article : Yugoslavia

(حاشیہ صفحہ ۱۰۹ پر ملاحظہ ہو

اس قسم کا تھا کہ انگلینڈ کو، اسکاٹ لینڈ، ویلز اور آئرلینڈ، تینوں کی مجموعی طاقت سے قریب قریب تین گنی زیادہ اکثریت پارلیمنٹ میں حاصل ہوتی تھی۔ انگلستان کی صرف ایک کاؤنٹی (کارنوال) کے نمائندے پورے اسکاٹ لینڈ کے نمائندوں کے برابر تھے حالانکہ اسکاٹ لینڈ کی آبادی کارنوال سے آٹھ گنی تھی، کوئی کیتھولک، کوئی یہودی اور کوئی ایسا شخص جو اینگلیکن چرچ کو نہ مانتا ہو۔ از روئے قانون نہ تو پارلیمنٹ کا ممبر بن سکتا تھا، نہ کسی سرکاری عہدے پر مامور ہو سکتا تھا اور نہ کسی میونسپلٹی میں داخل ہو سکتا تھا۔ ان سب فرقوں کو چرچ آف انگلینڈ کے لئے عشر دینا پڑتا تھا۔ نکاح کے لئے چرچ آف انگلینڈ کے پادری کے پاس جانا ہوتا تھا۔ اپنی عبادت گاہ کو چرچ آف انگلینڈ میں رجسٹر کرانا پڑتا تھا۔ آکسفورڈ اور کیمبرج میں داخلہ کے لئے ایسی مذہبی شرائط رکھی گئی تھیں جنہیں اینگلیکن چرچ کے پیرؤوں کے سوا کوئی پوری نہ کر سکتا تھا، اس لئے ان دونوں یونیورسٹیوں کے دروازے گویا دوسرے فرقوں کے لئے بند تھے۔ چرچ آف انگلینڈ کو نہ ماننے والے لوگ ووٹ دینے کے حقدار تو تھے مگر وہ اپنے ہم مذہب لوگوں کو ووٹ نہ دے سکتے تھے کیونکہ انہیں پارلیمنٹ میں داخل ہونے کی اجازت ہی نہ تھی۔ ۱۸۲۸ء میں ان قیود کو اٹھانے اور نرم کرنے کا میلان پیدا ہوا اور قریب قریب ۶۰ برس کی مسلسل اور تدریجی اصلاح نے بالآخر ان کو بالکلیہ منسوخ کیا۔ اس قسم کی تھی وہ جابرانہ طاقت، اور اس قسم کا تھا وہ مادی و اخلاقی غلبہ جس سے انگلینڈ کے لوگوں نے برطانیہ عظمی کی مختلف قوموں اور مختلف مذہبی جماعتوں کو مغلوب کر کے اپنی تہذیب اور اپنی قومیت میں جذب کیا اور وہ واحد قومیت بنائی جسے آج "ایک ملک اور ایک قوم" کا نعرہ بلند کرنے والے سب سے پہلے مثال میں پیش کرتے ہیں۔ شاید کہ ان کے پیش نظر بھی ایک قوم بنانے کے ایسے ہی طریقے ہونگے۔

یہاں مثالوں کا استقصاء مقصود نہیں ہے۔ اگرچہ عہد حاضر کی تاریخ اور خود ہمارے موجود دور کے واقعات سے ایسی ہی بکثرت مثالیں اور بھی پیش کی جاسکتی ہیں۔ مگر جو بات ہمیں ثابت

(حاشیہ ص ۱۰۸) ؎ Cambridge Modern History Vol. XI

کرنا چاہتا ہوں اس کے لئے یہی مثالیں بہت کافی ہیں۔ ان سے بآسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مختلف قوموں کو ایک قوم قرار دیکر ایک جمہوری اسٹیٹ بنانے کے معنی کیا ہیں، اور یہ بات جو بظاہر نہایت معصوم الفاظ میں بیان کی جاتی ہے اس میں کس قدر غیر معصوم مقصد پوشیدہ ہوتا ہے۔

اب ذرا ہندوستان کے حالات پر ایک نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ یہاں ایک قومی، جمہوری لادینی اسٹیٹ بنانے کے معنی کیا ہو سکتے ہیں۔

جمہوری اسٹیٹ کے معنی یہ ہیں کہ تمام باشندگان ہند کو اسٹیٹ میں حاکمیت حاصل ہو مگر عملاً اس حاکمیت کو وہ جماعت استعمال کرے جو اکثریت میں ہو۔

جمہوری کے ساتھ "قومی" کی قید لگانے سے یہ نتیجہ نکلا کہ یہاں مختلف قومیتوں کے وجود کی نفی کر دی جائے اور تمام باشندوں کو ایک قوم قرار دیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہندوستان کی حکومت میں کسی شخص کا حصہ اس حیثیت سے نہ ہوگا کہ وہ ہندو یا مسلمان ہے اسٹیٹ کی رکنیت بجائے خود اس امر کو مستلزم ہوگا کہ وہ اپنے ہندو یا مسلمان ہونے کی حیثیت کی خود نفی کر دے۔ اس کی جداگانہ قومی حیثیت خواہ بالفعل برقرار ہے، مگر وہ اس حیثیت میں اسٹیٹ سے کسی چیز کا مطالبہ نہ کر سکے گا، بلکہ اسے ان فیصلوں کو قبول کرنا ہوگا جو مجموعی طور پر ملک کے باشندوں کی اکثریت ملک کی مجلس قانون ساز میں طے کر دے۔

لادینی کی قید اس میں ایک اور چیز کا اضافہ کرتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص اور کوئی گروہ کسی مذہب کا پیرو ہونے کی حیثیت سے اسٹیٹ میں حصہ دار نہیں ہے۔ وہ اسٹیٹ کے دائرے میں اپنی اس حیثیت کو لیکر بھی نہیں آسکتا۔ اس دائرے میں اس کو خود اپنی اس حیثیت کی نفی کرنی ہوگی۔ اخلاق، تمدن، معاشرت، معیشت، تعلیم، اور زندگی کے دوسرے مسائل کے متعلق اس کے اپنے نظریات خواہ کچھ ہوں، وہ ان سب کو اس وقت بھلا دینے پر مجبور ہوگا جب باشندوں کی اکثریت ان مسائل میں کوئی دوسرا نظریہ اختیار کرے گی۔ وہ اس وقت یہ نہ کہہ سکے گا کہ میرے مذہب اور میری تہذیب کا نظریہ دوسرا ہے اور میں اکثریت

کے نظریہ کو قبول نہیں کر سکتا۔ اگر وہ ایسا کہے گا تو اس کو جواب دیا جائے گا کہ اسٹیٹ میں جناب کا حصہ اس حیثیت سے ہے ہی کہاں کہ آپ فلاں مذہب اور فلاں تہذیب کے پیرو ہیں۔ مجلس قانون ساز میں آپ ایک مذہبی آدمی کی حیثیت سے آئے کب ہیں کہ آپ کو اس قسم کے عذرات پیش کرنے کا حق حاصل ہو۔ یہاں تو آپ کی حیثیت محض ہندوستانی ہونے کی ہے اور جمہوریت کا اصول آپ تسلیم کر چکے ہیں، لہٰذا ہندوستانیوں کی اکثریت جو نظریہ رکھتی ہے اسے طوعاً و کرہاً آپ کو قبول ہی کرنا ہوگا۔ اس پر مزید یہ کہ اگر وہ اپنے گروہ کی حد تک اپنی مذہبی تنظیم کرنے کے لئے حکومت کے وسائل و ذرائع میں سے کوئی حصہ مانگے گا تو اس سے کہہ دیا جائے گا کہ جناب یہ کوئی مذہبی اسٹیٹ نہیں ہے، ایک دنیوی لادینی اسٹیٹ ہے۔ اس کی حاکمیت میں جب آپ کا کوئی حصہ مذہبی آدمی ہونے کی حیثیت سے ہے ہی نہیں تو آپ کو مذہبی تنظیم کے لئے حکومت کے اختیارات اور وسائل و ذرائع میں سے کوئی حصہ کیسے مل سکتا ہے۔ آپ کو یہ کام کرنا ہے تو جائیے، خود اپنے مذہبی گروہ کے وسائل سے کیجئے۔

یہ نتائج تو محض ان تین اصطلاحوں کے معانی پر غور کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔ اب عملی حیثیت سے دیکھئے تو یہ تصویر اور زیادہ خوفناک ہو جاتی ہے۔ اوپر میں بیان کر چکا ہوں کہ جمہوری نظام کے صحیح یا غلط ہونے کا تمام تر انحصار اس سوال پر ہے کہ اس میں اکثریت اور اقلیت کس طرح بنتی ہے۔ اگر باشندوں کے درمیان زندگی کے بنیادی مسائل (Fundamentals) میں اتفاق ہے، اور صرف وسائل و طریقہ ہائے کار (Means and Methods) میں اختلاف آراء پایا جاتا ہے، تب تو اکثریت اقلیت میں اور اقلیت اکثریت میں تبدیل ہوتی رہے گی۔ نہ کوئی اکثریت مستقل اور دائمی ہوگی نہ اقلیت۔ ایسی حالت میں اس امر کا کوئی خطرہ نہیں کہ اکثریت ظلم و استبداد کا طریقہ اختیار کرے اور اقلیت کو حاکمیت سے محروم کرکے ایک غلام اور محکوم بنالے لیکن اگر صورت حال برعکس ہو، اگر باشندوں کے درمیان زندگی کے اساسی امور میں اختلاف ہو، اور اس اختلاف نے ان کو الگ الگ ممتاز گروہوں

میں تقسیم کر دیا ہو اور ان گروہوں میں ترجیحِ ہم جنس کی اسپرٹ پائی جاتی ہو، اور اس گروہ بندی نے ان کی دنیوی اغراض کو بھی بڑی حد تک ایک دوسرے سے متصادم کر دیا ہو، تو ایسی جگہ اکثریت دائمی اکثریت ہوگی۔ اور اقلیت دائمی اقلیت ہوگی۔ وہاں رائے عام کو ہموار کر کے اقلیت کا اکثریت بن جانا غیر ممکن ہے۔ وہاں سب باشندوں کو ایک قوم قرار دینے اور اس بنیاد پر جمہوری لادینی اسٹیٹ بنانے کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ اکثریت کو اقلیت پر ظلم کرنے اور اس کو غلام بنا کر رکھنے اور تباہ و برباد کرنے کا لائسنس دیا جائے۔ وہاں قومی اسٹیٹ دراصل اکثریت کی قوم کا اسٹیٹ ہوگا، اور لادینی اسٹیٹ صرف اقلیت کے لئے لادینی ہوگا، اس میں اکثریت کو نہیں بلکہ صرف اقلیت کو اپنی جداگانہ قومی حیثیت اور اپنی مذہبیت کی نفی کرنی ہوگی۔ اکثریت اپنی ان سب حیثیتوں کو برقرار رکھ کر سب کچھ کر سکے گی۔ مگر اقلیت اپنے مذہب کا یا اپنی تہذیب یا زبان و ادب و فلسفہ کا نام نہ لے سکے گی۔ ایسی جگہ تمام باشندوں کو ایک قوم قرار دینے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ فی الواقع ایک قوم ہیں، بلکہ اس کے معنی دراصل یہ ہیں کہ جو قوم کثیر التعداد ہے وہ جمہوری اسٹیٹ کی تمام طاقتوں پر قابض ہو کر قلیل التعداد جماعتوں کی قومیتوں کو مٹانا اور اپنی قومیت میں جذب کر کے ایک قوم بنانا چاہتی ہے۔

آنکھیں کھول کر انصاف کی نظر سے دیکھئے۔ کیا ہندوستان میں فی الواقع یہی صورت حال موجود نہیں ہے؟

(۱) ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ کہ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان قومیت کا اختلاف اس اختلاف سے بھی زیادہ نمایاں پایا جاتا ہے جو یورپ میں جرمن اور فرنچ اور انگریز اور اطالوی قوموں کے درمیان ہے۔ وہاں کم از کم اخلاقی شعور ایک سا ہے۔ تہذیب کے بنیادی اصول ایک ہیں۔ اور آداب و اطوار اور طرزِ زندگی میں بھی اساسی اختلافات موجود نہیں ہیں، یا اگر ہیں بھی تو نسبتاً خفیف۔ مگر یہاں آٹھ سو برس تک ایک

آب و ہوا اور ایک خطۂ زمین میں پہلو بہ پہلو رہنے کے باوجود دونوں قوموں کی زندگی کے دھارے الگ الگ بہ رہے ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو دیہاتی ہندوؤں اور مسلمانوں کو کچھ ایک جیسے لباس پہنتے دیکھ کر اور معیشت کے میدان میں ایک ساتھ محنت مزدوری کرتے دیکھ کر حکم لگا سکتے ہیں کہ یہ ایک قوم ہیں۔ وہ ہندوستان میں پیدا تو بے شک ہوئے ہیں مگر ان کا دماغ انگلستان میں بنا ہے اور اس پر روسی دارنش تازہ تازہ چڑھا ہے۔ اس لئے وہ رات دن ہندوستانیوں میں رہ کر بھی ان کو صرف اوپر سے اور باہر سے ہی دیکھ سکتے ہیں جس طرح کوئی امریکن سیّاح دیکھ لیتا ہے۔ وہ ان کے دل میں اتر کر اور ان کی زندگی میں گھس کر نہیں دیکھ سکتے کہ ان کے درمیان کتنا بڑا اور گہرا تفاوت ہے۔ دونوں قوموں کے جذبات و احساسات ایک دوسرے سے اس قدر مختلف بلکہ باہم متصادم ہیں کہ ہندو جس چیز کو الٰہی تقدیس و احترام کی نظر سے دیکھتا ہے۔ مسلمان اس کو شوق سے کھاتا ہے، اور یہ فرق مہاتما گاندھی اور مولانا ابوالکلام سے لیکر چھوٹے سے چھوٹے گاؤں کے جلاہے اور پاسی تک کے درمیان یکساں ہے، بلکہ مہاتما اور مولانا تو اس باب میں مدارات سے بھی کام لے سکتے ہیں۔ لیکن گاؤں والے اس پر لٹھ چلا بیٹھتے ہیں۔ شہری ہندو اور مسلمان تو کبھی کبھار ایک میز پر کھا بھی لیتے ہیں، مگر دیہاتی ہندو تو مسلمانوں کا ہاتھ لگا ہوا پانی تک نہیں پیتا۔ وہ ریل میں بھی اس تختہ پر جہاں مسلمان کھانا کھا رہا ہو، بادل ناخواستہ ہی بیٹھتا ہے۔ اور دل میں چھی چھی کرتا رہتا ہے۔ ان دونوں کی زندگی کے اندر داخل ہونے والے دروازے ایک دوسرے کے لئے بالکل بند ہیں۔ پیدائش سے لیکر موت تک ہر رسم، ہر تہوار، ہر خوشی، اور ہر غمی میں ہندو ہندو کے ساتھ ہوتا ہے اور مسلمان مسلمان کے ساتھ۔ ان بیّن اختلافات کے ہوتے ہوئے کون انہیں ایک کہہ سکتا ہے۔

(۲) منڈی اور دفتر اور کارخانے میں یہ دونوں یکجا تو ضرور ہوتے ہیں، مگر کیا ان کے قومی اختلاف کا اثر ان کے معاشی مفاد اور کاروباری اغراض میں ظاہر نہیں ہوتا؟ تخیل کی بلندیوں پر پہنچ کر کہنے والا جو چاہے کہہ دے اور لکھنے والا جو چاہے لکھ دے، مگر روزمرہ کے کاروبار

میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے کاروباری زندگی کے اندر اتر کر دیکھئے اور جو لوگ یہاں کام کر رہے ہیں ان سے پوچھئے کیا آدمی کو ملازم رکھنے میں اور مزدور سے خدمت لینے میں اور دوسرے چھوٹے اور بڑے معاملات میں ہندو اور مسلمان کی تمیز نہیں کی جاتی؟ کیا دیہاتی آبادیوں تک میں مسلمانوں کا تمدنی اور اقتصادی بائیکاٹ نہیں ہو رہا ہے؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ جو پیشے مسلمانوں کے ہاتھ میں تھے ان کے لئے ہندو تیار کئے جاتے ہیں۔ تاکہ مسلمانوں سے کام نہ لینا پڑے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ آڑھت کے کاروبار میں مسلمانوں کا گھسنا قریب قریب ناممکن کر دیا گیا ہے، اور اگر کوئی مسلمان آڑھتیہ منڈی میں آتا ہے تو پوری ہندو برادری اس کا دیوالہ نکلوانے کے لئے متحد ہو جاتی ہے؟ پھر کیا ابھی حال ہی میں سارے ہندوستان نے یہ نہیں دیکھا کہ پنجاب کے جدید زرعی قوانین پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے معاشی مفاد صریحاً ایک دوسرے کی ضد نکلے؟ سود خواروں کے غاصبانہ تسلط سے زمینداروں کا نکلنا مسلمانوں کے نزدیک رحمت تھا تو ہندو کے نزدیک لعنت، اور اس تقسیم میں ہندو اور مسلمان اس طرح ایک دوسرے کے مقابل آکر کھڑے ہوئے کہ بہت سے کانگریسی خیال کے مسلمان مسلمانوں کے ساتھ تھے اور قریب قریب تمام کانگریسی ہندو — بھولا بھائی ڈیسائی تک — ہندوؤں کے ساتھ۔ کیا یہ اس امر کا صریح ثبوت نہیں ہے کہ معاشی معاملات میں بھی دونوں قوموں کی اغراض بڑی حد تک متصادم ہیں؟

(۳) پھر کیا کسی سیاسی معاملہ میں یہ لوگ قومی امتیاز اور ترجیح ہم جنس کا طریقہ برتنے سے بچے ہوئے ہیں؟ بے شمار مثالوں کو چھوڑ کر میں صرف کانگریس کے حدود عمل سے چند کھلی ہوئی مثالیں پیش کرتا ہوں، اس لئے کہ یہی جماعت ہندوستانی قومیت کی مدعی ہے۔ اور اس لئے بھی کہ اس کے دائرے میں جو قومی امتیاز پایا جاتا ہے اس کا الزام برطانوی سامراج کے سر تھوپنے کی جرأت شائد پنڈت جواہر لال بھی نہیں کر سکتے۔

اسمبلی بہار اسمبلی ۹ اپریل ۱۹۳۸ء کو خود کانگریسی حکومت نے سوال نمبر ۶۶۹ کا جواب دیتے ہوئے اعتراف کیا کہ صوبہ بہار کی ۴۲ میونسپل کمیٹیوں میں مخلوط انتخاب کے ذریعہ سے ۹۹ نشستوں

میں سے ۱۴ نشستیں مسلمانوں کو ملیں اور ۱۵۲ ہندوؤں کو۔ درآنحالیکہ تناسب آبادی کے لحاظ سے کم ازکم ۴۲ نشستیں مسلمانوں کو ملنی چاہئے تھیں، کیونکہ ان میونسپلٹیوں کے حدود میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۲۳ فیصدی ہے۔ یہ تو انتخابی نشستوں کا حال تھا۔ خود اس کانگریسی حکومت نے نامزدگی سے جو نشستیں پُر کیں ان کے متعلق خود اس کا اپنا اعتراف ہے کہ ۷۵ فیصدی میں سے ۶۱ غیر مسلموں کو اور صرف ۱۴ مسلمانوں کو دی گئیں، حالانکہ تناسب آبادی کے لحاظ سے ۲۵ نشستیں مسلمانوں کو ملنی چاہئے تھیں (ملاحظہ ہو سوال نمبر ۲۷۰ کا جواب۔ مورخہ ۲۹ راپریل ۳۸ء)

۲۔ سی۔ پی کے ضلع بلڈانہ میں تعلقہ بورڈ کے ۲۷ حلقے ہیں اور ان میں سے کسی حلقہ میں بھی مخلوط انتخاب کے ذریعہ سے کوئی مسلمان منتخب نہ ہو سکا (ملاحظہ ہو قاضی سید محمود علی صاحب ملکاپوری کا خط مہاتما گاندھی کے نام۔ جو ۲۵ ستمبر ۳۸ء کے اخبار "مدینہ" میں شائع ہوا ہے۔)

۳۔ سی پی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ارکان کا جو انتخاب ہوا اس میں مخلوط انتخاب کی وجہ سے ایک مسلمان بھی منتخب نہ ہو سکا۔ اور نہ کسی اچھوت پر کانگریسی ہندوؤں کی نظر انتخاب پڑ سکی۔ (ملاحظہ ہو سی پی کے کانگریسی مسلمانوں کا شکایت نامہ۔ مدینہ ۲۸ رجولائی ۳۸ء)

۴۔ اسی صوبہ متوسط میں ایک درجن سے زیادہ میونسپل کمیٹیاں ایسی ہیں جن میں ایک مسلمان بھی مخلوط انتخاب کی وجہ سے منتخب نہیں ہوا۔ یہی حال اکثر لوکل اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کا ہے کہ وہ منتخب شدہ مسلمان نمائندوں سے بالکل خالی ہیں (ملاحظہ ہو مسٹر تاج الدین کا مراسلہ۔ اسٹار آف انڈیا مورخہ ۲ رجولائی ۳۸ء۔ نیز یہ خیال رہے کہ صاحب مراسلہ صوبہ متوسط کے مشہور نیشنلسٹ مسلمان ہیں)

۵۔ خود کانگریس ہائی کمانڈ انتخاب کے معاملہ میں جو ذہنیت رکھتی ہے اس کا حال کانگریسی صوبوں کی وزارتوں پر ایک نظر ڈالنے ہی سے کھل جاتا ہے۔ جن صوبوں میں ہندو اکثریت ہے وہاں ہندو وزیر اعظم ہیں اور جہاں مسلمان اکثریت ہے وہاں مسلمان کو وزیر انتخاب کیا گیا ہے۔ ہندو اکثریت کے کسی صوبہ میں کوئی کٹے سے کٹا وطن پرست بھی اسلامی نام سے موسوم ہونے اور اسلامی سوسائٹی کے

تعلق سے متہم ہونیکی بدولت وزارت عظمی پر بار نہ پا سکا۔ حتی کہ بیچارے ڈاکٹر سید محمود بھی اس شرف سے محروم رہے حالانکہ اگر ان کا نام محمود کے بجائے سنہا ہوتا تو یقیناً ان کی وطن پرستانہ خدمات ایسی تھیں کہ وہی وزیر اعظم بنائے جاتے۔ اس کے بعد وزیروں اور پارلیمنٹری سکرٹریوں کی فہرست اٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ زیادہ تر اسی تناسب آبادی کا لحاظ کیا گیا ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ صرف فرقہ پرست ہی اس کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ بلکہ بعض جگہ تناسب آبادی سے بھی کم مسلمان لئے گئے ہیں۔

کیا یہ کھلی ہوئی علامات اس امر کی نہیں ہیں کہ سیاسیات کے دائرے میں بھی خود متحدہ قومیت کے علمبرداروں کے ہاں قومی امتیاز اور ترجیح ہم جنس کی اسپرٹ پوری طرح موجود ہے؟ ایسی حالت میں واحد قومیت کے اصول پر جمہوری اسٹیٹ بنانے کے معنی اس کے سوا کیا ہو سکتے ہیں کہ جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں وہ ہندوؤں کو اور جہاں ہندو کثیر التعداد ہوں وہاں مسلمانوں کو اسٹیٹ کے کاروبار سے بے دخل کر دیں۔ اور چونکہ مجموعی طور پر ہندوؤں کی اکثریت ہے اس لئے وہ قومی اسٹیٹ کو ہندو قوم کا اسٹیٹ بنانے میں کامیاب ہو جائیں۔

ہم متحدہ قومیت کے اس سراسر جھوٹے دعوے پر جو قومی، جمہوری، لادینی اسٹیٹ بنایا جائیگا وہ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں مسلمانوں کے لئے تو بلاشبہ غیر مسلم اسٹیٹ ہوگا، مگر ہندوؤں کے لئے لازم نہیں کہ وہ غیر ہندو اسٹیٹ ہو، بلکہ اپنی اکثریت کے بل پر وہ اس کو ایک ہندو اسٹیٹ بنا سکتے ہیں، اور واقعات سے روز بروز عیاں ہوتا جا رہا ہے۔ کہ وہ ایسا ہی کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں اس کے لئے بھی میں صرف ایک صوبہ کے چند واقعات بطور نمونہ پیش کروں گا۔

۱۔ سی۔ پی کی کانگریسی حکومت کے تعلقہ بورڈ چاندور کا ہندو چیرمین ہم ۲ ستمبر ۳۸ئ کو تمام مدارس کے نام سرکلر (نمبر ۶ ۴ ۴) جاری کرتا ہے۔ جس میں حکم دیا جاتا ہے کہ ۲ اکتوبر کو مہاتما گاندھی کی سالگرہ کے دن بچے اور استاد سب مل کر ان کی پوجا کریں۔ یہ سرکلر بلا امتیاز ہندو مسلم سب مدارس کو سرکاری طور پر بھیجا جاتا ہے اور اس پر کوئی باز پرس نہیں ہوتی۔

۲- اسی صوبہ کی کانگریسی حکومت محکمۂ پولیس کے حکام کو (جن میں ہندو اور مسلمان سب شامل ہیں)، ہدایت نامہ بھیجتی ہے کہ جس جلسہ یا تقریب میں "بندے ماترم" کا گیت گایا جائے اور وہ وہاں موجود ہوں تو انہیں بھی عام حاضرین کے ساتھ قیام تعظیمی کرنا چاہئے۔ اس واقعہ کو خود وزیر اعظم نے اپنے ایک پریس نوٹ میں تسلیم کیا ہے (ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۱۷ جون ۳۸ء)

۳- ساگر (صوبہ متوسط) کی میونسپل کمیٹی کا صدر، مسلمان طلبہ کو تنبیہ کرتا ہے کہ اگر وہ بندے ماترم گانے میں شریک نہ ہوں گے تو انہیں مدرسے سے نکال دیا جائیگا۔ اس واقعہ کو بھی خود سی پی کے وزیر اعظم نے مذکورہ بالا پریس نوٹ میں تسلیم کیا ہے۔

۴- اسی صوبہ کے ایک سرکاری مدرسہ میں انجمن ترقی اردو کے نمائندے نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مسلمان بچے ہندو بچوں کے ساتھ سرسوتی کی پوجا کر رہے تھے، اور ان کو سلام کرنے کے بجائے ہاتھ جوڑ کر "جے رام جی کی" کہنا سکھا دیا گیا تھا۔ (ملاحظہ ہو مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو کا خط گاندھی جی کے نام۔ اخبار "پیام" مورخہ یکم ستمبر ۳۹ء)

۵- خود کانگریس کا نسٹی ٹیوشن میں برار کو اس کا مشہور و معروف نام چھوڑ کر "ودربھا" اور صوبہ متوسط کو "مہاکوشل" سے موسوم کیا گیا ہے۔ گویا کہ اب رامائن کا عہد ہندوستان میں واپس آ رہا ہے۔

۶- مسٹر شریف، وزیر صوبہ متوسط کا واقعہ ابھی سب کے حافظہ میں موجود ہے۔ انہوں نے ایک ایسے مسلمان کو رہا کر دیا تھا جسے ایک ہندو لڑکی کے ساتھ زنا کرنے کے الزام میں عدالت سے سزا ہوئی تھی۔ اس جرم کی پاداش میں کانگریس ہائی کمانڈ نے ان کو وزارت سے معزول کر دیا مگر فسادات جبل پور کے سلسلہ میں جو ہندو ملزمین ۱۴ مسلمانوں کے قتل کے الزام میں ماخوذ تھے، ان کو سی۔ پی کی ہندو وزارت نے حکماً رہا کر دیا اور اس ایڈمنسٹریشن کے ان دیوتاؤں کو جن سے ہائی کمانڈ مرکب ہے، کسی باز پرس کی ضرورت محسوس نہ ہوئی حال ہی میں ہوشنگ آباد کے ایک ہندو بالو نتھم کو جسے ایک جوان لڑکی کو زہر دے کر مار ڈالنے کی پاداش میں ہائیکورٹ سے سزائے موت کا حکم ہوا

تھا سی پی کے ہندو وزیر مسٹر ڈی۔ کے مہتا نے رہا کر دیا، اور اس پر بھی ہائی کمانڈ کو کسی تحقیقات اور کسی تادیبی کارروائی کا خیال نہ آیا۔

۷۔ اسی صوبہ میں محض اکثریت کے زور پر ودیا مندر اسکیم نافذ کی جارہی ہے۔ اور مسلمانوں کی متفقہ مخالفت کا استخفاف کرنے میں گاندھی اور شکلا اور ہائی کمانڈ سب متفق ہیں۔

ان واقعات کے علاوہ بہار، یو۔پی مدراس اور سی۔پی میں قربانی گاؤ کو حکماً بند کرنے، اور ہندی کو "ہندوستانی" کے پرفریب نام کی آڑ میں بزور رائج کرنے، اور زبان سے عربی و فارسی زبان زد عام الفاظ کو نکال کر نئے غیر مانوس الفاظ گھڑنے، اور سرکاری ملازمتوں میں کھلم کھلا امتیاز برتنے کے واقعات اس قدر کثیر ہیں کہ ان سب کو یہاں نقل کرنا موجب تطویل ہوگا۔ جو کچھ ہمیں ثابت کرنا تھا اس کے لئے مذکورۂ بالا شواہد کافی ہیں۔

اب ہر شخص خود دیکھ کر فیصلہ کر سکتا ہے کہ جس "جنگ آزادی" کی منزل مقصود مسلمانوں کے قومی مفاد بلکہ ان کی قومی ہستی ہی سے منافات کی نسبت رکھتی ہو اس میں کوئی مسلمان کس طرح حصہ لے سکتا ہے۔ مسلمانوں کو آخر اتنا بے وقوف کیوں فرض کیا گیا ہے کہ وہ اس نوعیت کے اسٹیٹ کو خود اپنے سر پر مسلط کرنے کے لئے جنگ کریں گے؟ کہیں وہ لوگ خود ہی تو عقل باختہ و ہوش ربودہ نہیں ہو گئے ہیں جو ایک قوم سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ جانتے بوجھتے اپنی قبر آپ کھودنے میں جانفشانی دکھائے گی؟۔

# بنیادی حقوق

کہا جاتا ہے کہ اس قومی، جمہوری، لادینی اسٹیٹ میں مسلمانوں کے مفاد کی حفاظت کے لئے وہ بنیادی حقوق ( Fundamental rights ) بالکل کافی ہوں گے جن کا اعلان کراچی کانگریس میں کیا گیا تھا۔ مگر کیا یہ حقیقت ہے؟

بنیادی حقوق کا ماخذ ۱۶۸۹ء کا اعلان اہلِ انگلستان ہے جسے ایک طویل نزاع اور کشمکش کے بعد رعایا کے نمائندوں کی ایک مجلس ( Convention ) نے وضع کیا تھا۔ تاکہ حکومت کے مستبدانہ افعال کی روک تھام کی جائے۔ اور حکومت و رعیت کے درمیان کچھ حدود معین کر دیئے جائیں جنہیں توڑا نہ جا سکے۔ اس کے بعد امریکہ کے "اعلان آزادی" اور "اعلان حقوق انسانی" میں انہیں حقوق کو بطور اصولِ عامہ کے درج کیا گیا پھر ۱۸۳۱ء کے دستور نامہ بلجیم میں ان کو شامل کیا گیا، اور اس کے بعد سے یہ گویا ایک قاعدہ سا بن گیا ہے کہ ہر دستور میں باشندوں کے ان حقوق کی تصریح کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ جدید زمانہ کا کوئی دستور ان سے خالی نہیں ہوتا بلکہ ہر بعد کے دستور میں چند حقوق کا اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ خلاصہ ان سب کا یہ ہے کہ وہ قانون کی نگاہ میں سب باشندے مساوی ہیں۔ کسی شخص کو کسی قسم کی سزا نہیں دی جا سکتی بجز اس کے کہ وہ قانون کی خلاف ورزی نہ کرے، اور سزا قانون ہی کے مطابق دی جا سکتی ہے حکومت رعایا کی شخصی آزادی اور جائداد میں صرف قانون ہی کے ذریعہ سے مداخلت کر سکتی ہے۔ تقریر اور نشر و اشاعت کی عام آزادی ہوگی۔ بشرطیکہ وہ قانون تذف ( Law of Libel ) کے خلاف نہ ہو۔ ڈاک اور تار کے پیغامات میں رازداری قائم رکھی جائے گی۔ باشندوں کو اجتماع کا حق حاصل ہوگا۔ بشرطیکہ غیر مسلح ہوں اور امن عام کو نقصان نہ پہنچائیں۔ انتخابات آزاد ہوں گے۔

پارلیمنٹ کے ارکان بازپرس سے محفوظ رہیں گے۔ ان کو گرفتار نہیں کیا جا سکتا الّا یہ کہ کوئی ممبر قانون کی خلاف ورزی کرتا ہوا پکڑا جائے۔ ان کے علاوہ جدید زمانہ کے دستوروں میں جن باتوں کا اضافہ کیا گیا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ عورت اور مرد مساوی ہیں یہ حقوق دراصل اس لئے وضع کئے گئے تھے کہ جب کبھی حکومت اپنی حدود سے تجاوز کرنے لگے تو رعایا کے پاس اپنی آزادی اور اپنے ذاتی حدود کی حفاظت کے لئے کوئی قانونی بنیاد رہے جس کی بنا پر وہ حکومت سے اپنے حقوق کا مطالبہ کر سکے، یا اگر حکومت نہ مانے اور رعایا کو لڑنا پڑے تو حکومت کا اخلاقی پہلو کمزور ہو۔ لیکن اوّل تو زمانۂ حال میں سیاسی تصورات کے انقلاب نے حکومت اور رعایا کے درمیان ہر اس حد بندی کو توڑ دیا ہے جس کا خیال کیا جا سکتا ہے، حتیٰ کہ اب یہ بتانا قریب قریب محال ہو گیا ہے کہ حکومت کے حدود کہاں جا کر ختم ہوتے ہیں۔ اور افراد و رعیت کے حدود کہاں سے شروع ہوتے ہیں۔ ثانیاً یہ اعلان حقوق صرف اس صورت میں کام آ سکتا ہے جب کہ جمہور قوم کی مرضی کے خلاف حکومت کی طرف سے کوئی ناروا مداخلت ہو اور باشندوں کی ایک کثیر تعداد اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے کھڑی ہو جائے مگر جہاں اکثریت کی حکومت ہو اور وہ اقلیت کے حقوق میں مداخلت کرے وہاں یہ اعلان حقوق قطعی بیکار ثابت ہوتا ہے۔ ثالثاً کراچی کے ریزولیوشن میں جن بنیادی حقوق کا ذکر کیا گیا ہے ان کا تجزیہ کر کے دیکھئے تو معلوم ہو جائے گا۔ کہ وہ بجائے خود بھی ہمارے کسی مرض کی دوا نہیں۔

ان تینوں نکات کی مختصر تشریح ضروری ہے تاکہ عام ناظرین اس اہم بحث کو بآسانی سمجھ سکیں۔

—— ۱ ——

حکومت کے حدود عمل کیا ہیں؟ اس باب میں دنیا کے نظریات اور عملیات اٹھارویں اور انیسویں صدی میں جو کچھ تھے، آج ان سے بالکل مختلف ہیں۔ اٹھارویں صدی میں شخصی حکومتوں کا دور دورہ تھا۔ اور لوگ ان کے استبداد سے نجات حاصل کرنے کے جدوجہد کر رہے تھے۔ اسی

لوگوں کے ذہن پر حکومت اور ریئیت کے تعلق کا مشینی نظریہ (Mechanical Theory)
مستولی تھا، یعنی ان کا تصور یہ تھا کہ افراد کا مجموعہ ایک الگ چیز ہے اور اسٹیٹ ایک دوسری چیز
اور ان دونوں میں باہم کچھ اس طور پر معاملہ ہوتا ہے جیسے بائع اور مشتری یا اجیر اور مستاجر کے درمیان
ہوا کرتا ہے۔ اسی خیال نے اسٹیٹ کے حدود عمل کا انفرادی نظریہ (Individualism)
پیدا کیا۔ جس کا منشا یہ ہے کہ اصل چیز فرد کی آزادی ہے، اسی کی حفاظت کے لئے فرد اس معاہدۂ
عمرانی میں (Social Contract) شریک ہوتا ہے جس کی بدولت اسٹیٹ وجود میں
آیا ہے۔ لہٰذا اسٹیٹ کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ افراد کی شخصی آزادی کی حفاظت کرے اور
ایک فرد کی آزادی میں دوسرے کی مداخلت کو روکے، جان و مال کی حفاظت، امن قائم کرنا،
انصاف کرنا، اور حدود مملکت کو بیرونی حملوں سے بچانا، بس یہ اس کے فرائض ہیں۔ ان حدود سے
آگے بڑھ کر اشخاص کے ذاتی معاملات میں مداخلت کرنا، خواہ وہ اشخاص کی بھلائی ہی کے لئے ہو
اور کیسی ہی نیک نیتی کے ساتھ ہو۔ بہر حال ناجائز ہے، اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی
کے آغاز میں یہ عام خیال تھا اور اسی بنا پر بعض علمائے سیاست نے ان کاموں کی ایک فہرست
بھی بنادی تھی جو حکومت کے دائرہ عمل میں آسکتے ہیں۔

یہ تخیلات اس زمانے میں بھی قائم رہے، اور کافی مدت تک چلتے رہے جب شخصی حکومتوں
کی جگہ جمہوری حکومتیں لے رہی تھیں۔ مدتوں تک لوگوں کو محسوس نہ ہو سکا کہ جمہوریت اور دائرہ حکومت
کی حد بندی دونوں باہم متضاد ہیں۔ جب سوسائٹی خود اسٹیٹ بناتی ہے، تو وہ اپنے اوپر خود کس
طرح پابندی عائد کر سکتی ہے، اور اس کو اپنے اوپر پابندی عائد کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟
وہ اسٹیٹ کو اسی لئے تو وجود میں لاتی ہے کہ جبر و زور اور تنظیم کی طاقت سے اپنی اجتماعی ضروریات
کو پورا کرے۔ جن کے لئے تنظیمی طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر آخر کونسی معقول وجہ ہے کہ
وہ اس تنظیمی طاقت کے استعمال کو اپنی بعض ضروریات کے لئے جائز اور بعض کے لئے ناجائز ٹھہرائے؟
اس حد بندی کی ضرورت تو اس وقت تھی جب حکومت سوسائٹی سے بالکل الگ ایک چیز ہوتی

تھی اور کہیں اوپر سے آکر مسلط ہو جایا کرتی تھی، مگر جب خود سوسائٹی ہی سے حکومت پیدا ہو تو ایسی صورت میں اس حد بندی کی کیا حاجت؟

فرد، سوسائٹی اور اسٹیٹ کو ایک زندہ نظام جسمانی کی طرح سمجھنے کا تخیل (Organic Theory of State and Society) جمہوری افکار کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ برابر ترقی کرتا چلا گیا، اور سوشلزم نے آکر اسے پایۂ تکمیل کو پہنچا دیا۔ اب دنیا میں ہر جگہ حکومت کے دائرۂ عمل کی حدیں ٹوٹ کر پوری اجتماعی زندگی پر پھیل رہی ہیں، تمدن، معاشرت اور معیشت کی جڑوں تک میں اتر تی جا رہی ہیں، اور جزئی سے جزئی معاملات تک کو اپنی لپیٹ میں لیتی چلی جاتی ہیں۔ باشندوں کی روٹی کا بندوبست کرنا، ان کے لئے کام مہیا کرنا، ان کے معیار زندگی کو بلند کرنا، اور ان کے لئے زیادہ سے زیادہ آسائش بہم پہنچانا، یہ ہیں اب حکومت کے فرائض۔ ان فرائض کو انجام دینے کے لئے وہ ملک کے معاشی ذرائع کو زیادہ سے زیادہ بہتر طریقہ سے استعمال کرنے پر مجبور ہے، اور اس طرح گویا پوری معاشی زندگی اپنے صنعتی اور تجارتی اور مالی شعبوں سمیت حکومت کے دائرے میں آجاتی ہے۔ پھر وہ اپنے ان فرائض کی انجام دہی کے لئے تعلیم کا بھی پورا انتظام اپنے ہاتھ میں لینے پر مجبور ہے تاکہ باشندوں کو ان اغراض کے لئے کار آمد بنا سکے۔ مزید برآں ان فرائض کی بجا آوری میں یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ افراد یا افراد کے مختلف مجموعوں کی شخصی آزادی یا ان کی انفرادی خواہشات، یا ان کے مخصوص حقوق کا ہر حال میں لحاظ کیا جا سکے۔ ان سب چیزوں کا صرف اسی حد تک خیال رکھا جا سکتا ہے اور اسی شرط کے ساتھ رکھا جا سکتا ہے کہ وہ حکومت کے فرائض کی ادائیگی میں حارج نہ ہوں۔ جہاں وہ حائل ہوں گے وہاں ان کی انفرادیت کو پامال کر دیا جائیگا۔ اب یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص یا کوئی گروہ اس فیصلہ میں خود مختار ہو کہ اپنے بچوں کو کس قسم کی تعلیم دلائے۔ یہ حکومت کا کام ہے کہ اجتماعی فلاح کے نقطۂ نظر سے جس طرح مناسب سمجھے ان کو تیار کرے۔ تمدنی اور معاشرتی معاملات میں بھی اب انفرادی آزادی کا حق مسلّم نہیں ہے۔ حکومت اجتماعی فلاح کے لئے تمدن و معاشرت میں جس قسم کا تغیر ضروری سمجھے کر سکتی ہے، حتیٰ کہ وہ یہ بھی کہہ سکتی ہے کہ فلاں طرز کا لباس پہنو اور

فلاں طرز کا لباس نہ پہنو۔ فلاں رسم الخط استعمال کرو اور فلاں کو چھوڑ دو۔ اس عمر میں شادی کرو اور اس عمر میں نہ کرو۔ وعلیٰ ہذا۔ اسی طرح جبکہ وہ باشندوں کی معاشی فلاح و ترقی کی ذمہ دار ہے تو وہ تجارت، صنعت و حرفت، زراعت اور اموال و املاک کے باب میں بھی لوگوں کے شخصی حقوق کی رعایت ہمیشہ ملحوظ نہیں رکھ سکتی۔ وہ مجبور ہے کہ معیشت کی پوری مشین کو اجتماعی مقصد کے مطابق چلائے اور جو شخصی حقوق اس راہ میں حائل ہوں انہیں پامال کر دے۔ چنانچہ جنگ عظیم کے بعد جتنے جمہوری دساتیر بنائے گئے ہیں، قریب قریب ان سب میں اس قسم کی دفعات رکھی گئی ہیں جن کی بنا پر حکومت کو شخصی املاک اور شخصی کاروبار میں دخل دینے کے نہایت وسیع اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً تاجر کے مال کو جبراً فروخت کرا دینا۔ شخصی املاک پر معاوضہ یا بلا معاوضہ قبضہ کر لینا[1]۔ باشندوں کی سکونت یا نو آبادکاری یا ترقی زراعت کے لئے اگر ضرورت ہو تو زمینوں کو بلا معاوضہ ضبط کر لینا[2]۔ موروثی جائداد اگر ایک حد خاص سے زیادہ ہو تو اسے چھین کر تقسیم کر دینا[3]۔ وراثت میں اسٹیٹ کا حصہ مقرر کرنا[4]۔ حتیٰ کہ پرائیویٹ کاروبار کی تنظیم اور مراسلت و مخابرت میں بھی مداخلت کرنا اگر اجتماعی مفاد کے لئے اس کی حاجت ہو[5]۔

حکومت کے دائرے کی اس وسعت اور لامحدودیت نے اوّل تو بنیادی حقوق کو محض بے معنی بنا دیا ہے۔ کیونکہ جن حقوق کو انسان کے بنیادی اور پیدائشی حقوق کہا جاتا ہے، ان سب کو آج کی حکومت اجتماعی فلاح کے نام سے سلب کر سکتی ہے۔ دوسری اور زیادہ اہم بات یہ ہے کہ جمہوری نظام میں حکومت کے قوانین بنانے اور نافذ کرنے والی چیز اکثریت ہوتی ہے، اور فیصلہ کرنا بھی اکثریت کا

---

[1] دستور جرمنی دفعہ ۱۵۳ اپارہ دوم۔ دستور پولینڈ دفعہ ۹۹۔ دستور چیکوسلوواکیا دفعہ ۱۰۹۔

[2] ایضاً دفعہ ۱۵۵

[3] دستور یوگوسلیویا دفعہ ۳۴۔ اسٹھونیا۔ لیتھونیا اور لتھوانیا میں بھی اس مضمون کے قوانین پاس کئے گئے ہیں۔

[4] دستور جرمنی دفعہ ۱۵۴۔ دستور یوگوسلیویا دفعہ ۳۹۔

[5] دستور یوگوسلیویا دفعہ ۲۵۔

کام ہوتا ہے کہ اجتماعی فلاح کیا ہے اور اس کا تقاضا کیا ہے۔ لہٰذا اب اکثریت کے ظلم و جور اور استبداد کی کوئی حد نہیں رہ جاتی۔ اقلیت کی پوری زندگی کے دروازے اس کی قاہرانہ مداخلت کے لئے کھل جاتے ہیں، وہ اس کے تمدن، اس کی معیشت و معاشرت اور اس کے مذہبی قوانین میں اجتماعی مفاد کے نام سے جس طرح اور جتنی چاہے مداخلت کر سکتی ہے، اور تعلیم کے نظام کو اپنے ہاتھ میں لیکر اس کی قومیت کو بالکل مٹا دینے کی بھی کوشش کر سکتی ہے۔

(۲)

بنیادی حقوق اگر کسی حد تک کام آ سکتے ہیں۔ تو صرف اس صورت میں جبکہ باشندگان ملک کی بڑی اکثریت ان کی حفاظت کا ارادہ رکھتی ہو اور اتفاقاً کوئی ایسی گورنمنٹ ملک پر مسلط ہو گئی ہو جو ان حقوق کو سلب کرنا چاہتی ہو۔ رہی یہ صورت کہ خود وہ اکثریت ہی ظلم پر اتر آئے جو حکومت جمہوریہ کو چلا رہی ہو، تو ایسی صورت میں بنیادی حقوق کی کوئی لمبی سے لمبی فہرست بھی اقلیت کے کام نہیں آ سکتی۔

خود برطانیہ عظمیٰ کی مثال لے لیجئے جہاں سے ان بنیادی حقوق کی ابتدا ہوئی ہے۔ ۱۸۲۸ء تک وہاں پارلیمنٹ اور مجالس بلدیہ اور سرکاری ملازمتوں میں داخل ہونے کے لئے چرچ آف انگلینڈ کے طریقہ پر عشائے ربانی لینا لازم تھا۔ ۱۸۲۹ء تک کیتھولکس ہر قسم کی نمائندگی سے محروم تھے۔ ۱۸۶۷ء تک یہودی پارلیمنٹ میں نہ جا سکتے تھے۔ ۱۸۵۴ء تک آکسفورڈ اور کیمبرج کے دروازے ان لوگوں کے لئے بند تھے جو پروٹسٹنٹ مذہب کے ۳۹ اصولوں پر ایمان نہ لاتے ہوں۔ اور ۱۸۷۱ء تک ان دونوں یونیورسٹیوں میں ایسے کسی شخص کو کسی قسم کا عہدہ یا امتیاز یا وظیفہ تعلیمی نہ مل سکتا تھا۔ ۱۸۸۱ء تک چرچ آف انگلینڈ کی پیروی نہ کرنے والوں کے لئے دفن اموات کے بارے میں طرح طرح کے قیود موجود تھیں۔ ۱۸۸۸ء تک عدالت میں شہادت دینے والوں کے لئے حلف کی نادر قیود پائی جاتی تھیں۔ اور آئرلینڈ کی اقلیت کے ساتھ تو ۱۹۲۰ء تک جو کچھ ہوتا رہا وہ ساری دنیا پر عیاں ہے۔

ممالک متحدہ امریکہ کی مثال اس سے بھی زیادہ سبق آموز ہے۔ وہاں ایک کروڑ ۲۰ لاکھ حبشی آباد ہیں جن کا تناسب کل آبادی میں ۹ فیصدی سے کچھ زیادہ ہے۔ دستور کی رُو سے ان کو سفید فام امریکیوں کے برابر پورے شہری حقوق حاصل ہیں جمہوری دولت مشترکہ میں وہ بھی برابر کے حصہ دار ہیں اور قانون میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کی بنا پر سفید فام اور سیاہ فام میں امتیاز کیا جا سکتا ہو۔ مگر عملاً کیا ہو رہا ہے؟ سفید فاموں کی اکثریت ان کے ساتھ کھلم کھلا امتیازی برتاؤ کر رہی ہے شہری حقوق تو درکنار ان کے معمولی انسانی حقوق تک علانیہ سلب کئے جا رہے ہیں اور دستور کے عطا کردہ بنیادی حقوق ان کے کسی کام نہیں آتے۔ سفید فاموں کے کلیساؤں میں وہ گھس نہیں سکتے۔ ان کے ہوٹلوں، ریستوران اور تھیٹروں میں وہ قدم نہیں رکھ سکتے۔ ان کی تفریح گاہوں میں کوئی حبشی اگر چلا جاتا ہے تو سخت ذلت کے ساتھ نکالا جاتا ہے۔ موٹر بسوں اور ریل کے ڈبوں میں بھی سفید فام کے ساتھ حبشی کا بیٹھنا جائز نہیں رکھا جاتا سفید فاموں کے محلوں میں کوئی حبشی مکان نہیں لے سکتا۔ ان کے بچوں کے ساتھ حبشی کا بچہ ایک مدرسہ میں بیٹھ نہیں سکتا۔ ان کی جان، مال، عزت، آبرو کسی چیز کی کوئی قیمت نہیں۔ حتیٰ کہ ان کے ساتھ انتہائی وحشیانہ برتاؤ کرنے سے بھی مہذب گوروں کا ضمیر اِبا نہیں کرتا۔ اور بہت ہی کم کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی حبشی کی خاطر کسی گورے کے خلاف قانون کی مشین حرکت میں آتی ہو۔

یہاں اس برتاؤ کی تفصیلات بیان کرنے کا موقع نہیں جو امریکہ کی اکثریت حبشی اقلیت کے ساتھ کر رہی ہے۔ مگر میں اختصار کے ساتھ یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ جہاں اکثریت اور اقلیت کو نسل یا رنگ یا مذہب یا کسی اور چیز نے حقیقتہً ایک دوسرے سے جدا کر رکھا ہو وہاں اکثریت کی حکومت کیا رنگ ڈھنگ اختیار کرتی ہے اور دستور اور اس کے بنیادی حقوق اور قانون اور اس کی کاغذی دفعات کا کیا حشر ہوا کرتا ہے۔

امریکہ میں حبشیوں کے متعلق بغیر کسی سائنٹفک بنیاد کے یہ نظریہ قائم کیا گیا تھا کہ حیاتی نقطۂ نظر سے (Biologically) وہ تعلیم کے لئے نا اہل ہیں اور عمرانی نقطۂ نظر سے (Socially)

ان کو تعلیم دینا انہیں ناکارہ بنا دینا ہے۔ یعنی پھر وہ خدمتگار بننے کے بجائے برابر والے بننے لگیں گے۔ اس بنا پر بعض ریاستوں میں انہیں تعلیم دینا حکماً ممنوع تھا اور بعض ریاستوں میں اسے برا سمجھا جاتا تھا۔ کئی سال تک حبشی خود اپنی کوششوں سے اپنے روپے سے مدارس قائم کرتے اور اپنے بچوں کو تعلیم دلواتے رہے۔ یہاں تک کہ جب انہوں نے اپنی دماغی قابلیت دنیا پر ثابت کر دی تب ۱۹۰۵ء سے ان کے مدارس کو سرکاری امداد ملنے کا سلسلہ شروع ہوا۔

قانون کی نگاہ میں حبشی اور سفید امریکن عملاً برابر نہیں ہیں اگرچہ لفظاً برابر ہیں حبشی کے لئے قید کی مدت ہمیشہ زیادہ رکھی جاتی ہے۔ ۱۹۱۰ء کے اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ حبشیوں کو اوسطاً ۷ مہینہ اور سفید فاموں کو اوسطاً ۵ مہینہ کی سزائیں دی گئیں۔ آبادی میں تو حبشیوں کا تناسب ۹ فیصدی ہے مگر جیل خانوں کی آبادی میں ان کا تناسب ۳۱ فیصدی۔

| سنہ | | حبشی قیدی فی لاکھ آبادی میں | | سفید فام |
|---|---|---|---|---|
| ۱۸۸۰ء | میں حبشی قیدی فی لاکھ آبادی میں | ۲۴۴ | تھے اور سفید فام | ۹۶ |
| ۱۸۹۰ء | " " " " | ۲۶۴ | " " " " | ۸۴ |
| ۱۹۰۴ء | " " " " | ۲۷۸ | " " " " | ۷۷ |
| ۱۹۱۰ء | " " " " | ۲۸۴ | " " " " | ۸۹ |
| ۱۹۲۳ء | " " " " | ۳۲۷ | " " " " | ۷۷ |

اسی طرح سفید فاموں کی تعداد تو جیل خانوں کی آبادی میں برابر کم ہوتی جا رہی ہے۔ مگر حبشیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ حبشی زیادہ جرائم کرتے ہیں۔ شکاگو میں ایک کمیشن نسلی تعلقات کی تحقیق کے لئے مقرر کیا گیا تھا جو Chicago Commission of Racial Relations کے نام سے مشہور ہے[2]۔ اس کمیشن کے سامنے ایک جج نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ جس شہادت کو جیوری ایک حبشی کو مجرم قرار دینے کے لئے کافی سمجھتی ہے۔ وہی

---

[1] Encyclopaedia Britannica
Article: Negros in America

[2] اس کمیشن کی رپورٹ Negros in Chicago کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

شہادت ایک سفید فام کو سزا دینے کے لئے ناکافی سمجھی جاتی ہے" ایک دوسرے جج نے کہا کہ" ایک ہی طرح کے حالات اور واقعات میں سیاہ فام کو سزا دینا آسان ہے اور سفید فام کو سزا دینا مشکل۔ حبشیوں اور سفید فاموں کے فسادات میں پولیس تمام تر حبشیوں کو پکڑتی ہے اور سفید فام پر شاذ و نادر ہی ہاتھ ڈالا جاتا ہے" شکاگو کمیشن اپنی تحقیقات کے نتائج بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"تمام شہادتیں قریب قریب متفق ہیں کہ حبشی بہ نسبت سفید فاموں کے زیادہ پکڑے جاتے ہیں، کیونکہ پولیس کا عام مفروضہ یہ ہے کہ حبشی زیادہ جرائم پیشہ ہوتے ہیں۔ اور پولیس یہ بھی جانتی ہے کہ حبشی کو گرفتار کر لینے میں کوئی خطرہ نہیں، رہا سفید فام تو اس پر ذرا احتیاط ہی سے ہاتھ ڈالنا چاہئے۔۔۔ ایک ایک جرم میں بہت سے حبشی پکڑ لئے جاتے ہیں، لہٰذا محض قیدخانوں میں حبشیوں کی آبادی زیادہ دیکھ کر یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ زیادہ جرم کرتے ہیں۔ سفید فاموں کی بہ نسبت حبشی کم ہی گرفتاری سے بچ سکتا ہے"

یہ تو قانون کا حال ہوا۔ اور وہ اکثریت جو جمہوری نظام کو چلا رہی ہے، اس کا کیا حال ہے؟ حق رائے دہی پر عملاً ایسی پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں کہ حبشیوں کی ایک بڑی تعداد شہری (Citizen) ہونے کے باوجود خود بخود ووٹ دینے کے حق سے محروم ہو جاتی ہے۔ سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان کے لئے گویا بند ہیں۔ آج تک کوئی حبشی کسی ذمہ داری کے منصب پر فائز نہ ہو سکا۔ البتہ جنگ میں توپوں کا ایندھن بننے کے لئے وہ ضرور بھیج دیئے گئے تھے۔ اور اب بھی اس کام کے لئے تیار کئے جا رہے ہیں۔

عامۃ الناس ان کو صرف ملیچھ ہی نہیں سمجھتے بلکہ بات بات پر فساد ہوتے ہیں اور ان کو نہایت بیدردی سے قتل کیا جاتا ہے۔ ۱۹۱۹ء کا واقعہ ہے، کہ شکاگو میں یکایک افواہ اڑی کہ کسی حبشی نے ایک اٹالین لڑکی کو مار ڈالا ہے۔ اس پر سفید فام لوگوں کا ایک مجمع اکٹھا ہو گیا اور اس نے ایک راہ چلتے حبشی پر حملہ کر دیا۔ کارونر کی عدالت میں جب اس کی لاش پیش

ہوتی۔ ۱۴ گولیاں اس کے جسم سے نکلیں، کھوپری چور چور پائی گئی اور پسلیوں کے ٹکڑے ہو چکے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اٹالین لڑکی کے واقعہ کی کوئی اصلیت نہ تھی۔ پریذیڈنٹ ولسن جب پیرس میں بیٹھے ہوئے جرمنوں کے مظالم پر محاکمہ فرما رہے تھے اس وقت شکاگو میں ایک حبشی زندہ آگ پر بھونا جا رہا تھا۔ امریکہ میں انصاف کا ایک نرالا طریقہ رائج ہے جسے لنش کرنا (Lynching) کہتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عوام جب عدالت کے فیصلہ سے مطمئن نہ ہوں یا قانون کی سست رفتار مشین کو آہستہ چلتے دیکھکر صبر نہ کر سکیں تو قانون کو خود اپنے ہاتھ میں لے لیں اور جس شخص کو وہ مجرم سمجھتے ہوں اسے اپنے نزدیک جو منصفانہ سزا چاہیں دے دیں۔ اس طریق انصاف کا وار عموماً حبشیوں پر ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ "نیویارک ورلڈ" نے ۱۸۸۵ء سے ۱۹۲۶ء تک کے جو اعداد شمار شائع کئے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۴۱ سال کی مدت میں ۳۲۰۵ حبشی برسر عام لنش کئے گئے۔ لنشنگ عموماً اس قصور میں ہوتا ہے کہ کسی گوری عورت سے کسی حبشی کا تعلق پایا جائے یا ایسے تعلق کا شبہ کیا جائے۔ لیکن سفید فام امریکن کا ضمیر صرف اسی وقت آمادہ شورش ہوتا ہے جب کالا مرد گوری عورت کے پاس پایا جائے۔ رہی کالی عورت تو اس پر گوروں کے پیدائشی حقوق ہیں۔ حبشی کے متعلق عام رائے گورے صاحبان کی یہ ہے کہ وہ وحشی جانور (Brute) ہوتا ہے۔ اس کا معیار اخلاق بہت پست ہوتا ہے، بلکہ اس میں اخلاقی احساس ہوتا ہی نہیں۔ عورتوں اور بچوں پر حملہ آور ہونا اور بد معاشی کرنا اس کی سرشت میں داخل ہے۔ گویا ہمارے ملک کے ہندو اخبارات کی زبان میں وہ ایک "پیدائشی غنڈا" ہوتا ہے۔ لیکن شکاگو کمیشن نے باقاعدہ تحقیقات کر کے ثابت کیا ہے کہ حبشی کا معیار اخلاق صاحب لوگوں سے بہت بلند ہوتا ہے اور صاحب لوگ خود اپنی قوم کی عورتوں پر حملہ کرنے میں جس قدر بیباک ہیں حبشی غریب اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ شاذ و نادر ہی حبشی سے جب یہ قصور ہو جاتا ہے۔ (اور وہ بھی زیادہ تر میم صاحبات ہی کی دعوت اور اشتعال کا نتیجہ ہوتا ہے) تو صاحب لوگوں میں اس پر شور مچ جایا کرتا ہے۔ اور یہی حبشی کے بدنام ہونے کی اصلی وجہ ہے۔ کمیشن کے سامنے ایک جج نے بیان دیتے ہوئے کہا کہ

نابالغ لڑکیوں کے ساتھ زنا بالجبر کرنے والا حبشی تو میری عدالت میں کبھی آیا ہی نہیں۔ البتہ سفید فام بہت سے آئے۔ ایک دوسرے جج نے بیان کیا۔ کہ میری کل مدت ملازمت میں صرف ایک حبشی اس جرم میں ماخوذ ہو کر آیا ہے۔ حالانکہ سفید فام اکثر پکڑے ہوئے آتے ہیں۔

۱۸۶۵ء سے امریکہ میں ایک خفیہ جماعت کام کر رہی ہے، جس کا نام کو کلکس کلان ( Ku Klux Klan ) ہے اس کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ سیاہ قاموں پر سفید فاموں کے تفوق کی حفاظت کی جائے اور امریکہ میں کالی نسل کے مسئلہ ( Negros Problem ) کو اس طرح حل کیا جائے کہ ریڈ انڈین قوم کی طرح یہ قوم بھی رفتہ رفتہ فنا[1] ہو جائے۔ یہ امریکہ کی سب سے زیادہ پر طاقتور منظم سوسائٹی ہے۔ جس کے ارکان کی تعداد ۱۹۲۱ء میں پندرہ لاکھ تھی۔ ملک کے اعلیٰ تعلیم یافتہ، اونچی سوسائٹی والے اور حکومت کے حلقوں سے قریبی تعلق رکھنے والے لوگ اس میں شریک ہیں صوبوں کے گورنر، پولیس اور جیل اور عدالت کے حکام تک ان سے ساز باز رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ بڑے بڑے ہولناک جرائم کر جاتے ہیں اور کبھی نہیں پکڑے جاتے جیل کی کوٹھڑیوں تک سے قیدیوں کو نکال لے جاتے ہیں اور قانون کی مشین ساکت و صامت کھڑی رہتی ہے

رجوہ Comus کا مصنف لکھتا ہے کہ وہی مہذب و شائستہ جنٹلمین جس سے آپ بیٹھے گفتگو کر رہے ہیں، ہو سکتا ہے کہ رات کو وہ جنگل میں کسی آدمی کو قتل کر کے آیا ہو اور اس کے ساتھ اس جرم میں بہت سے وہ لوگ شریک ہوں جنہیں آپ دن کے وقت نہایت عزت و افتخار سے ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں، چند ہولناک جرائم کے سلسلہ میں ریاست ٹیکساس ( Texas ) کے گورنر نے تحقیقات کرائی تو پتہ چلا کہ مجرموں میں ایک تو پادری صاحب تھے اور متعدد ایسے لوگ تھے۔ جو خود گورنر صاحب کے احباب سے تعلق رکھتے تھے۔

[1] ۱۹۰۰ء سے اب تک امریکہ کی گوری نسل میں ۱۳ سو فیصدی اضافہ ہوا ہے، اور ریڈ انڈین نسل کی آبادی میں ۵۰ فیصدی کمی ہوئی ہے۔ اور توقع کی جاتی ہے کہ اس صدی کے خاتمہ تک ایک بھی ریڈ انڈین باقی نہ رہے گا۔ یہ وہ قوم ہے جو سفید فاموں سے پہلے اس ملک میں آباد تھی۔

یہ مہذب لوگ حبشیوں کے مسئلہ کو کس طرح حل کر رہے ہیں؟ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:- ایک حبشن کو مارتے مارتے بیہوش کر دیا اور ننگا کر کے جنگل میں چھوڑ آئے تاکہ سردی سے مر جائے۔ ایک حبشی کی ہنٹروں سے کھال ادھیڑ دی۔ یہاں تک کہ مجبور ہو کر اس نے اپنی زمین کم قیمت پر ایک سفید فام شخص کے ہاتھ بیچ دی۔ ایک حبشی کو پکڑ کر جنگل لے گئے۔ رسیوں اور خار دار تاروں سے اسے باندھا ہنٹر مار مار کر اس کی کھال ادھیڑی پھر اس کے زخموں پر کربانڈوٹ چھڑک کر چل دیئے۔ اور وہ گھنٹوں تڑپ تڑپ کر مرا۔ ایک حبشن اور اس کے لڑکے کو پکڑے گئے۔ اور دونوں کو ایک ریل کے پل سے باندھ دیا۔ ایک غریب کو ہسپتال سے اٹھائے گئے اور اس کو زندہ آگ پر بھون ڈالا۔ ایک بیچارے کو ٹیلیفون کے کھمبے سے باندھا اور مٹی کا تیل چھڑک کر آگ لگا دی۔[1] حبشی کا سب سے بڑا قصور جسے معاف نہیں کیا جا سکتا، یہ ہے۔ کہ وہ سفید فام آبادی میں یا اس کے قریب جائداد رکھتا ہو، یا سکونت اختیار کرے۔ ۱۹۱۷ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان صرف شہر شکاگو میں ۵۸ مرتبہ ایسے مکانات کو بم سے اڑایا گیا جو حبشیوں نے خریدے تھے یا جو کسی سفید فام نے حبشی کو کرایہ پر دیئے تھے ایک حبشی بینکر ( Binga ) کے مکان اور دفتر پر، ایک سال کے اندر ۶ مرتبہ بم پھینکا گیا۔ صرف اس قصور میں کہ وہ حبشیوں کے لئے مالی تقویت کا موجب بن گیا ہے۔ اس کے بینک سے حبشیوں کو اچھی شرائط پر روپیہ مل جاتا ہے، اور اس کی بدولت حبشی لوگ جائدادیں خریدنے لگے ہیں۔ یہ واقعات ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کہ جو حبشی ۱۷۹۰ء میں ممالک متحدہ امریکہ کی آبادی کا ۱۹ فیصدی حصہ تھے وہ آج ۹ فیصدی رہ گئے ہیں[2]۔ اور لطف یہ ہے کہ امریکہ کے کانسٹی ٹیوشن میں حبشی اقلیت کے بنیادی حقوق بالکل محفوظ ہیں۔

---

[1] یہ واقعات رسالہ "نیو ایج" میں شائع ہوئے ہیں:- [2] تفصیلات کے لئے کتب ذیل ملاحظہ ہوں۔

J. E. Cutter, Lynch Law
C. G. Woodson, The Negros in Our History.
E. B. Reuter, The American Race Problem.
M. J. Hersko, The American Negro.

جرمنی کی ایک اور مثال آپ کے سامنے ہے۔ جرمن کانسٹی ٹیوشن کی رو سے تمام باشندگان ملک کے بنیادی حقوق مسلم ہیں مگر آج وہاں کی غیر آریہ نسل کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کس سے پوشیدہ ہے۔ ان کے لئے جرمنی کے حدود میں عزت کی روٹی کمانا قریب قریب محال ہو گیا ہے اور وہاں سے نکل جانا بھی اتنا ہی محال ہے۔ سرکاری اور خانگی دونوں قسم کی ملازمتوں کے دروازے ان کے لئے بند ہیں۔ تجارت بھی وہ آزادی سے نہیں کر سکتے۔ دوسرے آزاد پیشوں سے بھی ان کو نکالا جا رہا ہے۔ عدالتوں میں ان کے ساتھ کھلم کھلا نسلی امتیاز برتا جاتا ہے۔ ان کے لئے انصاف کا نظریہ یہ قائم کیا گیا ہے کہ ہر غیر آریہ اور پیدائشی مجرم ہے تاوقتیکہ وہ اپنے آپ کو غیر مجرم نہ ثابت کر دے۔ عام باشندے اگر ان سے لین دین یا کسی قسم کا معاملہ کرتے ہیں۔ تو ان پر حکومت کا عتاب ہوتا ہے۔ ملک کے مدارس میں ان کے بچوں پر ناقابل برداشت پابندیاں ہیں اور اگر وہ ملک سے باہر تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجے جاتے ہیں تو ان کو صرف ہجرت کا پاسپورٹ دیا جاتا ہے تاکہ واپس نہ آ سکیں۔ ان کے والدین اگر ان سے ملنے کے لئے باہر جانا چاہتے ہیں تو انہیں بھی مہاجر کی حیثیت سے جانے کی اجازت دی جاتی ہے اور مہاجر کے لئے یہ قانون بنا دیا گیا ہے کہ وہ اپنے مال و دولت کا صرف دس فیصدی حصہ جرمنی سے باہر لے جا سکتا ہے۔ باقی سب ضبط۔

یورپ کے دوسرے ممالک میں بھی کونسا ملک ایسا ہے جس کے دستور اساسی میں بنیادی حقوق موجود نہیں ہیں؛ اور کونسا ملک ایسا ہے جہاں دستور کے بنیادی حقوق نے اقلیت کو اکثریت کے ظلم سے بچایا ہو، ہر جگہ ملک کی پوری آبادی کو ایک قوم فرض کر کے ایک جمہوری اسٹیٹ بنا دیا گیا اور دستور اساسی میں بنیادی حقوق مقرر کر دیئے گئے۔ مگر جہاں بھی اکثریت اور اقلیت کے درمیان مذہب یا نسل یا زبان کی بنیاد پر قومی امتیاز موجود ہے۔ وہاں اکثریت کی یہی کوشش ہے کہ یا تو اقلیت اپنے قومی وجود کو اکثریت کی قومیت میں گم کر دے یا پھر اسے شودر بنا کر رکھا جائے اور مختلف طریقوں سے اس کو فنا کر دیا جائے۔ یوگوسلیویا میں جب کروٹس نے مطالبہ کیا کہ ان کی قوم کا ایک الگ صوبہ بنایا جائے۔ اور اسے آٹونومی دے دی جائے۔ تو آپ کو معلوم ہے

کہ سربیوں نے ان کو کیا جواب دیا؟ اس جواب کو لفظ بلفظ سن لیجئے:۔

"سرب، کروٹ اور سلاوینی درحقیقت ایک قوم ہیں۔ غیر ملکی سامراج نے ان کو زبردستی الگ کر رکھا تھا۔ اب جبکہ بیرونی جُوا ہمارے کندھوں پر سے اتر گیا ہے تو قومی وحدت کا احساس متیاب ہو کر ابھر آیا ہے اور اس نے ان تمام حد بندیوں کو توڑ دیا ہے۔ جو سیاسی ادارت اور زبان اور مذہب نے پیدا کر دی تھیں۔ وحدت کے اس احساس کو برقرار رکھنے اور بڑھانے کے لئے ضروری ہے کہ قدیم جغرافی تقسیم جس کے ذریعہ سے غیر ملکی حکمرانوں نے قوم کو تقسیم کر دیا تھا، منسوخ کر دی جائے۔ مقامی نظم و نسق کے لئے صوبوں کی بالکل نئی تقسیم ہونی چاہئے تاکہ پرانے صوبوں کی حد بندیاں نسلی جتھے (Racial Groups) نہ بنا سکیں۔"[ط]

بالکل یہ معلوم ہوتا ہے یا نہیں کہ آزاد ہندوستان میں جواہر لال نہرو تقریر فرما رہے ہیں؟ یہ گویا ایک قاعدۂ کلیہ سا بن گیا ہے کہ واحد قومیت کا جوشیلا وعظ دیسی قوم کہا کرتی ہے جس کا سو فیصدی فائدہ اسی وعظ میں ہوتا ہے۔ اور وہ بیوقوف لوگ بعد میں پچھتاتے ہیں جو آزادی کے جوش میں "ایک قوم ایک ملک" کی صدائیں بلند کیا کرتے ہیں مگر جب آزادی کے بعد واحد قومیت اژدہے کی طرح ان کو نگلنا شروع کرتی ہے تو غیظ و غضب کے مارے بل کھاتے ہیں اور قدرت کا بے لاگ قانون ان احمقوں سے پکار کر کہتا ہے کہ موتوا بغیظکم۔ جس وقت یوگوسلیویا کی نیشنل اسمبلی میں کروٹس کے اعتراضات کا مذکورہ بالا جواب دیا گیا تو سنا ہے کہ کروٹ نمائندے احتجاجاً اسمبلی سے اٹھ گئے اور ان کے جانے کے بعد سربی اکثریت نے اور زیادہ آسانی کے ساتھ وہ سب کچھ پاس کر لیا، جو وہ پاس کرنا چاہتی تھی۔ اس وقت بنیادی حقوق دور کھڑے ہنستے رہے اور کہتے رہے کہ "کہو! کیسا بیوقوف بنایا!"

(۳)

اب ذرا ان بنیادی حقوق کا بھی تجزیہ کر دیکھئے۔ جو کراچی ریزولیوشن میں تجویز کئے گئے ہیں۔

---

ط A. H. Morley, The New Democratic Constitutions of Europe.

اور جن کی بنا پر ہمارے بہت سے سادہ لوح بھائی ملک بھر میں مسلمانوں کو سمجھاتے پھرتے ہیں کہ بھائیو! کانگریس تو پہلے ہی تمہارے حقوق کی حفاظت کا ذمہ لے چکی ہے۔ اب تم کیوں متحدہ قومیت کی بنیاد پر ایک آزاد جمہوری اسٹیٹ کی تعمیر میں حصہ نہیں لیتے؟

پہلی دفعہ میں ہندوستان کے ہر باشندے کو اظہار رائے اور اجتماع کی آزادی دی گئی ہے بشرطیکہ وہ ایسے مقاصد کے لئے ہو جو قانون اور اخلاق کے خلاف نہ ہوں۔ قانون اور اخلاق کی شرط اس آزادی کو ہر وقت باطل کر سکتی ہے۔ اصول جمہوریت کی بنا پر قانون بنانا اور اخلاق کا معیار مقرر کرنا مطلقاً اکثریت کے اختیار میں ہوگا، اور اکثریت ہی کی حکومت اس کو نافذ کرے گی۔ لہٰذا اقلیت کی آزادی کے حدود گھٹانا یا بڑھانا محض ان کے اختیار تمیزی پر موقوف ہوگا

دوسری دفعہ میں ہر باشندہ ہند کو ضمیر کی آزادی، اور اپنے مذہب پر اعتقاد رکھنے اور اس پر عمل کرنے کی آزادی عطا کی گئی ہے، بشرطیکہ وہ امن عام اور اخلاق کے خلاف نہ ہو۔ یہاں پھر وہی شرط ہے اور یہ شرط اس آزادی کو ہر وقت سلب کر سکتی ہے۔ تاہم اگر اکثریت نے بڑی فیاضی سے کام لیا اور یہ آزادی ہم کو پوری طرح بخش بھی دی، تو اس سے ہمارا مقصد حاصل نہیں ہوتا، ایسی آزادی تو انگریزی حکومت نے بھی ہم کو دے رکھی ہے، مگر اس کے باوجود ڈیڑھ سو برس کے اندر ہماری مذہبیت مضمحل اور ہماری تہذیب نیم مردہ ہو کر رہ گئی۔ جبکہ حکومت کے اختیارات ہمارے ہاتھ میں نہ ہوں، اور ایک ایسی جماعت ان اختیارات کو استعمال کرے جو ہمارے اصول تہذیب سے قطعاً ناآشنا، اور بالکل مختلف قسم کے نظریات تہذیب و اخلاق و تمدن کی گرویدہ ہو، تو اس حکومت کے ماتحت ہمیں مذہبی آزادی حاصل کرنے کا فائدہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ہمیں زبردستی نماز پڑھنے سے نہیں روکا جائے گا بلکہ ہمارے اندر وہ ارتداد آہستہ آہستہ اتارا جائے گا جس سے ہم خود نماز پڑھنا چھوڑ دیں۔ ہماری مسجدیں توڑی نہیں جائیں گی بلکہ ہمارے دل و دماغ کو اندر سے بدلا جائے گا تاکہ یہ مسجدیں ویران ہو کر خود بخود آثار قدیمہ میں تبدیل ہو جائیں۔ ہماری عورتوں کے چہروں سے پولیس کے سپاہی زبردستی

نقاب نہ کھینچیں گے بلکہ مدرسہ کے معلم نہایت شفقت و رحمت کے ساتھ ان کے ذہن میں وہ معیار اخلاق پیوست کریں گے جس کی بنا پر وہ گھر کی ملکہ بننے کے بجائے اسٹیج کی رقاصہ بننا زیادہ پسند کرے گی - یہ آزادی محض ایک افیون ہے تاکہ اس کی پینک میں ہم پڑے سوتے رہیں، اور ہمارے گرد و پیش زمین و آسمان بدلتے چلے جائیں - آزادی کے پروانے کو لیکر جو حضرات یہ سمجھ رہے ہیں کہ آئندہ کے قومی جمہوری لادینی اسٹیٹ میں ان کے مذہب اور ان کی تہذیب کا پورا تحفظ ہوگا - انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ تحفظ اسی نوعیت کا تحفظ ہے جیسا کہ پرانی تاریخی عمارتوں کا ہوا کرتا ہے - یہ محض اس امر کی ضمانت ہے کہ موجودہ نسل کے جو لوگ اپنی مذہبیت کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں ان کی گردن پر چھری رکھکر زبردستی کلمۂ کفر نہیں کہلوایا جائیگا - مگر یہ اس امر کی ضمانت نہیں ہے کہ ان کی آئندہ نسل کو غیر مسلم بنانے والی تعلیم و تربیت نہ دی جائیگی - اس تحفظ کے معنی صرف یہ ہیں کہ آپ اگر چاہیں تو قال اللہ و قال الرسول میں مشغول رہیں آپ کی ڈاڑھی یقیناً زبردستی نہیں مونڈی جائے گی، نہ آپ کی عبا غصب کی جائے گی، نہ آپ کی تسبیح چھینی جائے گی، نہ آپ کی زبان درس حدیث و قرآن سے روکی جائے گی، مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ آئندہ نسل کو بھی اس "غلط فہمی" میں مبتلا رہنے دیا جائیگا کہ اسلام ہی سچا دین ہے اور تمام مذاہب سے برتر اور اصح ہے - مذہبی آزادی کا یہ پروانہ لیکر جو صاحب خوش ہونا چاہتے ہیں، وہ خوش ہولیں - ہمیں تو اس پروانہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے - ہمارے مذہب اور ہماری تہذیب کی فطرت تو مفعولانہ نہیں بلکہ فاعلانہ آزادی مانگتی ہے - ہم تو استقلال وطن اس لئے اور صرف اسی لئے چاہتے ہیں کہ ہماری حکومت ہمارے اپنے ہاتھ میں ہو، اپنا نظام تعلیم ہم خود بنائیں، اپنی تہذیب و تمدن کے مسخ شدہ نظام کو ہم خود اپنی طاقت سے درست کر سکیں - اگر یہ نہیں تو ہمارے لئے یکساں ہے، چاہے حکومت باہر کے کفار کی ہو یا گھر کے کفار کی -

تیسری دفعہ اس امر کا اطمینان دلاتی ہے کہ قلیل التعداد جماعتوں اور مختلف لسانی علاقوں کی کلچر، زبان اور رسم الخط کی حفاظت کی جائے گی - حکومت کے روپے اور اس کی طاقت سے

ہندی کو ہندوستان کی "قومی" زبان بنانا اس دفعہ کے خلاف نہیں ہے۔ اگر نظام تعلیم ایسا بنایا جائے کہ اقلیتوں کی تہذیب کا رنگ اس سے بالکلیہ خارج کر دیا گیا ہو، بلکہ اگر نظام تعلیم کو اس قصد کے ساتھ ایسے نقشہ پر مرتب کیا جائے کہ اقلیتوں کی تہذیب اپنی موت آپ مر جائے، تو ایسا کرنا بھی اس دفعہ کے خلاف نہیں۔ درحقیقت اس دفعہ کا مطلب یہ ہے، یہ نہیں کہ اقلیتوں کی زبان اور ان کی کلچر کو حکومت کے رسد خانے سے زندگی کی غذا دی جائے گی، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ان کو زبردستی قتل نہ کیا جائے گا۔ باقی رہی یہ بات کہ کمی غذا سے وہ خود سوکھ سوکھ کر مر جائیں تو حکومت پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں، بلکہ یو۔پی کے وزیر اعظم کی زبان سے ہم کو بتایا جاتا ہے کہ ان کا سوکھ سوکھ کر مر جانا ہی مطلوب ہے تاکہ ان کی راکھ سے "ہندوستانی تہذیب" کا ققنس پیدا ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ اس نوعیت کا بنیادی حق بھی ہم کو انگریزی حکومت میں حاصل ہے۔ اس نے بھی ہم کو اردو بولنے اور لکھنے سے نہیں روکا، بلکہ ورناکیولر اسکول قائم کئے، اور کوئی ایسا آرڈیننس پاس نہیں کیا کہ ہم اپنی کلچر کے مطابق زندگی بسر نہ کریں۔ لیکن اس بنیادی حق نے ہماری زبان اور ہماری کلچر کو زندگی کی طاقت نہیں بخشی اگر یہی اس حکومت میں بھی ہو جس کو "قومی حکومت" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، تو ہمارے لئے ایسی "قومی حکومت" بعینہٖ غیر قومی حکومت ہوگی۔ ہمیں قومی حکومت کی ضرورت تو اس لئے ہے کہ ہم حکومت کے وسیع ذرائع سے اپنی زبان اور اپنی کلچر کو اس طرح غذا دے سکیں جس طرح آزاد قومیں دیا کرتی ہیں۔ ورنہ بطور خود اپنی ضروریات کا انتظام کر لینے کی آزادی تو ہمیں اب بھی حاصل ہے اس کے لئے ہمیں کسی جنگ آزادی کی کیا ضرورت ہے۔

چوتھی دفعہ کہتی ہے کہ قانون کی نظر میں تمام شہری مساوی ہیں۔ جات پات، مذہب اور صنف کا کوئی امتیاز ان کے درمیان نہ ہوگا۔ یہ نہایت عمدہ دفعہ ہے۔ لیکن مساوات کا تصور ہر تہذیب میں مختلف ہوتا ہے۔ اگر جمہوری اصول پر کل کوئی اکثریت میراث میں عورت اور مرد کا حصہ برابر کرنے کا قانون پاس کر دے اور اس کی مخالفت کرنے والی اقلیت کا اسی طرح مذاق اڑائے جس طرح

ابھی چند روز ہوئے مسٹر داس کے بل کی مخالفت کرنیوالوں کا مذاق سنٹرل اسمبلی میں اڑایا جاچکا ہے۔ تو یہ دفعہ ہمارے کس کام آئے گی۔

پانچویں دفعہ اس امر کی ضمانت دیتی ہے کہ کسی باشندۂ ملک پر اس کے مذہب یا جات پات یا عقیدہ و مسلک، یا صنف کی وجہ سے ایسی پابندی عائد نہ کی جائے گی کہ وہ کسی سرکاری ملازمت یا عزت و اقتدار کے کسی منصب یا کسی پیشے اور کاروبار میں داخل نہ ہوں گے۔ اس دفعہ کے اچھے اور برے دونوں پہلو ہیں۔ اگر نظام حکومت کسی ایسی جماعت کے ہاتھ میں ہو جو ہماری تہذیب سے کوئی ہمدردی نہ رکھتی ہو تو اس دفعہ کے عطا کردہ حقوق شریف مسلمان بہو بیٹیوں کو فلم ایکٹرس کے مرتبہ عالی تک بھی پہنچا سکتے ہیں۔

چھٹی دفعہ تمام باشندوں کو سڑکوں اور تالابوں اور کنوؤں اور مدرسوں وغیرہ سے استفادہ کا مساوی حق دیتی ہے۔ یہاں "بشرطیکہ امن عام اور اخلاق کے خلاف نہ ہو"، کی قید نہیں لگائی گئی جس طرح پہلی اور دوسری دفعہ میں لگائی گئی ہے۔ دوسری دفعہ کی رُو سے گائے کی قربانی بند کی جا سکتی ہے۔ مگر چھٹی دفعہ سڑکوں کے استعمال پر کوئی ایسی پابندی عائد نہیں کرتی کہ نماز کے وقت باجا بجا کر مسلمانوں کو پریشان نہ کیا جائے۔

یہ ہیں وہ بنیادی حقوق جن کے اعلان کو ایک نعمت عظمیٰ قرار دیا جاتا ہے اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ اس اعلان کے معاوضہ میں ایک ایسی حکومت کو خود اپنے اوپر مسلط کرنے کے لئے جنگ کریں جس کی پالیسی کی تشکیل جس کے قوانین کی تشریع اور جس کے احکام کی تنفیذ میں ہم واحد قومیت، اور اصول جمہوریت کی بنیاد پر کسی طرح اپنا اثر استعمال نہیں کر سکتے۔ دوسرے الفاظ میں ہماری خدمات اس لئے حاصل کی جا رہی ہیں کہ بس فرعون کی جگہ اس کے بیٹے کو تخت نشین کرا دیں، رہا ہمارا اپنا حال تو جو بنی اسرائیل کی سی پوزیشن ہمیں فرعون کے عہد میں حاصل ہے، ابن فرعون اطمینان دلاتا ہے۔ کہ وہی میرے عہد میں بھی حاصل رہے گی۔

# جنگِ آزادی کی نوعیت!

اب ہم اپنی آخری تنقیح کی طرف توجہ کرتے ہیں، یعنی یہ کہ وطن پرستوں کی یہ جنگ جس کو "جنگ آزادی" کہا جا رہا ہے، دراصل ہے کس نوعیت کی جنگ؟ آیا یہ خالص انقلابی جنگ ہے یا نیم انقلابی اور نیم دستوری؟ عام طور پر سیاسی معاملات سے دلچسپی رکھنے والے مسلمان اس سوال کی اہمیت کو نظر انداز کر جاتے ہیں، حالانکہ یہ سوال فیصلہ کن اہمیت رکھتا ہے۔

انقلابی جنگ کے معنی یہ ہیں کہ حکومت متسلطہ کو بالکلیہ ختم کر دینے کے لئے جنگ کی جائے اور جب تک اس کا تختہ اُلٹ نہ دیا جائے، اس وقت تک ملک کے نظم و نسق سے کوئی سروکار نہ رکھا جائے۔ اس قسم کی جنگ کی مثال ایسی ہے جیسے آپ کسی عمارت کو بالکل ناپسند کرتے ہوں اور اس میں رہ کر آہستہ آہستہ ترمیم کرنے کے قائل نہ ہوں۔ بلکہ اس کو قطعی طور پر منہدم کر کے دوسری عمارت بنانا چاہیں۔

نیم انقلابی نیم دستوری جنگ کے معنی یہ ہیں کہ پہلے انقلابی شورش سے حکومت متسلطہ پر دباؤ ڈال کر نظام حکومت میں ترمیم و اصلاح کرائی جائے، پھر اصلاح شدہ نظام کو چلا کر اتنی طاقت حاصل کی جائے کہ دوبارہ انقلابی شورش برپا کر کے کچھ مزید اختیارات حاصل کئے جا سکیں، اور اس طرح بتدریج پرانے نظام حکومت کو ہٹا کر نیا نظام حکومت اس کی جگہ لیتا چلا جائے۔ اس قسم کی جنگ کی مثال ایسی ہے جیسے آپ ایک عمارت کو رفتہ رفتہ توڑتے جائیں۔ اور ساتھ ساتھ دوسری عمارت بناتے بھی جائیں، یہاں تک کہ پرانی عمارت کا انہدام اور نئی عمارت کی تکمیل دونوں ساتھ ساتھ انجام کو پہنچیں۔

دونوں طرح کی لڑائیوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ پہلی قسم کی لڑائی میں، دو ایسے فریق بھی مل

کر لڑ سکتے ہیں جو موجودہ نظام حکومت کی مخالفت میں تو متفق ہوں مگر اس امر میں اختلاف رکھتے ہوں کہ آئندہ نظام حکومت کس نقشہ پر بنایا جائے۔ ان کے لئے یہ ممکن ہے کہ تعمیر نو کے سوال کو جنگ کے خاتمہ پر اٹھا رکھیں، وہ اس امر پر اتفاق کر سکتے ہیں کہ آؤ ہم متحدہ قومیت کے ساتھ پہلے اس نظام حکومت کو ختم کر دیں، اس کے بعد یا تو ہم باہمی مفاہمت سے کوئی بیچ کی راہ نکال لیں گے یا پھر بدرجہ آخر قوت آزمائی کر دیکھیں گے، اور ہم میں سے جو فریق بھی زیادہ طاقتور ہوگا۔ اس کی مرضی کے مطابق نیا نظام حکومت بن جائے گا۔ لیکن دوسری قسم کی لڑائی میں آئندہ کے سوال کو بعد پر اٹھا کر نہیں رکھا جا سکتا۔ اس میں فریقین کے درمیان پہلے ہی مرحلہ پر یہ تصفیہ ہونا ضروری ہے کہ تدریجی تخریب کے ساتھ تدریجی تعمیر کس نقشہ پر ہو۔ اس لئے کہ یہاں تخریب اور تعمیر دونوں ساتھ ساتھ ہو رہی ہیں اور ساتھ ساتھ تکمیل کو پہنچنے والی ہیں۔ اگر ایک فریق اپنے نقشہ پر تعمیر کرتا رہے اور دوسرا فریق نقشہ کے سوال کو بعد پر چھوڑ کر اس کا ساتھ دیتا چلا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ایک غلامی کے بند کھولنے کے ساتھ ساتھ دوسری غلامی کے بند میں اپنے آپ کو خود جکڑواتا رہے اور اپنی آزادی کے سوال کو اس وقت تک کیلئے اٹھا رکھے جب یہ دوسری غلامی اس پر پوری طرح مسلط ہو چکی ہو۔ اس قسم کی جنگ، اس عقلمند فریق کے لئے تو ضرور جنگ آزادی کہی جا سکتی ہے جو آہستہ آہستہ پرانے آقا کی جگہ لے رہا ہو، مگر اس بیوقوف فریق کے لئے یہ دراصل جنگ غلامی ہوگی جو ایک آقا کی جگہ محض دوسرا آقا لانے کے لئے لڑ رہا ہو۔

اگر ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد فی الواقع خالص انقلابی نوعیت کی ہوتی۔ تو ہم اس کی کوئی پروا نہ کرتے کہ مستقبل کا نقشہ جواہر لال اور سوباش چندر بوس کیا پیش کرتے ہیں۔ اور بھولا بھائی اور ستیا مورتی کیا فرماتے ہیں۔ ہم بزدل ہوتے اگر ان باتوں سے ڈر کر جنگ سے منہ موڑ جاتے، ہم بہادروں کی طرح ان سے کہتے۔ کہ جو کچھ آپ حضرات کے ارادے ہیں آپ انہی پر قائم رہیں، مگر آیئے، پہلے ہم اور آپ مل کر اس بداصل عمارت کو توڑ سے اکھاڑ پھینکیں جسے باہر والوں نے ہمارے سروں پر تعمیر کر دیا ہے۔ اس کے بعد ہم دیکھ لیں گے۔ کہ یہاں ایک

قومی، جمہوری، لادینی اسٹیٹ بنتا ہے یا کچھ اور۔ اس صورت میں جو فریق بھی آزادی کامل۔ وبیرون سایہ سلطنت برطانیہ کے لئے انقلابی لڑائی سے منہ پھیرتا وہی بزدل قرار پاتا۔

مگر یہاں صورت حال کچھ دوسری ہے۔ نام آزادی کامل کا لیا جاتا ہے، اور منزل مقصود ٹھیرائی جاتی ہے کینیڈا اور آسٹریلیا کی سی آزادی یعنی برٹش کامن ویلتھ کے اندر نہ کہ باہر۔ کہا جاتا ہے کہ ہماری جنگ انقلابی ہے، اور طریقہ اختیار کیا جاتا ہے، وہی نیم انقلابی نیم دستوری جس کا مفہوم اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ دعویٰ یہ کیا جاتا ہے۔ کہ ہم دوسرے کے بنائے ہوئے دستور کو قبول کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں، اور ان کے مسلط کئے ہوئے نظام کو توڑ کر ایسا دستور چاہتے ہیں جو ہندوستان کے باشندے خود اپنے لئے بنائیں، مگر دوسروں نے جو دستور بنا دیا ہے۔ اس کو عملاً قبول کر کے حکومت کے نظم و نسق کا چارج لے لیا جاتا ہے، اور خوب دل لگا کر اسے چلایا جاتا ہے اس طرح ایک عجیب پر فریب طلسمی جال تیار کر دیا گیا ہے جس کے پھندے دن کی روشنی میں بھی ہمارے بہت سے بھائیوں کو نظر نہیں آتے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ اس جال کے ایک ایک پھندے کو پوری طرح نمایاں کیا جائے تاکہ مادر زاد اندھوں کے سوا ہر ایک اس کو دیکھ سکے۔

(۱)

آزادی کامل، پورن سوراج Complete Independence کے الفاظ سن کر ہر ذی ہوش آدمی یہی سمجھے گا کہ اس سے مراد وہ آزادی ہے اور وہی آزادی ہونی چاہئے جو فرانس جرمنی، اٹلی، جاپان، روس اور ایسے ہی دوسرے آزاد ملکوں کو حاصل ہے۔ لیکن ہندوستان میں ان الفاظ کا یہ مفہوم نہیں ہے۔ یہاں اصرار تو انہی الفاظ کے استعمال پر کیا جاتا ہے۔ لیکن اگر ان کی تعبیر بیرون سایۂ حفاظت برطانیہ کے ساتھ کر دی جائے تو مہاتما گاندھی پران دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہاں آج بھی اس سے مراد وہی ہے جس کو آج سے دس سال پہلے نہرو رپورٹ میں مطلوب و مقصود ٹھیرایا گیا تھا، یعنی برطانوی دولت مشترکہ میں خود مختار نو آبادیات کی سی حیثیت۔ مگر اس کو نہرو رپورٹ کی طرح صاف الفاظ میں بیان نہیں کیا جاتا، بلکہ زیادہ تر کوشش کی جاتی ہے

کہ اس کی تشریح و تفسیر کی نوبت ہی نہ آئے، اور اگر کبھی مجبوراً کچھ کہنا پڑ جاتا ہے۔ تو پھر یونانی زبان میں کلام کیا جاتا ہے تاکہ کوئی نہ سمجھ سکے۔ تاہم انتہائی سعی اخفا کے باوجود اصل مقاصد کسی نہ کسی طرح زبان پر آہی جاتے ہیں۔ چنانچہ اسی سال ہری پورہ کانگریس کے خطبۂ صدارت میں مسٹر سوباش چندر بوس نے فرمایا ہے:۔

"برطانوی سلطنت اس وقت تاریخ کے دوراہوں میں سے ایک دوراہے پر کھڑی ہے۔ یا تو وہ اسی انجام سے دوچار ہوگی جو دوسری سلطنتوں کا ہو چکا ہے، یا اسے اپنے آپ کو آزاد قوموں کے ایک وفاق میں تبدیل کرنا ہوگا... برطانیہ عظمیٰ کے لئے اپنے نظام سلطنت کے اندرونی تضاد و تباین کو ختم کرنے کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ سلطنت کو آزاد قوموں کے ایک وفاق میں تبدیل کرے"

ابھی حال میں پنڈت جواہر لال نہرو کا ایک مضمون یورپ کی صورت حال پر شائع ہوا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں:۔

"اگر برطانیہ جمہوریت کا اب بھی معتقد ہے۔ تو اس کے لئے ایک ہی ممکن العمل صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ شہنشاہیت کو جلدی سے جلدی اور بالکلیہ ترک کر کے ہندوستان اور فلسطین وغیرہ میں آزاد جمہوری ادارے قائم کر دے۔ اس سے برطانیہ کمزور نہ ہوگا۔ بلکہ یہ ممالک اس کے طاقتور مددگار بن جائیں گے" (نیشنل ہیرلڈ بحوالہ انقلاب مورخہ ۴ نومبر ۳۸ء)

اور اسی سال اگست میں جب پنڈت جی پراگ (Prague) تشریف لے گئے تھے تو انھوں نے ایک بیان میں فرمایا کہ:۔

"انگلستان کے دشمن ہمارے دشمن ہیں" (ڈیلی ہیرالڈ مورخہ ۱۹ اگست ۳۶ء)

ڈیلی ہیرلڈ کا بیان ہے کہ اس پر انڈیا آفس کی طرف سے پنڈت جی کا شکریہ ادا کیا گیا تھا۔ یہ کانگریس کے ان دو لیڈروں کے اقوال ہیں جو انتہا پسند کانگریسیوں کے صنم سمجھے جاتے ہیں جن میں سے ایک اس وقت کانگریس کا صدر ہے اور دوسرا بھی مسلسل دو سال تک صدر رہ چکا ہے

ان کا مطمح نظر بھی اس سے زیادہ اونچا نہیں ہے کہ ہندوستان برطانوی دولت مشترکہ کے اندر آزاد قوموں کے اس دائرے میں جگہ پائے جس کا مرکز و محور تاج برطانیہ ہو، جس کا مفاد مرکزی سلطنت کے مفاد سے متحد ہو جائے، جس کی دفاعی، اور لازمی نتیجہ کے طور پر، خارجی پالیسی بھی انگلستان کے دامن سے بندھی ہوئی ہو۔ یہی رائے قریب قریب تمام بڑے بڑے کانگریسی رہنماؤں کی ہے اور ان میں کوئی ایک شخص بھی آپ کو ایسا نہیں مل سکتا جو آزادی کامل بول کر آزادی کامل مراد لیتا ہو۔

اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ دنیا کی آزاد قوموں کے ساتھ ہمسری و مساوات حاصل کرنے کی خواہش جو فطرۃً ہر خوددار ہندوستانی میں ہونی چاہئے، ان کے اندر مفقود ہے۔ بلکہ دراصل اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں ایک کھلی اور بے لاگ مسابقت Open and Fair Competition کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ یہ اس کے لئے تیار نہیں ہیں کہ کھلے میدان میں گھوڑا کھڑا ہو، مقابلہ آزادانہ ہو، اور ان کا اس گھوڑے کی پیٹھ پر متمکن ہونا محض ان کی قوت و شہسواری پر موقوف ہو۔ ان کی خواہش تو یہ ہے کہ سرکار سہارا دیکر انہیں گھوڑے پر چڑھا دیں اور جب تک یہ دوسرے امکانی مدعیوں کا خاتمہ نہ کر دیں، یا جب تک وہ ان کی سائیسی قبول کرنے پر مجبور نہ ہو جائیں، اس وقت تک سرکار ان کی پشتیبانی کے لئے کھڑے رہیں۔ یہ اور صرف یہی ایک وجہ ہے اس امر کی کہ ان کے بڑے سے بڑے مدعی حریت کو بھی جب اوپر سے کھرچا جاتا ہے۔ تو اندر سے دو درجہ نو آبادیات کا پرستار ہی نکلتا ہے۔

پھر جب ان کا اصلی مدعا یہ ہے تو یہ آزادی کامل کا نام کیوں لیتے ہیں؟ لبرل پارٹی کی طرح صاف کیوں نہیں کہتے کہ ہم درجۂ نو آبادیات چاہتے ہیں؟ آخر اس منافقت کی ضرورت کیا ہے کہ زبان پر وہ بات لائی جائے جو دل میں نہیں ہے اور دل میں وہ بات رکھی جائے جو زبان پر لانی مناسب نہیں؟ خصوصاً وہ لوگ جن کے ایمان میں اہنسا سے بھی پہلے ستیہ (صداقت) کا مرتبہ ہے وہ اس جھوٹ کو کیوں جائز رکھتے ہیں؟ اس سوال کا جواب جو گذشتہ دس سال کی تاریخ پر غور

کرنے سے مجھے ملا ہے۔ اسے میں بغیر کسی لاگ لپیٹ کے ظاہر کر دینا چاہتا ہوں۔ اس منافقت کی وجہ صرف یہ ہے کہ درجہ نوآبادیات یا اس سے فروتر درجہ کی اصلاحات کا نام لیتے ہی فوراً ملک کی دوسری قوموں کے حقوق کا سوال پیدا ہو جاتا ہے اور اس صورت میں دوہری مشکل پیش آتی ہے۔ اگر ان حقوق کے مسائل کو انصاف کے ساتھ ابتدائی مراحل میں طے کر دیا جائے تو ہندوستان کو "ایک قوم" کا ملک بنا دینے کا خواب پریشان ہو جاتا ہے۔ اور اگر اپنے اصل ارادے بے نقاب کر دیئے جاتے ہیں تو پھر اس دام فریب کے سارے بند کھل جاتے ہیں جس میں ہندوستان کی دوسری قوموں کو پھانسنا مقصود ہے، اور کوئی توقع نہیں کی جا سکتی کہ حقیقی "بندگان وطن" کی قلیل تعداد کے سوا کوئی ایسا "بندۂ خدا" بھی اس کام میں تعاون کا ہاتھ بڑھائے گا جو اپنے قومی تشخص کو برقرار رکھنا ضروری سمجھتا ہو۔ اس دوگونہ اشکال کا عملی تجربہ ان حضرات کو نہرو رپورٹ کی اشاعت کے بعد اچھی طرح ہو گیا تھا چنانچہ انہوں نے یہ دانشمندانہ پالیسی اختیار کی کہ نہرو رپورٹ کو تو دریائے راوی میں غرق کر کے "آزادی کامل" کا اعلان کر دیا اور اس جھوٹ کے پردے میں اپنے اصل مقصد، یعنی تدریجی حصول اقتدار کی کوشش برابر جاری رکھی۔

اگرچہ جاننے والوں کے لئے یہ راز اس وقت بھی راز نہ تھا۔ اور جن کے پاس کچھ عقل تھی ان کے لئے اس کے بعد بھی بہت سے مواقع آئے جب اس کے چہرے سے نقاب اٹھتا رہا مثلاً جب سول نافرمانی کے بعد گاندھی جی دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں لندن تشریف لے گئے تھے تو کامل آزادی لینے کے لئے نہ گئے تھے۔ نہ کامل آزادی دینے کے ان کو بلایا گیا تھا۔ اور جب ۱۹۳۵ء کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس کر دیا گیا تو جدید اسمبلیوں میں داخلہ کامل آزادی حاصل کرنے کا ذریعہ نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ مگر باوجود اس کے یہ راز ہمارے بہت سے سادہ لوح بھائیوں کے لئے راز ہی رہا اور آج بھی جبکہ برطانوی پارلیمنٹ کے دستور کو علانیہ چلایا جا رہا ہے، ان کے لئے یہ بدستور راز ہے۔ چنانچہ وہ متحدہ قومیت کے راگ یہی سمجھ کر الاپ رہے ہیں اور اس کانسٹیٹیوشن کے جال میں مسلمانوں کو یہی سمجھ کر پھنسوا رہے ہیں۔ کہ کانگریس کی جنگ کامل آزادی کے لئے ہے — یہ فائدہ ہے۔ اس منافقت کا جو ستیہ اور اہنسا کے

معتقدین نے آٹھ نو سال سے اختیار کر رکھی ہے

( ۲ )

جب آزادی کامل کا اعلان کیا گیا تھا تو ساتھ ہی یہ بھی کہدیا گیا تھا کہ ہماری جنگ انقلابی جنگ ہے، یعنی ہم اس ظالمانہ نظام حکومت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں اور جبتک وہ جڑ سے اکھڑ نہ جائے ہم اس سے کوئی ربط و تعلق رکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں بات بظاہر نہایت معقول تھی کیونکہ آزادی کامل صرف انقلابی جنگ ہی سے ہو سکتی ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگوں کو یقین آ گیا کہ جب یہ انقلابی جنگ کا علم بلند کر رہے ہیں تو ضرور ان کا مقصد آزادی کامل ہی کا حصول ہوگا اس کے بعد جب گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس ہو گیا اور جدید اسمبلیوں کے لئے انتخابات شروع ہوئے تو کہا گیا کہ ہم اسمبلیوں میں جائیں گے مگر اس لئے کہ اس دستور کو اندر سے توڑیں۔

پھر جب اسمبلیوں میں پہنچ گئے تو وزارتیں قبول کرنے یا نہ کرنے کا سوال پیدا ہوا۔ کچھ مدت تک محبوبانہ ادا کے ساتھ ہاں اور نہیں کا سلسلہ جاری رہا اور آخر کار وزارت کے قلمدان بھی سنبھال لئے گئے اور جب وزارتیں بھی قبول کر لی گئیں تو کہا گیا۔ کہ اس سے مقصود ہز مجسٹی کی حکومت کو چلانا نہیں ہے بلکہ دستور جدید کے نفاذ کو عملاً ناممکن بنا دینا ہے۔ چنانچہ عہدے قبول کرتے وقت کانگریس نے جس پالیسی کا اعلان کیا تھا۔ وہ یہ تھی کہ :-

"دستور جدید کا مقابلہ کر کے یا اس کی مزاحمت کر کے، اسے ختم کر دیا جائے۔ ووٹروں کی بڑی اکثریت کانگریس کی اس پالیسی اور اس کے پروگرام کی توثیق کر چکی ہے۔ عوام الناس خود برطانوی حکومت ہی کے مقرر کئے ہوئے طریقہ پر آئین جدید کو نامنظور کرنے کا اعلان کر چکے ہیں (یعنی انہوں نے کانگریس کے نمائندوں کو بھاری اکثریت سے نمائندہ منتخب کیا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس دستور کو قبول نہیں کرتے) وہ صاف طور پر اس امر کا اعلان کر چکے ہیں کہ ہم اپنا دستور حکومت خود بنانا چاہتے ہیں ...... لہذا باشندگان ہند کی جانب سے کانگریس اس دستور کو اول تا آخر مسترد کرتی ہے ......

کانگریس اپنے تمام ارکان پر واضح کر دینا چاہتی ہے۔ کہ مجالس قانون ساز میں ان کا کام اس دستور

کا مقابلہ کرنے اور اسے ختم کر دینے کی پالیسی پر مبنی ہونا چاہیے..... اس پالیسی کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ حکومت برطانیہ کے لئے اس دستور کو نافذ کرنا غیر ممکن ہو جائیگا..... اسی پالیسی کو مدنظر رکھتے ہوئے آل انڈیا کانگرس کمیٹی اپنے نمائندوں کو ان صوبوں میں وزارتیں قائم کرنے کی اجازت دیتی ہے جن کی مجالس قانون سازمیں ان کو اکثریت حاصل ہے"۔

لیکن آج عملاً کیا ہو رہا ہے؟ اور عملاً کو بھی چھوڑ دیئے، وہی زبانیں جو پچھلے سال کے وسط تک دستور کو توڑنے کا اعلان کر رہی تھیں، آج بلا کسی شرم و لحاظ کے کیا کہہ رہی ہیں؟ اس کا جواب ہم سے نہیں خود انہی زبانوں سے سن لیجئے۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل ہری پورہ کانگریس کے بھرے اجلاس میں فرماتے ہیں:۔

"چند مہینہ کی مختصر مدت میں کانگریسی وزارتوں نے اس سے زیادہ کام کیا ہے۔ جتنا برطانوی حکومت ڈیڑھ سو برس میں نہ کر سکی تھی"۔ (ٹائمز آف انڈیا۔ مورخہ ۲۳ر فروری ۳۸ء)

یعنی وہی دستور جو بالکل ناکارہ تھا اس قدر کارآمد بن گیا! اور سنیئے۔ کانگریس کے صدر مسٹر سوبھاش چندر بوس فرماتے ہیں:۔

"کانگریس محض تخریبی طریق کار پر اعتماد نہیں رکھتی۔ بلکہ اندر رہ کر تعمیری طریق کار کو مناسب سمجھتی ہے"۔ (ٹریبیون مورخہ ۱۵ر جون ۳۸ء)

اس سے بھی زیادہ کھل کر مسٹر بوس نے ابھی حال میں آسام کے مخلوط وزارت پر تبصرہ کرتے ہوئے اس امر کی شکایت کی تھی کہ جب یورپین گروپ ملک معظم کی حکومت چلانے کے لئے ہے تو کانگریس پارٹی کی مخالفت پر کیوں کمربستہ ہو گیا، درآنحالیکہ کانگریس پارٹی بھی اس حکومت کو چلانے ہی کے لئے وزارت سنبھال رہی ہے۔

اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اب دستور کو توڑنے کے بجائے اس کو چلانے کی پالیسی اعلانیہ اختیار کی جا چکی ہے۔ اور اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ آج ڈیڑھ سال سے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کی حدود کا پورا پورا لحاظ رکھکر ہز میجسٹی کی حکومت چلائی جا رہی ہے۔ کانگریسی وزارتیں اگر حقیقت میں دستور کو توڑنا چاہتیں تو ان کے لئے بہت آسان تھا کہ عوام الناس کی فلاح و بہبود کے لئے ایسی تدابیر

اختیار کرتیں جن کی اجازت دینے سے گورنر انکار کر دیتے۔ اور پھر اس پر استعفیٰ دے کر آئینی انقباض (Deadlock) پیدا کر دیتیں۔ مگر یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ وہ پوری وفاداری کے ساتھ اس دستور کو اسی طرح چلا رہی ہیں جس طرح کوئی لبرل جماعت چلاتی۔ وہ پوری کوشش کر رہی ہیں کہ گورنروں سے تصادم نہ ہونے پائے خواہ عوام الناس کی فلاح و بہبود کے وہ بہت سے کام رہ جائیں جن کا انہوں نے وعدہ کر کے عوام سے ووٹ حاصل کئے تھے۔

انہوں نے عوام سے کہا تھا کہ ہم شرح مالگذاری میں ۵۰ فیصدی کمی کر دیں گے۔ مگر کس صوبہ میں تخفیف کی گئی؟ یوپی میں جب اس وعدہ کو یاد دلایا گیا تو وزارت نے صاف جواب دیدیا کہ سابقہ حکومت جتنی تخفیف کر چکی ہے اس سے زیادہ نہیں کی جا سکتی۔ اور یہ صرف اس لئے کہ مالگذاری کم کرنے سے بجٹ کا توازن بگڑ جاتا ہے، اور بجٹ کا توازن بگڑنا اس سامراج کے مفاد کے خلاف ہے جس کی وفادارانہ خدمت انجام دینے کیلئے یہ حضرات ایوان وزارت میں تشریف لےگئے ہیں انہوں نے عوام کو سبز باغ دکھایا تھا کہ ہم تمہاری غریبی کا علاج کریں گے۔ مگر کون صداقت پسند آدمی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ احمد آباد، شولہ پور، کانپور، بمبئی وغیرہ مقامات پر کانگریسی حکومتوں نے مزدوروں کے ساتھ جو برتاؤ کیا۔ وہ سابقہ حکومت کے ظالمانہ برتاؤ سے کچھ مختلف ہے؟ اور اس پر طرفہ ماجرا یہ ہے کہ غریب مزدور اپنے حقوق تسلیم کرانے کے لئے ہڑتال یا پکٹنگ کرتے ہیں تو وہی گاندھی جی جو ان سب ہتھیاروں کو برٹش گورنمنٹ کے خلاف استعمال کر چکے ہیں، ان پر تشدد کا الزام عائد کرتے ہیں اور بے تکلف فرماتے ہیں کہ، کارخانے داران کے خلاف پولیس کی امداد طلب کرتے ہیں اور کانگریسی حکومت ایسی امداد بہم پہنچانے میں بالکل حق بجانب ہیں[۱]۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا۔ کہ ہم ان ظالمانہ قوانین کو منسوخ کرائیں گے۔ جو انگریزی حکومت نے نافذ کر رکھے ہیں، اور باشندگان ہند کو ان کی کھوئی ہوئی مدنی آزادیاں (Civil Liberties) واپس دلائیں گے۔ مگر واقعات کیا ہیں؟ کیا وہ اکثر و بیشتر قوانین بدستور موجود نہیں ہیں جو انگریزی حکومت نے

---

[۱] ملاحظہ ہو نیشنل کال مورخہ ۲۱ جولائی ۳۸ء۔ ہریجن مورخہ ۱۳ اگست ۳۸ء۔

نافذ کئے تھے؟ کیا خود کانگریسی حکومتیں ان قوانین کو استعمال نہیں کر رہی ہیں؟ اور کیا انہیں استعمال کرنے میں ٹھیک انہی دلائل سے کام نہیں لیا جا رہا ہے جو کسی زمانے میں انگریزی حکام پیش کیا کرتے تھے؟ وہی کانگریسی حکام جو کہتے تھے کہ بغاوت ہمارا مذہب ہے<sup>لہ</sup>، مدراس میں مسٹر باٹلی والا پر بغاوت کا مقدمہ چلاتے ہیں۔ اور بمبئی اور سی پی میں مسٹر بابت اور مسٹر جگناتھ پرشاد ورما پر بغاوت کا مقدمہ چلانے کی دھمکی دیتے ہیں۔ شولاپور میں "یوم استقلال" کے موقع پر بہت سے آدمیوں کو گرفتار کیا جاتا ہے اور ایک شخص کو سزائے تازیانہ بھی دیجاتی ہے۔ حالانکہ اس سزا کے خلاف کسی زمانہ میں شور قیامت برپا کر دیا جاتا تھا۔ سیاسی ایجی ٹیشن کو روکنے کے لئے دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ، گولیاں چلانا اور لاٹھی چارج کرنا آج بھی اسی طرح جاری ہے جس طرح پہلے تھا۔ کرمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ جس کے خلاف کانگریس نے سب سے زیادہ شور مچایا تھا، آج کانگریسی حکومتیں بے تکلف اس کو استعمال کر رہی ہیں۔ احمد آباد میں مزدوروں کا سر کچلنے کے لئے اسے استعمال کیا گیا ہے۔ اور مدراس میں ہندی کی اشاعت کے خلاف احتجاج کرنیوالوں پر آج پوری آزادی کے ساتھ اس سے کام لیا جا رہا ہے۔ وہی سی آئی ڈی جس کی زیادتیوں پر کسی زمانہ میں ماتم کیا جاتا تھا، آج کانگریسی حکومتیں اپنے سیاسی مخالفین کے خلاف اس کی خدمات سے پورا فائدہ اٹھا رہی ہیں اور مدراس کا وزیر اعظم صاف کہتا ہے کہ جب ہم نے حکومت کا انتظام ہاتھ میں لیا ہے، (یعنی جب ہم اس حکومت کو توڑنے کے لئے نہیں بلکہ چلانے کے لئے نکلے ہیں) تو سی آئی ڈی سے کام لئے بغیر چارہ نہیں۔ وہی پریس کی آزادی جس کو باشندوں کے مدنی حقوق کی فہرست میں نمایاں جگہ دی جاتی تھی، آج اس کو خود پامال کیا جا رہا ہے۔ اخبارات کی ضمانتیں بھی ضبط ہوتی ہیں، نئی ضمانتیں بھی مانگی جاتی ہیں اور ایڈیٹروں پر مقدمے بھی چلائے جاتے ہیں۔ اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے۔ کہ حکومت بمبئی نے حال ہی میں پولیس کمشنر کو پورے اختیارات عطا کئے ہیں کہ جس شخص کو چاہے بغیر مقدمہ چلائے شہر بدر کر دے<sup>ٹ</sup>۔

---

لہ تفصیلات کیلئے ملاحظہ ہو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کلکتہ کی رپورٹ مندرجہ ٹائمز آف انڈیا یکم نومبر ۱۹۳۷ء

ٹ نیز ٹریبیون کا مقالہ افتتاحیہ ۲۸ اگست ۱۹۳۸ء اور اخبار سرونٹ آف انڈیا ۱۴ جولائی ۱۹۳۸ء

اس پورے کارنامہ کا خلاصہ خود ایک صاف گو کانگریسی مسٹر ایم این رائے کی زبان میں یہ ہے کہ:-

"اسمبلیوں میں جانے کا پروگرام اختیار کرنے کے بعد، خصوصاً وزارتیں قبول کرنے کے بعد کانگریسی سیاست تیزی کے ساتھ دستوریت (Constitutionalism) کی طرف ترقی معکوس کر رہی ہے اور برطانوی امپیریلزم سے لڑنے کی انقلابی ذہنیت کافور ہو گئی ہے"۔

"کانگریسی وزیروں نے امپیریلسٹ اسٹیٹ کی مشین کو اندر سے توڑنے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی جو جنگی مورچے (Strategic Positions) ان کے قابو میں آگئے ان کو بھی غنیم پر حملہ کرنے کیلئے انہوں نے استعمال نہیں کیا۔ وہ تو کانگریس ہائی کمانڈ کی اجازت سے بلکہ اس کی ہدایت کے تحت اسی امپریلسٹ اسٹیٹ کے انتظام کو چلا رہے ہیں جسے توڑنے کا ارادہ ظاہر کر کے وہ گئے تھے"

"ایمانداری کا تقاضا ہے کہ اس امر کا صاف صاف اعتراف کر لیا جائے کہ کانگریسی وزارتیں عوام کی معاشی حالت کو درست کرنے کے لئے کچھ بھی نہ کر سکیں اور نہ موجودہ دستور کی حدود میں رہ کر وہ آئندہ کچھ کر سکیں گی۔

اب یہ بات بالکل عیاں ہو چکی ہے کہ کانگریس کی "جنگ آزادی" کوئی انقلابی جنگ نہیں ہے، بلکہ جیسا میں اوپر بیان کر چکا ہوں، نیم انقلابی نیم دستوری ہے۔ اس کا نقشہ جنگ یہ نہیں ہے کہ مسلسل لڑ کر انگریزی سلطنت کے نظام کو توڑ ڈالا جائے۔ بلکہ نقشۂ جنگ دراصل یہ ہے کہ اسی نظام سلطنت کے اندر رہ کر حکمراں جماعت پر دباؤ ڈالا جائے اور اس سے بتدریج اختیارات حاصل کر کے اپنا اقتدار جمایا جائے۔ پہلے انہوں نے سول نافرمانی کی تاکہ ۱۹۱۹ء کی اصلاحات کا دائرہ وسیع ہو اور زیادہ سے زیادہ اختیارات مل سکیں۔ اس کے نتیجہ میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء حاصل ہو گیا۔ اب یہ اس ایکٹ کے مطابق صوبوں کی حکومتیں چلا رہے ہیں اور اپنے پروگرام کے مطابق، جس کی تشریح میں آگے کروں گا، ملک میں اپنا اقتدار حاصل کر لینا چاہتے ہیں کہ دوبارہ آئینی یا نیم انقلابی ذرائع سے برطانوی سلطنت پر دباؤ ڈال کر مرکزی حکومت میں زیادہ

---

۱؎ ٹریبیون مورخہ یکم مئی ۱۹۳۸ء۔ ۲؎ نیشنل کال مورخہ ۱۳ جولائی ۱۹۳۸ء۔

سے زیادہ اختیار حاصل کریں۔ چنانچہ آجکل اسی غرض کے لئے دوڑ دھوپ ہو رہی ہے۔ جواہر لال یورپ کا چکر لگا رہے ہیں۔ گاندھی جی وائسرائے اور نائب وزیر ہند سے رازکی ملاقاتیں فرما رہے ہیں، بشتیہ موہرتی وفاقی دستور کو قبول کرنے کی شرائط پیش کر رہے ہیں، اور سوبھاش چندر بوس دھمکیوں پر دھمکیاں دیئے چلے جاتے ہیں۔ ایک ہی ٹیم ہے جس کا ہر کھلاڑی اپنا اپنا کام خوبی کے ساتھ کر رہا ہے، اور سب کی منزل مقصود ایک ہے یعنی ہندو راج زیر سایہ برطانیہ۔

(۳)

یہاں پہنچ کر ہندو مہاسبھا اور کانگریس دونوں نظری اور عملی حیثیت سے ایک ہو جاتی ہیں۔ گو ان کے نام اور کام مصلحتہً جدا ہیں۔

نظری حیثیت سے تو دونوں میں نہ پہلے فرق تھا نہ آج ہے۔ دونوں وطنی قومیت کی علمبردار ہیں۔ دونوں اس ملک میں "فرقوں (قوموں) کے امتیازی وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہیں دونوں علیحدگی کے ہر رجحان (Separatist Tendency) کی دشمن ہیں یہٰتی کہ کسی معاملہ میں بھی وہ مسلمانوں کے جداگانہ مفاد کا نام تک سننے کی روادار نہیں۔ دونوں کا آخری نصب العین یہ ہے کہ یہاں ایک قومیت پیدا ہو جائے جو تہذیب، تمدن، اخلاق، معاشرت، زبان، ادب، جذبات وحسیات غرض ہر لحاظ سے بالکل یک رنگ ہو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کانگریس جہاں "ہندوستانی" کا لفظ بولتی ہے وہاں مہاسبھا "ہندو" کا لفظ استعمال کرتی ہے۔ مگر معنی دونوں کے ایک ہیں۔

عملی حیثیت سے بظاہر چند سال تک دونوں میں فرق رہا مگر اب اس حیثیت سے بھی کوئی فرق باقی نہیں۔ کانگریس یہ دعویٰ کرتی تھی کہ اس کا نصب العین کامل آزادی ہے اور وہ انقلابی جدوجہد سے اسے حاصل کرے گی۔ بخلاف اس کے ہندو مہاسبھا کہتی تھی کہ انگریزی سلطنت سے آزاد ہو جانے کے بعد "ایک قوم" بنانے کا عمل دشوار بلکہ محال ہو جائے گا۔ یہ عمل صرف اسی طرح پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے کہ انگریزی سلطنت کے زیر سایہ رفتہ رفتہ حکومت کے اختیارات پر قبضہ کر و۔ انگریز اپنی فطرت سے مجبور ہے کہ یہاں جمہوریت کے انہی تصورات کو درآمد کرے گا جو اس کے

اپنے ملک میں صدیوں سے پرورش پارہے ہیں۔ وہ چاہے لڑا کر حکومت کرنے کی پالیسی پر کتنا ہی عمل کرے اور اس غرض کے لئے یہاں مختلف قومیتوں کے وجود سے فائدہ اٹھانے کی کتنی ہی کوشش کرے مگر جب کبھی وہ جمہوری ادارات قائم کرنے کا ارادہ کریگا تو اس کا ذہن کوئی ایسی صورت نہ سوچ سکے گا جو اس کے اپنے ملک کے جمہوری ادارات سے اصولاً مختلف ہو لہذا اس پر دباؤ ڈال کر جتنی بھی آئینی اصلاحات ملیں گی وہ سب ہندوؤں ہی کو بوجہ ان کی عددی اکثریت کے سیاسی قوت و اقتدار کا مالک بنائیں گی اور اس قوت و اقتدار کو اگر ہوشیاری کے ساتھ استعمال کیا جائے۔ تو معاشی دباؤ تعلیمی انقلاب اور حاکمانہ نفوذ و اثر سے رفتہ رفتہ ہندوستان کی مختلف قومیتوں کو "ایک قومیت" میں تحلیل کیا جاسکتا ہے۔ یہ اور صرف یہی ایک صورت ہے جس سے یہاں "ایک قوم" بنائی جا سکتی ہے۔ لہذا جبتک یہ عمل پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ جائے آزادئ کامل کا نام بھی نہ لینا چاہئے۔ اس سے پہلے انگریزی اقتدار کو مٹانے کی کوشش کرنا بھارت ورش کے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔

پالیسی کا یہ اختلاف چند سال تک محض ظاہری طور پر کانگریس اور مہا سبھا میں رہا۔ مگر آج ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ کانگریس ٹھیک اسی مقام پر آگئی ہے جہاں ہندو مہا سبھا تھی اور دونوں ملکر سامراج کے تحت ناظم (Administrator) کی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ بہار میں سی۔ پی میں، یو۔ پی میں اور دوسرے صوبوں میں کھلے ہوئے بدنام مہا سبھائی کانگریس کے ذمہ دار عہدوں پر فائز ہیں۔ سی پی کی سابق کانگریسی وزارت میں ایک صاحب مسٹر ڈسیکھ بھی شامل تھے اور یہ وہ صاحب ہیں جو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے موقع پر ہندو مہا سبھا کی طرف سے ایک وفد لیکر لندن پہنچے تھے۔ سی پی کے موجودہ وزیر اعظم مسٹر شکلا وہ صاحب ہیں جنھوں نے سوراج پارٹی کے داخلہ کونسل کے زمانہ میں مالوی جی کے زیر قیادت کانگریس سے الگ انڈی پنڈنٹ پارٹی بنائی تھی اور جنھوں نے بعد میں کمیونل اوارڈ کے متعلق کانگریس کی پالیسی سے اختلاف کرکے اس کو انتخابات کا نزاعی مسئلہ بنایا۔ سی پی اسمبلی کا صدر بھی کھلا ہوا مہا سبھائی ہے۔ کانگریس کی طرف سے اسمبلی کی صدارت کرتا ہے اور مسٹر ساورکر سے مل کر حیدرآباد میں ریاست

کے خلاف شورش برپا کرنے کی تدبیریں بھی کرتا ہے۔ بہار میں بھاگلپور اور دوسرے مقامات پر جو فساد ہوئے ان میں کانگریس کے ذمہ دار کارکنوں نے پورا پورا مہا سبھائی پارٹ ادا کیا۔ یو پی میں دوری اور ٹانڈہ وغیرہ کے فسادات ان مہا سبھائیوں نے برپا کرائے جو کانگریس کے عہدوں پر فائز تھے۔ اس قسم کی بیسیوں مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں اور ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قومیت متحدہ، کی خدمت کرنے والے حضرات کس آسانی کے ساتھ کانگریس سے مہا سبھا میں اور مہا سبھا سے کانگریس میں آتے جاتے رہتے ہیں۔

ان دونوں جماعتوں میں اب اگر کوئی فرق باقی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ ایک ہندو مہا سبھا ہے اور دوسری انڈین نیشنل کانگریس۔ مہا سبھا صریح طور پر ہندوؤں کی جماعت ہے۔ کوئی مسلمان اس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ نہ وہ مسلمانوں کو اپنی طرف دعوت دے سکتی ہے۔ نہ مسلمانوں میں جا کر ماس کانٹیکٹ کر سکتی ہے۔ نہ کسی صوبہ کی حکومت پارٹی سسٹم کی بنیاد پر قائم کر سکتی ہے نہ کہیں خالص ہندو وزارت قائم کر کے یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ "یہ قومی وزارت" ہے۔ نہ مسلمانوں سے یہ کہہ سکتی ہے کہ ہمارے عہدنامہ (Pledge) پر دستخط کرو تب تمہیں وزارت میں شریک کیا جائیگا۔ نہ اس کو مولانا ابوالکلام کی خدمات حاصل ہو سکتی ہیں کہ مسلمانوں کی جماعت میں سے کمزور کیریکٹر کے آدمیوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر لائیں اور اس کے آستانہ پر جھکا دیں۔ نہ اسے ڈاکٹر ذاکر حسین کی خدمات میسر آ سکتی ہیں کہ وار دھا اسکیم تیار کریں نہ وہ خان عبدالغفار خاں سے کام لے سکتی ہے کہ ۹۵ فیصدی اکثریت رکھنے والے سرحدی صوبہ کو فیڈریشن کے قیام سے پہلے ہی اس وحدانی طرز حکومت (Unitary Form of Government) کا تابع بنا دیں جس کے مرکز پر ہندوؤں کا کامل اقتدار ہو۔ نہ وہ بہت سے علماء کرام کی خدمات حاصل کر سکتی ہے کہ مسلمانوں کو مذہبی اقتدار کے زور سے اس کے دائرے میں کھینچ کھینچ کر لائیں اور فتویٰ دیں کہ اس جماعت میں شریک ہونا وجوب کا درجہ رکھتا ہے۔ نہ اس کے لئے یہ دعویٰ کرنا ممکن ہے کہ اس کے لیڈر مسلمانوں کے بھی ویسے ہی نمائندے ہیں جیسے ہندوؤں کے ہیں اور جو کچھ وہ بولتے ہیں پوری قوم

کی طرف سے بولتے ہیں۔ سندھ اسلامی اکثریت رکھنے والے صوبوں میں وزارتوں کی توڑ پھوڑ اس خوبی کے ساتھ کر سکتی ہے کہ وزارت مسلمانوں ہی پر مشتمل ہے مگر اشاروں پر ہائی کمانڈ کے رقص کیا کرے نہ اقلیت ہی کے صوبوں میں اس کو مسلمانوں پر یہ اقتدار حاصل ہو سکتا ہے کہ ان کے منتخب کردہ نمائندوں میں سے جسے چاہے وزارت پر سرفراز کرے اور جس کو چاہے کان پکڑ کر نکال دے یہ سب کام کانگریس ہی سے بن آ سکتے ہیں کیونکہ وہ ہندو مہاسبھا نہیں، انڈین نیشنل کانگریس ہے اس فرق کے ساتھ یہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کر رہی ہیں۔ جو کام کانگریس کر سکتی ہے وہ مہاسبھا نہیں کر سکتی۔ اور جو کام مہاسبھا کر سکتی ہے۔ وہ کانگریس نہیں کر سکتی۔ کانگریس پیش قدمی کرنے والی فوج ہے جو آگے بڑھ کر غنیم کے علاقہ پر قبضہ کرتی ہے۔ اور مہاسبھا وہ محافظ دستہ ہے۔ جو عقب میں رہتا ہے تاکہ آگے کی فوج کو حسب ضرورت مدد پہنچاتا رہے۔ کانگریس پر جب کبھی مشترک وطنی جماعت ہونے کی حیثیت سے دباؤ پڑتا ہے، ہندو مہاسبھا فوراً آگے بڑھ کر پشت کو سہارا دیتی ہے، اور مسٹر ساورکر، ڈاکٹر مونجے، بھائی پرمانند وغیرہ شور مچانے لگتے ہیں کہ ہندوؤں کے نمائندے ہم ہیں، گاندھی اور جواہر لال نہیں ہیں۔ ایسے نازک موقع پر اگر عقب میں محفوظ فوج موجود نہ ہو تو مقدمۃ الجیش کو اپنی "قوم پرستی" کا دعویٰ نباہنا مشکل ہو جائے اس فوج کی مدد کام بھی نکال دیتی ہے اور بات بھی بنی رہتی ہے۔

———— ۰ ہم ۰ ————

ہندو مہاسبھا کے ساتھ برٹش گورنمنٹ سے بھی کانگریس کا مفاد اسی نقطہ پر متحد ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں شخصی اغراض رکھنے والی ایک قلیل جماعت کے سوا کوئی آپ کو ایسا نہ ملے گا جو برطانوی اقتدار سے کسی قسم کی مصالحت کرنے پر آمادہ ہو۔ مسلمان نہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام مشرقی ممالک میں اس قیصریت کا فوری، کلی اور قطعی زوال چاہتا ہے، برعکس اس کے ہندوؤں کی قومی پالیسی یہ ہے کہ انگریزی حکومت سے اچھی شرائط پر مصالحت کی جائے یعنی ہندو لڑتا ہے نفع پر سودا کرنے کے لئے اور مسلمان لڑتا ہے معاملہ ختم کرنے کے لئے۔ مزید برآں مسلمان انگریزوں کے کسی کام کا نہیں

کہ اس کی جیب خالی ہے۔ اور ہندو ایک سرمایہ دار قوم ہے جس کے ساتھ تجارتی معاملہ بھی کیا جا سکتا ہے اور آڑے وقت میں مالی مدد بھی اس سے مل سکتی ہے۔ لہٰذا جس طرح فلسطین میں ایک سرمایہ دار قوم کا تعاون حاصل کرنے کے لئے مسلمانوں کو بھینٹ چڑھانا مفید تھا۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی ایک دوسری قوم کا تعاون حاصل کرنے کے لئے ان کو بھینٹ چڑھانا فائدے سے خالی نہیں۔ اسی بنا پر یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ برٹش گورنمنٹ اور کانگریس کے درمیان سودا گر معاملہ ہو رہا ہے صوبوں کی حکومت میں تو سودا پٹ چکا ہے۔ اور اب جو کچھ کھینچ تان ہو رہی ہے صرف مرکزی اقتدار کے معاملہ میں ہے یہ کچھ زیادہ مانگتے ہیں اور وہ کچھ کم پر راضی ہیں اس کے ساتھ ابھی چونکہ معاملہ نیا نیا ہے۔ اس لئے کچھ بدگمانیاں بھی ہیں۔ وہ ابھی پوری طرح اعتماد بھی حاصل کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں تحفظات کی رسی انہوں نے ان کے گلے میں باندھ رکھی ہے۔ جب یہ سلطنت برطانیہ کی محفوظ چراگاہ کی طرف بڑھتے ہیں تو وہ پوری طاقت کے ساتھ رسی کھینچ لیتے ہیں۔ اور جب یہ کھلے میدان میں اقلیتوں کی کھیتی چرنے کے لئے بڑھتے ہیں۔ تو وہ اطمینان کے ساتھ رسی ڈھیلی چھوڑ دیتے ہیں۔ دستور میں اقلیتوں کی حفاظت کیلئے گورنروں کو جو مخصوص اختیارات دیئے گئے ہیں۔ ان کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ اگر کبھی خدانخواستہ کانگریسیوں نے اس سازش (گاندھی جی کے بقول "شریف آدمیوں کی سی قرارداد" Gentleman's agreement) سے جو ان کے اور برٹش گورنمنٹ کے درمیان ہو چکی ہے، انحراف کیا اور تاج کے مفاد کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ تو اس وقت تاج کے بجائے اقلیتوں کے مفاد کی حفاظت کا بہانہ کر کے ان کی گوشمالی کی جا سکے۔

(۵)

اس ملی بھگت میں برطانیہ کا مفاد پوری طرح محفوظ ہے۔ سول سروس پر ہاتھ نہیں ڈالا جا سکتا۔ یورپین باشندوں کے حقوق سے بھی تعرض نہیں کیا جا سکتا۔ سرکار کے مالی مفاد کو بھی نہیں چھیڑا جا سکتا۔ مختصر یہ ہے کہ جن جن چیزوں سے انگریزی سلطنت کی اغراض کا تعلق ہے۔ دستور حکومت میں ان سب کی حفاظت

اچھی طرح کر لی گئی ہے۔ اور کانگریسی وزارتیں جو اس دستور کو عملاً قبول کر کے حکومت کا نظم ونسق چلا رہی ہیں ان حدود میں نہ قدم رکھ سکتی ہیں اور نہ قدم رکھنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اب یہ ظاہر ہے کہ موجودہ دستور کی حدود میں رہ کر کسی ایسے پروگرام پر تو عمل کرنا ممکن ہی نہیں ہے جس پر حقیقت میں "جنگ آزادی" کا اطلاق ہو سکے، کیونکہ "جنگ آزادی" کو خواہ آپ کتنا ہی نیچے گرا لائیں، بہرحال اس کا منشا یہ تو ہونا چاہیئے کہ جہاں باشندگان ہند کا مفاد برطانیہ کے مفاد سے متصادم ہوتا ہو وہاں سرکار کے مفاد کو گرایا جائے اور ہندوستان کی جنتا کے مفاد کو ابھارا جائے، مگر جس دستور میں سرکار کا مفاد محفوظ ہے اس کی پابندی قبول کرنے کے بعد ایسا کرنا غیر ممکن ہے۔ پھر یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ جنگ آزادی کا دعویٰ لیکر اٹھنے والی جماعت اس دستور کو کس لئے قبول کر رہی ہے اور کیوں اسے چلانے پر مصر ہے؟

اس سوال کی تحقیق اگر آپ واقعات کی روشنی میں کرینگے تو یہ حقیقت آفتاب کی طرح نمایاں ہو جائے گی کہ اس وقت کانگریس کے سامنے کوئی پروگرام اس کے سوا نہیں ہے کہ پراونشل اٹانومی سے جو اختیارات بھی حاصل ہو سکیں، انہیں لیکر جدید ہندوستانی قومیت کی تخلیق میں استعمال کیا جائے اور اس ملک کی مختلف قلیل التعداد قوموں میں اپنے امتیازی وجود کو برقرار رکھنے کی جس قدر طاقت باقی ہے اسے حکومت کے زور سے ختم کر دیا جائے۔ نئے دستور کی بنیادی کمزوریوں کے باوجود اس پراونشل اٹانومی والے حصہ کو اسی بنا پر قبول کیا گیا ہے کہ اس کا یہی ایک پہلو روشن ہے۔ اور ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے فیڈریشن والے حصہ کو بھی باہزاراں عشوہ و ناز آخر کار اسی روشن پہلو کی خاطر قبول کیا جائے گا۔ تاکہ مسلم اکثریت والے صوبوں کو مرکزی اقتدار کے واسطہ سے قابو میں لایا جائے۔

اس پروگرام کی ایک ایک دفعہ کو میں الگ الگ بیان کروں گا اور تفصیل کے ساتھ بتاؤں گا۔ کہ اس پر کس طرح عمل ہو رہا ہے۔ اور اس کے نتائج کیا ہیں۔

(۱)

دستور جدید کے مطابق حکومت کے نظام کو چلانے کے لئے کانگریس نے پارٹی سسٹم اختیار کیا ہے۔ پارٹی سسٹم کی مختصر تشریح یہ ہے کہ جس مجلس قانون ساز میں کسی پارٹی کی اکثریت ہو وہاں خالصۃً

اسی کی حکومت قائم ہو جائے اور وہ دوسری جماعتوں کو من حیث الجماعت، حکومت میں شریک نہ کرے۔ یہ حکمراں جماعت اپنی اکثریت کے زور پر جو قانون چاہے گی بنائے گی۔ اور جس تجویز یا مسودہ قانون کو چاہے گی مسترد کر دیگی، پھر اپنے بنائے ہوئے قوانین کو نافذ کرنا بھی اسی پارٹی کے اختیار میں ہوگا، کیونکہ حکومت کا نظم ونسق کلیتہً اسی کی وزارت کے ہاتھ میں رہے گا۔ جو لوگ اس کے اندر داخل ہوں وہ صرف اسی صورت سے داخل ہو سکتے ہیں کہ پارٹی کے عہد نامہ پر دستخط کریں اور اس کے ڈسپلن میں جکڑ دیئے جائیں، پھر جب وہ اس طرح پارٹی ڈسپلن کے تابع فرمان ہو جائیں گے تو ان کے لئے یہ ناممکن ہوگا کہ کسی ایسی تجویز یا مسودہ قانون کی مخالفت کریں جو پارٹی کی طرف سے پیش ہو، یا خود اپنی طرف سے کوئی ایسی چیز پیش کریں جس کی اجازت پارٹی نے نہ دی ہو، یا حکومت کی پالیسی پر نکتہ چینی کریں۔ ان کو ہر حال میں پارٹی کی فرمانبرداری کرنی ہوگی اور اگر آزادی رائے استعمال کرنا چاہیں گے تو انہیں پارٹی سے باہر نکل جانا ہوگا۔ نیز وہ پارٹی کے اندر رہ کر بھی اس کی پالیسی میں کوئی تبدیلی نہیں کرا سکتے جبتک کہ وہ پارٹی میں اکثریت کو اپنا حامی نہ بنالیں۔

حکومت کا یہ سسٹم کانگریس نے ان تمام صوبوں میں اختیار کیا ہے جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے، اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کو عملاً قانون سازی اور تنفیذ قانون دونوں سے بیدخل کر دیا گیا ہے۔ اگر مسلمان کانگریس پارٹی سے الگ رہیں تو وہ اپنی اقلیت کی وجہ سے نہ اپنے مفاد کے لئے کوئی قانون بنوا سکتے ہیں، نہ اپنے مفاد کے خلاف کسی قانون کی منظوری کو روک سکتے ہیں، اور نہ قوانین کو نافذ کرنے والی مشین یعنی وزارت میں ان کا کوئی پرزہ شریک ہو سکتا ہے۔ اور اگر وہ اس پارٹی میں شامل ہو جائیں تو انہیں پارٹی ڈسپلن کے طوق وسلاسل پہننے پڑتے ہیں اور اس کے سوا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا کہ باہر رہتے ہوئے زبان کی جو آزادی وہ استعمال کر سکتے تھے وہ بھی چھن جائے۔ رہا اندر سے پارٹی کی پالیسی پر اثر ڈالنا، تو اقلیت ہونے کی وجہ سے یہاں بھی اس کا کوئی موقع نہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اڑیسہ اور سی پی میں تو علانیہ وہ حکومت کے نظم ونسق سے بے دخل ہیں اور جن صوبوں میں ایک یا دو مسلمان وزیر بنائے گئے ہیں وہاں در اصل مسلمانوں کی جماعت کو بحیثیت

جماعت کو حکومت میں حصہ نہیں دیا گیا ہے بلکہ ان کے ایک فرد یا دو افراد کو انفرادی حیثیت سے نوکر رکھا گیا ہے تاکہ محض اس بات کی نمائش کی جاسکے کہ وزارت میں مسلمان بھی شریک ہیں۔

آئینی حیثیت سے دیکھئے تو ان ملازموں کی حیثیت ذمہ دار وزراء کی نہیں ہے۔ کیونکہ ذمہ دار وزیر وہ ہوتا ہے جس کو اپنی جماعت کی اکثریت کا اعتماد حاصل ہو، اور انہیں اپنی ذات کے سوا کسی کا اعتماد حاصل نہیں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہیں ان مسلمان ووٹروں کا اعتماد حاصل ہے جنہوں نے ان کو منتخب کیا مگر کل مسلمان ووٹروں میں ان کے ووٹروں کا تناسب شاید پانچ فیصدی سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ وزارت میں جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، اکثریت کی نہیں بلکہ اقلیت کی حکومت ہے اور جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے، ان کی اکثریت حکمران ہے کیونکہ ہندو وزیر ہندو ووٹروں کی اکثریت کا اعتماد رکھتے ہیں۔

عملی حیثیت سے دیکھئے تو یہ بالکل بے زور ہیں۔ ان کی پشت پر کوئی طاقت نہیں جس کے بل بوتہ پر یہ کوئی بات زور کے ساتھ کہہ سکیں۔ بخلاف اس کے ہندو وزراء کی پشت پر مجلس قانون سازی کی اکثریت کا زور ہے۔ یہ بیچارے بعض صوبوں میں تو کانگریس پارٹی کے اندر بالکل اکیلے ہیں، اور بعض جگہ صرف دو چار مسلمان ان کی مدد پر موجود ہیں بھی تو وہ غریب خود پارٹی ڈسپلن میں جکڑے ہوئے ہیں۔

اس طرح ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمان وزراء کی حیثیت ایک نوکر سے زیادہ نہیں ہے۔ اور اس حیثیت کا کھلا ہوا مظاہرہ سی پی کے سابق مسلمان وزیر مسٹر شریف کے معاملہ میں ہو چکا ہے۔ انہوں نے جب ایک مسلمان قیدی کو اپنے اختیارات سے کام لے کر رہا کیا اور اس پر مہاسبھائی ہندوؤں نے شور مچایا تو کانگریس ہائی کمانڈ نے کان پکڑ کر ان کو ایوان وزارت سے باہر کر دیا، درآنحالیکہ باقاعدہ تحقیقات سے یہ ثابت ہو چکا تھا کہ انہوں نے نہ تو اس معاملہ میں مذہبی عصبیت سے کام لیا، نہ کسی قسم کی بد دیانتی کی اور نہ جائز قانونی حدود سے تجاوز کیا[1]۔ اس کے برعکس ابھی حال میں مسٹر شریف کے جانشین ہندو وزیر نے اسی قسم کے ایک مجرم کو جسے ہائی کورٹ سے سزا ہو چکی تھی، اپنے اختیارات سے کام لیکر

[1] ملاحظہ ہو مدینہ ۲۵ جون ۱۹۳۸ء

رہا کر دیا اور اس سے کوئی باز پرس نہ ہوئی۔ مسٹر شکلا نے وزارت کا قلمدان سنبھالتے ہی فسادات جبل پور کے ملزموں کو جنہیں سشن سپرد کیا جا چکا تھا، بلاکسی قانونی وجہ کے رہا کر دیا اور اس پر بھی کسی تحقیقات کی ضرورت نہ سمجھی گئی۔[1] پنڈت شکلا سے پہلے ڈاکٹر کھرے کی وزارت پر خود کانگریسیوں نے رشوت، خیانت، کمین اور اپنے متعلقین کو ملازمتوں میں بھرنے کے سخت الزامات عائد کئے تھے، مگر ان کے معاملہ کو گاندھی جی نے یہ کہہ کر رفع دفع کر دیا تھا کہ:-

"کانگریس بہر حال انسانوں پر مشتمل ہے اور وہ خوبیوں اور برائیوں دونوں میں اس قوم کے ساتھ برابر کے حصہ دار ہیں جس کی وہ نمائندگی کر رہے ہیں۔"[2]

اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر کھرے کے ساتھ بعد میں بہت سخت معاملہ کیا گیا، مگر کس وقت؟ جبکہ انہوں نے کھلم کھلا خدایان کانگریس کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ مسٹر شریف کی طرح اگر وہ گھٹنے ٹیک کر ناک رگڑ دیتے تو انہیں کبھی وزارت سے نہ نکالا جاتا۔

---۱۷---

پارٹی گورنمنٹ اور پارٹی ڈکٹیٹر شپ قائم کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ جداگانہ انتخاب ہے کیونکہ اس کی بدولت مسلمانوں کی آواز نمایاں طور پر بلند ہو سکتی ہے اور اگر مسلمان نمائندوں کی بڑی اکثریت کانگریس پارٹی سے الگ رہے تو پارٹی گورنمنٹ قائم کرنے کی صورت میں کانگریس کی مہاسبھائیت بالکل بے پردہ ہونے لگتی ہے۔

مخلوط انتخاب کا مطالبہ اسی بدنمائی کو دور کرنے کے لئے بار بار پیش کیا جاتا تھا۔ مگر انگریز ابھی اس "شریف آدمیوں کی سی قرارداد" پر پوری طرح اعتماد کرنے کے لئے تیار نہ تھا جو اس کے اور کانگریس کے درمیان زیر تجویز تھی اس لئے مسلمانوں کے مفاد کی خاطر نہیں بلکہ اپنے مفاد کی خاطر اس نے جداگانہ انتخاب کو برقرار رکھا۔

اس میں ناکام ہونے کے بعد دوسری تدبیر یہ نکالی گئی کہ جداگانہ انتخاب میں اندر سے نقب

[1] ٹریبیون مورخہ ۱۹ رجون ۳۸ء - [2] ملاحظہ ہو مدینہ ۱۳ راگست ۳۸ء

لگائی جائے یعنی کانگریس براہ راست مسلمان حلقہ ہائے انتخاب میں جاکر مسلمان ووٹروں کو ہموار کرے اور ایسے مسلمانوں کو خود مسلمان رائے دہندگان ہی سے منتخب کرالائے جو پارٹی ڈسپلن اور ڈکٹیٹرشپ کو بخوشی قبول کرنے والے ہوں، اپنے صوبہ کی کانگریس پارٹی کے اور پھر اس پر ہائی کمانڈ کے غلام بنکر رہیں۔ جس طرح یہ آقا انہیں بٹھائیں اسی طرح بیٹھیں اور جس طرح اٹھائیں اسی طرح اٹھ جائیں، جس قسم کے قوانین ہندو اکثریت پاس کرنا چاہے انہیں مسلمانوں کی طرف سے بے چون وچرا منظور کرلیں۔ اور مسلمانوں کی قومیت کو فنا کرنے کے لیے جو تدبیریں کوئی مہاتما یا کوئی پنڈت سوچے ان کو مسلمانوں میں نافذ کرنے کی زحمت خود مہاتما یا پنڈت صاحب کو نہ اٹھانی پڑے بلکہ اس خدمت کو کوئی خانصاحب یا کوئی سید صاحب انجام دیں اس کا نہایت پاکیزہ نام مسلم ماس کانٹیکٹ رکھا گیا ہے

اگر یہ چیز کامیاب ہو جائے اور مسلمانوں کے حلقہائے انتخاب اس حد تک کانگریس پارٹی کے زیر اثر آجائیں کہ وہ اپنے مطلب کے جس مسلمان کو چاہے ان سے منتخب کرا سکے، اور جو مسلمان اس کے مقابلہ پر کھڑا ہو وہ ناکام ہو جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر کبھی کسی موقعہ پر مسلمانوں کے مفاد کی شدید پامالی دیکھ کر کانگریس پارٹی کے کسی مسلمان رکن کو غیرت بھی آگئی اور وہ رکنیت سے مستعفی بھی ہوگیا تو کانگریس پارٹی خود اس کے حلقۂ انتخاب میں اس کو شکست دیگی۔ اور اس سے کم تر غیرت رکھنے والے کسی مسلمان کو مسلمان ووٹروں سے منتخب کرالائے گی تاکہ وہ اس سے زیادہ بے پروائی کے ساتھ اپنی قوم کے مفاد کو پامال کرائے۔ ماس کانٹیکٹ اس انتہائی نتیجہ تک پہنچکر رہے گا۔ اگر اس کی تائید میں ہمارے علماء کرام چند سال اسی سرگرمی کے ساتھ کوشش کرتے رہے۔ پھر جب تیر ہاتھ سے نکل چکے گا۔ تو اس کو واپس لانے کے لیے بخاری شریف کا ختم پڑھا جائے گا۔

—— (۸) ——

اس کے بعد مسلم اکثریت کے صوبوں کا سوال باقی رہ جاتا ہے۔ سو ان کے لیے اجتماعی ماہی گیری (Mass Contact) اور انفرادی صید افگنی (Individual Contact) دونوں سے آجکل کام لیا جارہا ہے۔

مسلمان دس پندرہ برس سے جس خواب غفلت میں مبتلا تھے اس کے بدترین نتائج آج ہم دیکھ رہے ہیں جدید آئین کے نافذ ہونے پر جب اسمبلیوں کے لئے انتخابات ہوئے تو یہاں کوئی ایسی منظم پارٹی نہ تھی۔ جو قوم کے مفاد کو سامنے رکھکر کام کرتی اور مسلمان رائے دہندوں کو صحیح سیاسی تعلیم دیکر ایسے نمایندے منتخب کراتی جو بے غرض، مخلص اور ایک مرکزی نظام کے مطیع ہوتے۔ جگہ جگہ مختلف جماعتوں نے محض شخصی اغراض اور طائفہ بندی کی بنیاد پر الکشن لڑائے۔ جس شخص کو کسی قسم کا اثر حاصل تھا وہ ایک پارٹی بناکر کھڑا ہوگیا، اور دوسری پارٹی کے مقابلہ میں نبرد آزما ہوا۔ قومی پروگرام اور قومی پالیسی نہ اس کے پاس نہ اس کے پاس، ہر ایک کے سامنے وزارتیں، مناصب اور عزت وجاہ۔ اس طرح یہ لوگ اسمبلیوں میں پہنچے اور ان کی بدولت مسلمانوں کی اکثریت ایک بندھے ہوئے جتھے کا زور رکھنے کے بجائے بہت سی ٹکڑیوں میں بٹ کر بے زور ہوگئی۔ ان چھوٹی چھوٹی پارٹیوں کے ساتھ ساتھ ایک اچھی خاصی تعداد میں انڈی پنڈنٹ ارکان بھی منتخب ہو کر پہنچے۔ انڈی پنڈنٹ کے معنی عام فہم زبان میں مرغ بادنما کے ہیں، جو کوئی قومی مقصد یا قومی پروگرام لیکر نہیں جاتا بلکہ اس لئے جاتا ہے کہ شخصی حیثیت سے قسمت آزمائی کرے اور جدھر کامیابی کا موقع دیکھے ادھر چلا جائے۔ عام مسلمان ووٹر ایسے جاہل کندۂ ناتراش تھے کہ انہوں نے نہ ان مرغانِ بادنما سے پوچھا اور نہ ان جتھے بند لیڈروں سے کہ آپ حضرات کے پاس پروگرام کیا ہے؟ آپ کس لئے اسمبلی میں جانا چاہتے ہیں؟ آپ کس کیرکٹر کے لوگ ہیں؟ آپنے پہلے ہماری قوم کے لئے کیا کیا اور اب کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ یہاں کسی کے ذہن میں یہ تھا ہی نہیں کہ اسمبلی کیا بلا ہوتی ہے، جدید دستور کیا ہے، اور ان اسمبلیوں میں جو کچھ ہوگا اس کے کیا اثرات ہماری زندگی پر پڑیں گے۔ یہاں تو دیکھنے والوں نے بس یہ دیکھا کہ اسمبلی کی کرسی عزت کی کرسی ہے تو کیوں نہ ہمارے قبیلہ کا آدمی اس کرسی پر پہنچے؛ چاہے وہ خر مشخص ہی کیوں نہ ہو، غرض اس قومی حماقت کا، جو نہایت وسیع پیمانہ پر ملک کے کئی صوبوں میں کی گئی، یہ انجام ہوا کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں کوئی منظم جماعت ایسی پیدا ہی نہ ہو سکی جو ہندو اکثریت کے صوبوں کی طرح مضبوط ہاتھوں سے حکومت کے اقتدار پر قبضہ کرتی۔ اور ایک بنیان مرصوص بنکر جم جاتی

ادھر کانگریس جب ہندو اکثریت کے صوبوں میں ٹھوس بنیاد پر وزارتیں قائم کر چکی تو اس نے مسلم اکثریت والے صوبوں کی طرف دیکھا اور ان کی کمزوری کو بھانپ لیا۔ ان کے لئے اس نے جو پروگرام مرتب کیا وہ یہ تھا کہ ان صوبوں میں جو پارٹیاں برسر پیکار ہیں ان کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرائے، ان کے افراد کی نفسانی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا جائے، ان میں جو ضعیف ترین کیرکٹر کے لوگ ہوں انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر اور چھانٹ چھانٹ کر آلۂ کار بنایا جائے اور اس طرح مسلمانوں کی جمعیت میں سے جتنے آدمی توڑے جا سکیں انہیں کانگریسی اقلیت کے چھوٹے مگر منظم بلاک کے ساتھ ملا کر ایسی وزارتیں قائم کرا دی جائیں جو کانگریس ہائی کمانڈ کی تابعِ فرمان ہوں، یا اگر اس میں کامیابی نہ ہو سکے تو کم از کم وہاں وزارت کو اس قدر کمزور اور اس قدر بے اثر بنا دیا جائے کہ وہ ادھ موئی ہو کر رہ جائے۔ ماتم کا مقام ہے کہ کانگریس کی طرف سے اس جلیل القدر خدمت کا بیڑا ہماری ہی قوم کے ایک شخص نے اٹھایا، اور اس سے بھی بڑھ کر ماتم کا مقام یہ ہے کہ یہ شخص وہ تھا جس سے ہم شیخ احمد مجدد سرہندی اور شاہ اسمٰعیل شہید کی جانشینی کے متوقع تھے، جو کبھی اسلامی نظام جماعت کا سب سے بڑا داعی تھا جس نے برسوں مسلمانوں کو وحدت و مرکزیت کی دعوت دی، جس کی زبان سے ہم کبھی ایاکم والتفرقہ فان الشاذ من الناس للشیطان کما ان الشاذ من الغنم للذئب[1] پر درسِ موعظت سنا کرتے تھے، جو کسی زمانہ میں ہم کو تلقین کیا کرتا تھا کہ "جماعتی زندگی کی معصیت کا تخم (یعنی نظام جماعت کا نہ ہونا) ایسا تخم ہلاکت ہے، جو فوراً بربادی کا پھل لاتا ہے اور پوری قوم کی قوم تباہ ہو جاتی ہے"۔ مسلمانوں کی بدقسمتی کہ بالآخر وہی امت کے پراگندہ سروں سے چوسر کھیلنے نکلا اور اس نے تمام ہندوستان کو اپنی قوم کا یہ تماشا دکھلایا کہ اس قوم کے چیدہ اور سربرآوردہ لوگ بھی کتنے ذلیل، کتنے بودے کیرکٹر کے لوگ ہیں، کس آسانی کے ساتھ ان کو آپس میں لڑایا جا سکتا ہے، اور کس بے شرمی کے ساتھ یہ لیلائے وزارت کے پیچھے اس پارٹی سے اس پارٹی میں ادھر

---

[1] اثر سیدنا علی رضی اللہ عنہ۔ تفرقہ سے بچو کیونکہ بچھڑا ہوا آدمی شیطان کا حصہ ہے جس طرح بچھڑی ہوئی بکری بھیڑیے کا حصہ ہوتی ہے۔

اس سے اس میں منتقل ہو جاتے ہیں۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا جو شدت الم سے بے اختیارانہ قلم سے نکل گیا میں بتانا یہ چاہتا تھا۔ کہ اس وقت مسلم اکثریت کے صوبوں میں کانگریس کی پالیسی کا منتہائے مقصود یہ ہے کہ جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں بھی ان کو خود مختارانہ حکومت نہ کرنے دی جائے بلکہ ان کے مناقشات سے فائدہ اٹھا کر یا ماس کانٹیکٹ کے ذریعہ سے ان کے بڑے حصہ کو شدھ کر کے وہاں ایسی وزارتیں قائم کرائی جائیں جو کانگریس ہائی کمانڈ کی تابع فرمان ہوں۔ اگر اس مقصد میں کانگریس کامیاب ہو گئی (اور کیوں نہ ہو گی جبکہ آج ہماری قوم اٹھارویں صدی سے بھی زیادہ فیاضی کے ساتھ اپنے فاتح خود مہیا کر رہی ہے) تو یوں سمجھئے کہ یہ فیڈریشن سے بھی پہلے ایک ایسے فیڈریشن کا قیام ہو گا جس میں مرکزی اقتدار تمام تر ہندو اکثریت کے ہاتھ میں رہے گا۔ اور یہ مرکز برطانوی حکومت کے تجویز کردہ وفاقی مرکز سے بدرجہا زیادہ سخت و ہمہ گیر ہو گا۔ اس میں بات بات پر وزراء کے کان کھینچے جائیں گے، ذرا ذرا سے قصور پر ان کو پکڑ بلایا جائے گا، ان پر تحقیقاتی کمیشن بٹھا دیئے جائیں گے اور اگر انہوں نے کچھ مقابلہ کی ہمت کی تو لات مار کر ان کو ایوان وزارت سے باہر کر دیا جائے گا۔ جب وزارتیں مرکزی اقتدار کے ہاتھ میں اس درجہ بے بس ہوں اور پھر اقتدار ہندو اکثریت کے ہاتھ میں ہو، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں پراونشل اٹانومی حرف غلط کی طرح مٹ گئی اور ہندو اس جگہ بھی مسلمانوں پر حکمراں ہو گئے۔ جہاں وہ اقلیت میں ہیں۔

صوبہ سرحد کی مثال اس نتیجہ کی توضیح کے لئے بالکل کافی ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ جہاں ۹۵ فیصدی مسلم اکثریت ہے، وہاں بھی حکومت کی پالیسی اور وزارت کی گردن کانگریس ہائی کمانڈ کے ہاتھ میں ہے۔ وردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم کو سمجھنے اور سرحدی پٹھانوں میں نافذ کرنے کے لئے پشاور سے ماہرین تعلیم دہلی اور وردھا بھیجے جاتے ہیں[1]۔ سرحد کا وزیر اعظم ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے وعدہ کرتا ہے کہ انجمن حمایت اسلام کی ریڈریں مسلمان بچوں کو بھی نہ پڑھائی جائیں گی، اور

[1] مشعل کال مورخہ ۲۸ جون ۳۸ء ڈیلی ٹیبون مورخہ ۲۲ جولائی ۳۸ء

ایک ہندو کے معاوضہ میں قبائل کے دس مسلمانوں کو پکڑا جائے گا اس نیاز مندی پر بھی یہ حال ہے کہ وزیر اعظم صاحب اگر ایک مسلمان ملزم کو الزام سے بری پاکر ملازمت پر بحال کر دیتے ہیں۔ تو ہندو مہا سبھا ان کے خلاف شور محشر برپا کر دیتی ہے اور کانگریس ہائی کمانڈ اس کی باز پرس کے لئے وزیر صاحب کو بمبئی کھینچ بلاتی ہے اس کے بعد بھی جو شخص نہ دیکھ سکے کہ یہ سڑک سیدھی ہندو راج کو جا رہی ہے، اس کے حق میں بس یہی دعا کرنی چاہیئے کہ خدا اسے آنکھیں دے۔

یہ تمام تفصیلات جو نمبر ۶، ۷ اور ۸ میں بیان کی گئی ہیں ان پر غور کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جدید دستوری اصلاحات سے فائدہ اٹھانے کا جو طریقہ کانگریس نے اختیار کیا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس دستور کی بدولت جس قدر سیاسی طاقت برطانوی قیصریت سے ہندوستان کی طرف منتقل ہو وہ کلی طور پر ہندوؤں کے ہاتھ میں آجائے۔ جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں تو براہ راست ہندو اکثریت کے محکوم ہونگے اور جہاں ان کی اکثریت ہے، وہاں ان کی حکومت کو کانگریس ہائی کمانڈ کا مطیع بنالیا جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ماس کانٹیکٹ کے ذریعہ سے یہ کوشش برابر جاری رکھی جائیگی کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا علیحدہ سیاسی وجود ختم ہو جائے، نہ ان کی اپنی کوئی علیحدہ سیاسی پالیسی رہے اور نہ مستقل سیاسی قیادت بلکہ وہ اس بڑے سیاسی مجموعہ میں گم ہو کر رہ جائیں جس میں اصول جمہوریت کی بنا پر ہندو عنصر کی حیثیت بہر حال غالب اور فیصلہ کن رہے گی۔ اس مجموعہ میں گم ہو جانے کے بعد جو مجموعہ کے لیڈر ہوں گے وہی مسلمانوں کے بھی لیڈر رہوں گے اور ظاہر ہے کہ اکثریت کی طاقت ہندوؤں ہی کو لیڈر بنائے گی۔ اسی طرح مسلمانوں کی سیاسی پالیسی بھی وہی ہوگی جو مجموعہ کی ہوگی۔ اور کھلی ہوئی بات ہے کہ جہاں سرشماری پر ہر بات کا فیصلہ ہو وہاں ہر پالیسی کا ہندو پالیسی ہونا لازم ہے۔

ہندوستان کے آئندہ سیاسی ارتقاء کو ہندو لیڈر جس راستہ پر لیجانا اور جس منزل تک پہنچانا چاہتے ہیں اس کا پہلا اور ضروری مرحلہ یہی ہے۔ اگر اس مرحلہ پر وہ سیاسی ارتقاء کا رُخ اپنی منزل کی طرف پھیرنے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر لازماً آئندہ جو قدم بھی اٹھے گا۔ اسی منزل کی طرف اٹھے گا کیونکہ اس مرحلہ پر ان کی

کامیابی کے معنی یہ ہیں کہ گھوڑے کی باگیں پوری طرح اُن کے ہاتھ میں آجائیں۔ اسی لئے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۳۵ئہ کو نامنظور کرنے کا بار بار اعلان کرنے پر بھی انہوں نے اسے منظور کر لیا۔

اب ہمارے بہت سے سادہ لوح بھائی بار بار پلٹ کر ہم سے پوچھتے ہیں کہ بتاؤ اس ڈیڑھ سال کی حکومت میں کانگریسی وزارتوں نے کہاں اور کیا مسلمانوں پر ظلم کیا؟ ایک صاحب نے تو اخبارات میں چیلنج بھی چھپوایا تھا۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ بالفرض انہوں نے کوئی ظلم نہیں کیا۔ مان لیجئے کہ بڑی ہی اچھی حکومت کی مگر یہ کونسی عقلمندی ہے کہ اپنی باگیں بالکل دوسروں کے ہاتھوں میں دیدیجائیں؟ سوال ان اشخاص کا نہیں ہے جو آج برسر اقتدار ہیں بلکہ سوال ادارہ کی نوعیت کا ہے جس ادارہ کی نوعیت یہ ہو کہ ایک قوم دوسری قوم پر حکمران بنجائے اور ایک قوم دوسری قوم کے قبضۂ تصرف و اختیار میں چلی جائے ظلم ایسے ادارہ کی عین فطرت میں داخل ہوتا ہے۔ آج بالقوہ ہے تو کل بالفعل ہوگا اور بالفعل ہوئے بغیر نہ رہے گا۔

—— ۹ ——

مختلف قوموں اور تہذیبوں کے ملک میں اگر سیاسی اقتدار کسی ایک قوم کے ہاتھ میں مرتکز ہو جائے اور پھر وہ تمام ملک کے لئے ایک قومیت اور ایک تہذیب و تمدن کی تشکیل کرنا چاہے تو یہ فطری اور لازمی بات ہے کہ اس قومیت اور اس تہذیب و تمدن کی شکل اسی برسر اقتدار قوم کے منشا کے مطابق ہوگی۔ دوسری قوموں کی تہذیب اور قومیت کا رنگ اسمیں پھیکا ہوگا اور پھیکا ہوتا چلا جائیگا۔ یہانتک کہ بالکل تحلیل ہو جائیگا نامساوی آمیزش میں انصاف ممکن ہی نہیں، خواہ کتنی ہی نیک نیتی کے ساتھ انصاف کی کوشش کی جائے کانگریس نے اقتدار حاصل کرنیکے بعد مستقبل کے ہندستان کی تشکیل جس ڈھنگ پر شروع کی ہے، اس کو آنکھیں کھولکر دیکھئے۔ آپ کو خود نظر آجائیگا کہ اس نقشہ میں مسلمانوں کی قومیت اور تہذیب کے لئے کوئی جگہ نہیں سب سے پہلے وردھا اسکیم کو لیجئے[1]۔ یہ اسکیم مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں بنائی گئی ہے[2]۔ اس کی خصوصیت یہ ہے

---

[1] میرے پیش نظر وہ اردو رپورٹ بھی ہے جو رسالہ جامعہ مورخہ جنوری ۳۸ئہ میں شائع ہوئی ہے اور وہ انگریزی پمفلٹ بھی ہے جو Basic National Education کے نام سے ہندوستانی تعلیمی سنگھ نے شائع کیا ہے۔ مگر میں یہ دونوں اردو رپورٹ ہی کا حوالہ دونگا۔ [2] جامعہ جنوری ۳۸ئہ صلا۔

کہ اسکیم کے مطابق عام باشندگان ہند کے بچوں کو سات برس سے چودہ برس کی عمر تک لازمی جبری تعلیم دیجائے گی۔[1]

لازمی اور جبری تعلیم کا مفہوم خوب ذہن نشین کر لیجئے، جس علاقے میں حکومت کے زور سے یہ اسکیم نافذ ہوگی وہاں کا کوئی باشندہ نہ تو اپنی اولاد کو اس نظام تعلیم میں شریک ہونے سے روک سکے گا اور نہ کوئی دوسرا نظام تعلیمی ایسا موجود ہوگا جس میں وہ انہیں داخل کر سکے۔ آدمی کا کیرکٹر جس عمر میں بنتا ہے یا یوں کہئے کہ جس عمر میں اس کی آدمیت کی تشکیل ہوتی ہے وہ بیشتر بلکہ تمام تر اس اسکیم کے قبض و تصرف میں آجاتی ہے۔ انگریزوں کا بنایا ہوا نظام تعلیم لازمی و جبری نہ تھا۔ اس میں جبر کا عنصر صرف اس حیثیت سے تھا کہ جو اس کے دائرے سے باہر رہیگا وہ مادی کامیابی کے مواقع سے محروم رہے گا۔ تاہم اس میں آدمی کے لئے یہ اختیار باقی تھا کہ اگر اس محرومی کو قبول کرلے تو اس نظام تعلیمی سے آزاد رہ کر جس نظام کو پسند کرے اس میں شریک ہو جائے لیکن زیر بحث اسکیم میں سرے سے یہ اختیار باقی نہیں رہتا۔ یہاں آدمی مجبور ہے کہ اپنی آئندہ نسل کو اسی نوعیت کا آدمی بنانے کے لئے سپرد کردے جس نوعیت کے آدمی یہ اسکیم بنانا چاہتی ہے۔

اچھا اب دیکھئے کہ یہ اسکیم کس نوعیت کے آدمی بنانا چاہتی ہے؟ وہ بنیادی تصورات جن پر یہ پوری اسکیم تیار کی گئی ہے حسب ذیل ہیں:۔

(۱) ہندوستان کی پوری آبادی کو "ایک قوم" فرض کیا گیا ہے۔ اسکیم میں جگہ جگہ ہم کو اس قسم کے فقرے ملتے ہیں

"مہاتما گاندھی نے اس کا بیڑا اٹھایا ہے کہ تعلیم کی ایک ایسی راہ نکالیں گے جو ہندوستانیوں کی طبیعت کے مناسب ہو اور جس سے ساری قوم کی تعلیم کا کام کم سے کم وقت میں چل نکلے" (صفحہ ۱۱)

"اسے تعلیم کی اچھی پالیسی اور قوم کی ترقی کی ضروری تدبیر سمجھ کر قبول کر لینا چاہئے" (صفحہ ۱۴)

"اور قوم کے بچوں کو اس تعلیمی اسکیم کا مقصد اور اس کی قیمت سمجھا سکے" (صفحہ ۱۲۸)

اسکیم کا نام ہی "بنیادی قومی تعلیم" کی اسکیم ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نظام تعلیم کی بنیاد ہی قومیتوں کی نفی پر رکھی گئی ہے۔ اس میں کسی کی جداگانہ قومیت کا رنگ نہیں آسکتا۔ یہ بنایا ہی اس لئے گیا ہے کہ ہماری آئندہ نسل کے ذہن سے اس تخیل کو نکال دے کہ "ہندوستانی" کے سوا ان کی اور قومیت بھی ہے

(۲) شدھ ہندوستانی بن جانے کے بعد سب سے پہلی اور سب سے اہم صفت جس سے بچہ کو متصف ہونا

[1] جامعہ جنوری سنہ ۳۸ء صفحہ ۱۴۱

چاہئے وہ یہ ہے کہ وہ ایک اچھا کاروباری آدمی ہو، ہر علم اس کو اس لئے سکھایا جائے، اور وہ اسی لئے اس کو سیکھے کہ روٹی پیدا کرنے میں اس سے مدد ملے۔ اسکیم کے واضعین کی نگاہ میں آدمیت اور کمانے کی قابلیت دونوں مترادف المعنی الفاظ ہیں۔ پوری اسکیم پر تعلیم کا مادی نقطۂ نظر اس قدر غالب ہے کہ اس کے زیر اثر جو نسل پرورش پائیگی وہ مادہ پرست بنکر اٹھے گی اور خوردن برائے زیستن کے بجائے زیستن برائے خوردن کی معتقد ہوگی۔ ایک طرف تعلیم دینے والی حکومت رعایا کے بچوں کی تعلیم کا انتظام اس ذہنیت کے ساتھ کریگی کہ اس پر تعلیمی مصارف کا کم سے کم بار پڑے اور بچے کسی ایسی دستکاری کے ذریعہ سے تعلیم حاصل کریں جس کی آمدنی سے استادوں کی تنخواہیں اور مدرسے کا خرچ نکل آئے۔ دوسری طرف پورا نظام تعلیم بچے میں یہ ذہنیت پیدا کریگا کہ کما کھانا اس کی زندگی کا اولین بلکہ شاید ایک ہی مقصد ہے تعلیم کا مرکز و محور کسی نہ کسی بنیادی دستکاری مثلاً زراعت یا نوربانی یا لکڑی یا دھات کے کام کو رکھا گیا ہے اور پورے تعلیمی کورس کو اسی محور کے گرد گھمایا گیا ہے۔ اس میں دو بنیادی مقصد واضعین کے پیش نظر ہیں۔ ایک یہ کہ :-

"ہر سمجھدار شہری کو سماج کا کام کرنے والا رکن ہونا چاہئے" (صفحہ ۱۴)

"یہ اسکیم اس لئے بنائی گئی ہے کہ ملک میں کام کرنے والے پیدا ہوں جو ہر مفید کام کو چاہے وہ میلا اٹھانے ہی کا کام ہو عزت کے قابل سمجھیں، جو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہتے ہوں" (صفحہ ۱۴)

"ہمارا مقصد عالم فاضل پیدا کرنا نہیں بلکہ ہوشیار سمجھدار پڑھے لکھے دستکار پیدا کرنا ہے۔ جو صحیح خیالات اور سماج کی خدمت کا شوق رکھتے ہوں" (ص ۱۲۸)

دوسرا مقصد یہ ہے کہ :-

"مہاتما جی نے صاف لفظوں میں کہا ہے کہ حکومت کو اس کا ذمہ لینا چاہئے کہ اپنے بڑھنے والے شہریوں کے کام کی پیداوار کو اس بھاؤ (بازار کے بھاؤ) پر خریدیگی۔ ... ہم اس رائے کی پوری طرح تائید کرتے ہیں اس آمدنی سے جو مالی فائدہ ہوگا اسے چھوڑ کر لیں بھی ہمارا خیال ہے کہ سکھانیوالوں اور سیکھنے والوں کے کام کی اچھائی کو جانچنے اور ناپنے کا کوئی پیمانہ ہونا چاہئے" (صفحہ ۱۱۵)

یعنی تعلیم کی کامیابی کو جانچنے اور ناپنے کا پیمانہ یہ ہے کہ طلبہ نے کتنا کمایا اور استادوں نے ان کو

صفحہ ۱۱۲

کتنا کمانے کے قابل بنایا۔ اسی مادی نقطۂ نظر کی بنا پر ساڑھے پانچ گھنٹے کے اوقات تعلیمی میں سے ۳ گھنٹہ ۲۰ منٹ دستکاری کے لئے وقف کئے گئے ہیں، اور باقی اوقات میں جو دوسرے علوم پڑھائے جائینگے ان میں بھی بنیادی مقصد یہ رکھا گیا ہے کہ وہ کاروباری زندگی میں مددگار ہوں۔ اس پوری اسکیم پر نظر ڈالنے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اس کے پیش نظر ایک صنعتی سماج (Industrial Society) پیدا کرنا ہے جس کے افراد زیادہ تر مادی قدروں ہی سے واقف ہوں، مادی پیمانے ہی سے زندگی کی ہر چیز کو ناپیں، اور بلند تر اخلاقی و روحانی چیزوں کی قدر کرنے کا ذوق ہی ان میں پرورش نہ پا سکے۔ ایسی سماج کے ماحول میں ہر روحانی تہذیب خود ٹھٹھر کر رہ جائے گی۔[1]

(۳) اس مادہ پرست سوسائٹی میں "شہریت" (Citizenship) کا جو مطمح نظر (Ideal) اختیار کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ:-

"یہ ہونے والی بات ہے کہ نئے ہندوستان کی سماجی زندگی، سیاست، معیشت اور تہذیب میں جمہوریت کا رنگ دن بہ دن بڑھتا جائے گا"۔ (صہ ۱۱۳)

جمہوریت کے رنگ کا مفہوم شاید عام لوگ نہ سمجھ سکیں اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہندوستان کے باشندے اپنی معاشرت اور تہذیب میں آئندہ یک رنگ ہوتے چلے جائیں گے۔ یہ دراصل اسکیم کے واضعین کا نصب العین ہے جس کو انہوں نے شدت یقین کی بنا پر پیشگوئی کے انداز میں بیان کیا ہے۔ اس نصب العین کو سامنے رکھکر وہ آئندہ نسل کو ایسی تعلیم دینا چاہتے ہیں جس سے:-

"بچے کو عام طور پر انسانوں اور خاص طور پر ہندوستان کے لوگوں کی ترقی سے دلچسپی ہو جائے"۔

"اس کے دل میں وطن کی محبت ہو۔ وہ ہندوستان کے پچھلے زمانے کی عزت کرے اور آنیوالے زمانے کے بارے میں یہ عقیدہ رکھے کہ یہ ایک ایسی سماج کا گھر ہو گا جس کی نیو مل کر کام کرنے اور محبت،

---

[1] کوئی شخص ہماری تنقید سے یہ نہ سمجھے کہ ہم کسب رزق کو غیر اہم اور غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمیں اس کی اہمیت سے ہرگز انکار نہیں۔ مگر ہمارا اور وردھا اسکیم کے نقطۂ نظر میں وہی فرق ہے جو خوردن برائے زیستن اور زیستن برائے خوردن میں ہے ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ روٹی مقصود بالذات ہو اور دوسرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مقصد حیات اس سے بلند تر ہو اور روٹی اس مقصد کی خاطر زندہ رہنے کیلئے ہو۔ پہلا نقطۂ نظر اگر کسی سوسائٹی پر چھا جائے تو اسلام اس میں زندہ نہیں رہ سکتا۔

سچائی اور نیاؤ پر رکھی جائے گی"

"سب کے دل میں ایک دوسرے کے مذہب کی اور دنیا کے سب مذہبوں کی عزت پیدا ہو جائے ....
دنیا کے مذہبوں کے اصول بتا کر یہ ثابت کیا جائے کہ خاص خاص باتوں میں سب مذہب ایک ہیں"۔
"قومی تہواروں اور قومی ہفتے کا منانا ہر اسکول کی زندگی میں ایک خاص چیز ہونا چاہیئے" (صفحہ ۱۱۸، ۱۱۹)

ان سب بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ اسکیم بنانے والوں کے پیش نظر مختلف مذاہب کے پیرووں کو ملا کر ایک سماج یعنی ایک ہیئت اجتماعی یا ایک سوسائٹی بنانا ہے۔ اس لئے وہ ہر مذہب کی ایسی تعلیمات کو بچوں کے ذہن سے خارج رکھنا ضروری سمجھتے ہیں جو ان میں مذہبی انفرادیت پیدا کرتی ہوں۔ تمام مذاہب کے متعلق یہ نظریہ ان کے ذہن میں بٹھانا چاہتے ہیں کہ ان میں اصلاً کوئی فرق نہیں ہے۔ وطن پرستی ان میں پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ مذہبیت کی بنیاد پر الگ الگ رہنے کے بجائے وطنیت کی بنیاد پر ایک دوسرے سے پیوستہ ہو جائیں۔ ہندوستان کے پچھلے زمانے کی عزت ان کے دل میں پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان سب میں قومی افتخار کے جذبات ایک ہی سرچشمے یعنی ہندوستان کے زمانہ ماضی سے پیدا ہوں اور بیرون ہند کی تاریخ سے ان کے جذبات کا تعلق منقطع ہو جائے۔

وطنی قومیت بنانے کے لئے یہ چار عنصر ضروری ہیں، اور ہر وہ تعلیمی اسکیم جس کا بنیادی مقصد وطنی قومیت بنانا ہو اس پر مجبور ہے کہ مذاہب کے ایسے علم کو آئندہ نسل کے دل و دماغ سے دور رکھے جو ان کے فرق اور اختلافات کو نمایاں کرنے والا ہو اگر وہ شرک اور توحید، خدا پرستی اور بت پرستی، پیغمبر اور اوتار، عقیدۂ آخرت اور عقیدۂ تناسخ کے فرق کو بچوں کے ذہن میں اتر جانے دیگی تو اپنے عین مقصد کو نقصان پہنچائے گی۔ اس کے لئے تو ناگزیر ہے کہ بچوں کے مذہبی علم کو صرف اس قسم کی باتوں تک محدود رکھے کہ دیکھو جھوٹ بولنا سب مذہبوں میں گناہ ہے، چوری سب میں حرام ہے، زنا کو سب منع کرتے ہیں، وغیر ذٰلک۔ اسی طرح وہ اس پر بھی مجبور ہے کہ جن قوموں کو افتخار کے جذبات بیرون ہند کی تاریخ سے ملتے ہیں ان کے اس سرچشمے کو بند کرے اور پراچین سمے کے ہندوستان سے ان کا تعلق جوڑے۔ اگر وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور عمرؓ اور علیؓ، اور خالد رضی اللہ عنہم سے وابستگی کو یونہی قائم رہنے دے گی تو اپنے اساسی مقصد پر خود ضرب لگائیگی

اس چیز کو مہاتما گاندھی نے صاف طور پر بیان کر دیا ہے:۔

"ہم نے وردھا کی تعلیمی اسکیم سے مذاہب کی تعلیم کو باہر رکھا ہے، اس لئے کہ آج مذاہب جس طرح پڑھائے جاتے ہیں اور جس طرح ان پر عمل کیا جاتا ہے وہ وحدت پیدا کرنے کے بجائے اختلاف پیدا کرنے کا موجب ہے مگر میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ جو سچائیاں تمام مذاہب میں مشترک ہیں وہ سکھائی جاسکتی ہیں اور سکھائی جانی چاہئیں"

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی عقائد کی تعلیم دینا اس پالیسی اور اس مقصد ہی کے خلاف ہے جس کے لئے یہ ساری اسکیم بنائی گئی ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب اپنے ایک بیان میں فرماتے ہیں کہ "وردھا اسکیم میں یہ تو کہیں نہیں لکھا کہ مذہبی تعلیم نہ ہونی چاہئے۔ اس وقت جو طریقہ جاری ہے ہم نے اسی کو برقرار رکھا ہے یعنی مدرسہ اوقات کے ماسوا جو گروہ چاہے اپنے بچوں کی مذہبی تعلیم کا انتظام کرے" لیکن مہاتما گاندھی کا بیان اور خود ڈاکٹر ذاکر حسین کی اپنی اسکیم ان کے اس قول کی تکذیب کیلئے کافی ہے۔ جس قسم کی شہریت پیدا کرنے کو انہوں نے اپنی تعلیمی اسکیم کا مقصود ٹھیرایا ہے، اس کو یہ چیز بھی نقصان پہنچائیگی کہ مسلمان یا دوسرے مذاہب کے پیرو اپنے بچوں کو مذہبی عقائد کی تعلیم خارج از اوقات مدرسہ دیں۔ اگر وہ متضاد باتیں نہیں کرنا چاہتے تو انہیں یوں کہنا چاہئے کہ ہماری خواہش تو یہی ہے کہ کوئی گروہ اپنے بچوں کو ایسے عقائد کی تعلیم نہ دے جو ہمارے نصاب تعلیم کے برعکس انہیں یہ سکھاتے ہوں کہ سب مذاہب کے اصول ایک نہیں ہیں لیکن اگر کوئی گروہ اوقات مدرسہ کے ماسوا ایسی تعلیم دینا چاہے تو ہم مجبوراً برداشت کریں گے کیونکہ جبراً ہم اسے روک بھی نہیں سکتے۔ ڈاکٹر صاحب ایک معقول اور تعلیم یافتہ آدمی ہیں۔ وہ کم از کم اضداد میں تمیز تو کر سکتے ہیں۔ ان کے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ ایک نظام تعلیمی کی پالیسی یا تو یہ ہو سکتی ہے کہ بچے میں اسلامی قومیت کا شعور پیدا کیا جائے یا یہ ہو سکتی ہے کہ اس میں ہندوستانی قومیت کا۔ ہندوستانیت کا نہیں بلکہ ہندوستانی قومیت کا شعور پیدا کیا جائے۔ اگر ان کے تجویز کردہ نظام کی پالیسی پہلی ہے تو وہ بتائیں کہ ان کے نصاب میں کونسی چیز ہے جو کسی مسلمان بچے میں اسلامی قومیت کا شعور پیدا کرتی ہو۔ یا پیدا کرنا تو درکنار اس کو کم از کم باقی ہی رکھتی ہو؟ اور اگر ان کی پالیسی دوسری ہے تو وہ صاف صاف اس بات کا اقرار کیوں نہیں کرتے کہ ہم اسلامی

ا؎ نیشنل کال مورخہ ۸ جولائی ۱۹۳۸ء ۲؎ ٹریبیون مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۳۸ء

قومیت کا شعور مٹا کر ہندوستانی قومیت کا شعور پیدا کرنا چاہتے ہیں؟ یہ کیا ہے کہ وہ صریحاً دوسری پالیسی اختیار بھی کرتے ہیں۔ اور پھر مسلمانوں کو یہ بھی یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ہم تمہارے بچوں میں سے اسلامی قومیت کا شعور مٹانا نہیں چاہتے۔ اگر وہ شمال کی طرف چل کر یہ سمجھتے ہیں کہ جو لوگ جنوب کی طرف جانا چاہتے ہیں ان کا مقصود بھی فوت نہ ہوگا، تو وہ ہمیں معاف فرمائیں، ہمیں ان کے ذی عقل ہونے میں بھی شبہ ہے اور اگر وہ ارادہ ہی رکھتے ہیں کہ جنوب کی طرف پہنچنے کی خواہش رکھنے والوں کا مقصد فوت ہو جائے، مگر انہیں یقین یہ دلانا چاہتے ہیں کہ ان کا مقصد فوت نہ ہوگا تو پھر منافقت کا شدید تر الزام ان پر عائد ہوتا ہے اور بہتر ہے کہ وہ اس سے بچنے کی کوشش فرمائیں۔

واردھا اسکیم کے انگریزی ایڈیشن میں جو تفصیلی نصاب درج کیا گیا ہے، افسوس کہ اس کا ترجمہ اردو میں شائع نہیں کیا گیا ورنہ اسے دیکھنے کے بعد ہر شخص اندازہ کر سکتا تھا کہ اس نصاب میں مسلمان بچوں کے شعور اسلامی کو فنا کرنے کا کس قدر مکمل انتظام کیا گیا ہے۔

مادری زبان کے شعبہ میں تیسرے درجہ والوں کو بودھ، عیسیٰ اور محمدؐ کی اور چوتھے درجہ والوں کو بڑے بڑے آدمیوں، مثلاً زرتشت، سقراط، حسینؓ، ابراہام لنکن، ٹالسٹائے، سن یات سین اور گاندھی کی کہانیاں پڑھائی جائیں گی۔

سماج کے علم میں ویدک عہد کی کہانیوں کے ساتھ موسیٰ، ابراہیمؑ اور مارکس اریلیس کے حالات اور درجہ چہارم میں قدیم ہندوستان، بودھ مت، جین اور عیسیٰ اور عیسائیوں کے حالات بتائے جائیں گے۔

درجہ پنجم میں خاص طور پر اسلامی دور کو رکھا گیا ہے اور اس کے خاص خاص مضامین یہ ہیں:-

۱- محمدؐ، عمرؓ، حسینؓ، عمر ابن عبدالعزیزؒ کے حالات۔

۲- ہندوستان سے مسلمانوں کے تعلق کی ابتدا۔ محمد بن قاسم، خواجہ معین الدین چشتی۔

۳- ہندی اسلامی تہذیب کے ارتقا کی داستان

۴- ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذہب ایک دوسرے پر کس طرح اثر انداز ہوئے۔ اس کی توضیح۔ امیر خسرو، کبیر، گرونانک، اکبر اور دارا شکوہ کے حالات سے۔

۵۔ مشترک تمدنی زندگی کا ارتقاء۔ غذاء، لباس، تفریحات، مشترک تہوار، معاشرتی رسوم اور آداب اطوار

۶۔ مشترک سیاسی زندگی اور ملکی نظم ونسق۔ شیر شاہ، اکبر اور ٹوڈرمل۔

۷۔ زبان و ادب میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات اور ہندوستانی کا ارتقاء بحیثیت مشترک زبان کے۔

۸۔ فنون لطیفہ اور موسیقی۔ امیر خسرو، تان سین، ہندو مسلم فن تعمیر اور اس کے نمونے۔

۹۔ حسب ذیل شخصیتوں کے حالات زندگی:۔ البیرونی، ابن بطوطہ، فیروز شاہ تغلق، بابر، چاند بی بی، نورجہاں اور چند صوفی بزرگ مثلاً داؤد، کبیر، نانک، بابا فرید۔

۱۰۔ دنیا کو اسلامی تہذیب نے کیا دیا؛ علیؓ بحیثیت انسان اور عالم۔ بلالؓ بحیثیت نمائندہ حبشی جمہوریت ہارون الرشید کی علمی سرپرستی صلاح الدین بحیثیت نمائندہ شجاعت مسلمین۔ عبدالرحمٰن الناصر اور اندلس کی اسلامی تہذیب۔ اسلامی سلطنت کی وسعت جغرافی تعلق کے ساتھ۔

اس پورے نقشہ میں دیکھئے، مسلمانوں کے پیغمبر اور مذہبی پیشوا عام مشاہیر کی صف میں بیٹھے ہیں، بلکہ کہیں کہیں ان کو گویوں کے ساتھ بٹھایا گیا ہے مسلمان بچے ان کو اس حیثیت سے نہ جانیں گے کہ وہ ان کے دین کے ستون ہیں بلکہ اس حیثیت سے جانیں گے کہ دنیا کے دوسرے بڑے بڑے آدمیوں میں سے وہ بھی ہیں۔ ہندوستان میں اسلامی تہذیب کی تاریخ اس طرح ان کے دماغ میں اتاری جائے گی کہ ہندو اور مسلمانوں کے مذہب اور تہذیب کے میل جول سے جو چیز اکبر اور دارا شکوہ اور کبیر اور نانک نے پیدا کی اس کی خوبی اور معقولیت ان پر نقش ہو جائے۔ اس سے ان میں کبیر پنتھی اور برہمو سماجی شعور تو پیدا ہو سکتا ہے۔ مگر اسلامی شعور ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا۔ اس تعلیم کے ساتھ اگر ہمارے علماء نے لڑ بھڑ کر کچھ مذہبی تعلیم کا پیوند لگوا بھی دیا تو اس سے کیا حاصل ہوگا؛ سارا نظام تعلیمی جس بنیاد پر اٹھایا گیا ہے، جو مقصد اس کی اساس میں رکھ دیا گیا ہے اور جس تعلیمی پالیسی پر یہ تعمیر شروع سے آخر تک ہوتی ہے اس میں دینیات کی تعلیم کا جوڑ قطعاً بے نتیجہ ہوگا۔ اسلامی ہائی اسکولوں میں دینیات کی تعلیم سے جو کچھ نتائج حاصل کئے گئے ہیں بس ویسے ہی کچھ نتائج اس وردھا اسکیم میں بھی دینیات کی قلم لگانے سے حاصل ہو جائیں گے

دلیل، واحد قومیت، مادہ پرست سوسائٹی اور مخلوط سماج کی اس تشکیل میں اخلاقی رنگ بھی ضروری

تھا، اس لئے کہ اخلاق کے بغیر نئی ہندی تہذیب نامکمل رہی جاتی ہے۔ مذاہب اور ان کی شریعتوں کو تو تعلیم سے خارج کر دیا گیا۔ اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ آخر ان شہریوں کی اخلاقی تربیت کس بنیاد پر ہو؟ وردھا اسکیم نے اس سوال کو اس طرح حل کیا کہ ہند جدید کے "پیغمبر" مہاتما گاندھی کی روحانی تعلیم پر "ہندوستانی قوم" کے اخلاق کی بنیاد رکھ دی۔

"ہندوستان کی زندگی کا راستہ الگ ہے۔ اس نے ہر طرح کی آزادی حاصل کرنے کیلئے اہنسا کا طریقہ لیا ہے ہمارے بچوں کو یہ سکھانے کی ضرورت ہے کہ اہنسا کا طریقہ ہنسا سے اچھا ہے۔" (جامعہ صفحہ ۱۱)

"جن لوگوں نے قوموں کو آزاد کرایا ہے اور امن کے ذریعہ سے صلح حاصل کی ہے ان کی کہانیاں کورس کی کتابوں میں خاص طور پر ہونی چاہئیں۔ انسانوں کی زندگی سے ایسے سبق سکھانے چاہئیں جن سے اہنسا اور اس کے ساتھ کی خوبیوں کا ہنسا اور دھوکے اور دغا سے اچھا ہونا ثابت ہو۔" (صفحہ ۱۹)

اس طرح تمام مذاہب کی تعلیم خارج کر کے مہاتما گاندھی کے مذہب کی تعلیم داخل کر دی گئی۔ اب جو نسل ہندوستان کی درسگاہوں سے پرورش پا کر نکلے گی اس کے اخلاقی تصورات دین گاندھی پر مبنی ہوں گے۔ ہندوستان کی زندگی کا راستہ۔ اور مذہب کا مفہوم اس کے سوا نہیں کہ وہ زندگی کا راستہ ہی ہے — یہ ہوگا کہ وہ جہاد بالسیف کو دھوکے اور دغا کا قریبی رشتہ دار سمجھے گا اور اہنسا کو عقیدۃً اس پر ترجیح دیگا۔

سات برس سے چودہ برس کی عمر تک لڑکوں اور لڑکیوں کو یہ تعلیم لازماً اور جبراً دیجائیگی اور اس عمر میں یہ بچے اس نظام تعلیمی کے سوا کسی دوسرے نظام تعلیم میں شامل نہ ہو سکیں گے۔ اور جو والدین خود غیر تعلیم یافتہ ہیں یا جن کے پاس مالی ذرائع مفقود ہیں وہ بطور خود بھی ان کی مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام نہ کر سکیں گے۔ حد سے حد پانچ فیصدی آدمیوں نے اگر اپنے بچوں کی مذہبی تعلیم کا کوئی انتظام کر بھی لیا تو وہ بس موجودہ نسل تک ہے۔ دوسری نسل جو وردھا اسکیم کے مدرسوں سے تعلیم پا کر اٹھے گی اس پر مادی نقطہ نظر اور جدید ہندی قومیت کے تصورات کا اتنا غلبہ ضرور ہوگا کہ اسے اپنی اولاد کو مذہبی تعلیم دینے کی زیادہ پروا نہ ہوگی۔ لہٰذا یقین رکھنا چاہئے۔ کہ تیسری نسل تک پہنچتے پہنچتے ہندوستان ایک "قوم" بن جائیگا۔ انگریزوں نے کامل سیاسی اقتدار حاصل کر کے میکالے کی تعلیمی اسکیم نافذ کی تھی۔ جو نہ آدھے ہندوستانیوں کو پورا انگریز بنا سکی۔ نہ پورے ہندوستانیوں کو آدھا

انگریز۔ ہندو دونے ابھی سیاسی اقتدار کی پہلی سیڑھی پر ہی قدم رکھا ہے اور اسی مرحلہ پر وردہ اسکیم ہماری جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ سے بنوالی ہے جو انشاء اللہ سارے ہندوستانیوں کو پورا ہندوستانی بنا کر چھوڑیگی۔ اس کے بعد کسے شک ہو سکتا ہے کہ تاریخ میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کا مرتبہ میکالے سے بلند تر نہیں ہے اور یہ مہاتما گاندھی کی مہربانی ہے کہ انہوں نے یہ شرف خود حاصل کرنیکے بجائے ڈاکٹر صاحب کی طرف منتقل کر دیا۔

(۱۰)

سی پی میں ایک دوسری تعلیمی اسکیم بنائی گئی ہے جو "ودیا مندر اسکیم" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے مصنف صوبہ کے وزیر اعظم پنڈت شکلا ہیں جو مالوی جی کے خاص چیلوں میں سے ہیں۔ انہوں نے یہ نام الہ آباد کے ودیا مندر ہائی اسکول سے لیا ہے جو مالوی خاندان کا قائم کیا ہوا ہے تخیل اور نقشہ گروکل سسٹم سے ماخوذ ہے۔ کانگریس پارٹی نے ۳۰ رجولائی ۳۷ء کو ان کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی تھی جس کا مقصد دیہات میں عمومی لازمی تعلیم کے لئے ایک اسکیم وضع کرنا تھا۔ ۳۱ راگست کو یہ کام مکمل ہوا۔ ۵ نومبر کو حکومت سی پی کے تسلیم کردہ تعلیمی ادارات کی فیڈریشن نے اور ۲۴ رنومبر کو محکمہ تعلیم کے افسروں کی مجلس نے، اور ۲۴ ردسمبر کو سی پی اسمبلی کی کانگریس پارٹی نے اسے منظور کیا، مگر مارچ ۳۸ء تک اس کی زیارت نہ مسلم تعلیمی ادارات کو، نہ مسلمان اخبارات کو، نہ خود سی پی کے مسلمان ممبروں کو نصیب ہوئی۔ مسلمانوں کے سامنے یکایک مارچ کے اجلاس اسمبلی میں یہ اسکیم اس وقت آئی جب حکومت کے بجٹ میں اس کے لئے دو لاکھ روپیہ سالانہ کی امداد منظور کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔ اسمبلی کے ۱۴ مسلمان ممبروں میں سے ۱۳ نے سختی کے ساتھ اس کی مخالفت کی چودھویں مسلمان مسٹر شریف تھے جنہیں اس وقت وزارت کا شرف حاصل تھا مگر انہوں نے بھی رکن حکومت ہونے کے باوجود رائے دینے سے احتراز کیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ ۸ لاکھ مسلمانان صوبہ متوسط کے باضابطہ نمائندے ہیں وہ اسے بالاتفاق نامنظور کر چکے ہیں اور اس کے بعد سے مسلمانوں کی تمام نمائندہ جماعتوں حتی کہ صوبہ متوسط کی مسلم قوم پرست جماعت، اور اسلامی اخبارات نے بالاتفاق اس کی مخالفت کی ہے

---

نیشنل کال مورخہ ۱۰ رجون ۳۸ء ص۲۔ "ودیا مندر اسکیم" شائع کردہ حکومت صوبہ متوسط صفحہ ۲۔ یہ میرے پاس سی پی گورنمنٹ کی شائع کردہ اردو و انگریزی دونوں اسکیمیں ہیں مگر میں اردو داں ناظرین کی سہولت کیلئے اردو ایڈیشن ہی کا حوالہ دوں گا۔

لیکن ۴ ستمبر ۳۸ء کو کانگریسی حکومت کی جانب سے جو پریس کمیونک شائع کیا گیا ہے اس میں "چند مسلمان افراد اور بعض مسلمان جماعتوں کی مخالفت" کہہ کر اس متحدہ قومی مخالفت کو ہلکا کرنے کی کوشش کی گئی ہے بالکل اسی انداز میں جس میں ان کے انگریز استاد اب سے دو سال پہلے تک خود انکی چیخ پکار کو ہلکا قرار دیا کرتے تھے اسکیم کو منظور کرنے کے بعد جو مجلس نصاب بنائی گئی ہے اس میں سی پی کا ایک مسلمان بھی نہ لیا گیا بلکہ باہر سے ڈاکٹر ذاکر حسین خاں اور ڈاکٹر اشرف کی خدمات حاصل کی گئیں تاکہ نئی سرکار کے منشا کے مطابق کام کر سکیں مسلمانوں کے یہ نمائندے "بھی صرف نصاب کے اصول مقرر کرنے کی حد تک مامور بکار رکھے گئے اصل کام تو نصاب کے اصولوں کو عملی جامہ پہنانا یعنی کتب نصاب مقرر کرنا ہے جسے ٹکسٹ بک کمیٹی کرتی ہے۔ اور اس کمیٹی میں برائے نام بھی کوئی مسلمان نہ رکھا گیا۔ یہ بالکل اس کمیٹی کے اختیار میں ہے کہ اصولوں کو جس شکل میں چاہے ڈھال لے۔ اور یہ اختیار بالکل ہندوؤں کا حصہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سی پی کے محکوم مسلمان اپنی آیندہ نسل کی تعلیم کے معاملہ میں کچھ نہیں بول سکتے۔ ان کے نئے حکمران جو کچھ ان کے حق میں فیصلہ کر دیں اس کے آگے انہیں سر جھکا دینا چاہیئے۔ یہ ہے اس "سوراج" کی حقیقی تصویر جس کے لئے کانگریس جد و جہد کر رہی ہے اور اس تصویر کو قبولیت کا شرف جناب مولانا ابوالکلام نے عطا فرمایا ہے کہ ۲۵ جون ۳۸ء کو آپ بنفس نفیس ودیا مندر ٹریننگ اسکول وردھا میں تشریف لے گئے اور "قومی تہذیب" کو ترقی دینے کیلئے اس ادارہ کی صدارت سرانجام فرمائی۔[1]

یہ اسکیم خالصتہ دیہی علاقوں کیلئے بنائی گئی ہے یعنی اس کا اثر سی پی کے ان لاکھوں مسلمانوں پر پڑیگا جو ۳۹۷۶۲ دیہات میں بکھرے ہوئے اور ۹۸ فیصدی ہندو اکثریت میں گویا آٹے میں نمک کی حیثیت سے پھیلے ہوئے ہیں۔ نئی کانگریسی حکومت انکی تعلیم کا انتظام کرنیکا ذمہ نہیں لینا چاہتی بلکہ یہ چاہتی ہے کہ یہ لوگ ۹۸ فیصدی ہندو اکثریت کے ساتھ مل کر اس تعلیمی انتظام کو قبول کریں جو مجموعی طور پر کیا جائے اسی غرض کیلئے یہ اسکیم بنائی گئی ہے خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

---

[1] [illegible] حضرت مولانا [illegible] اس اخبار نے نقل کیا ہے وکٹ سی پی گورنمنٹ کا پریس کمیونک مورخہ ۴ ستمبر ۳۶ء متعلقہ ودیا مندر اسکیم صفحہ ۹۶

(۱) جو مدارس اس اسکیم کے تحت قائم کئے جائیں گے ان کا نام "ودیا مندر" تجویز کیا گیا ہے۔ لفظ مندر سے صاف مذہبیت کی بو آتی ہے۔ ایک عام ہندوستانی "مندر" کے معنی ہندوؤں کی عبادت گاہ ہی کے سمجھتا ہے مگر سی پی کی حکومت اور مہاتما گاندھی، دونوں کو اصرار ہے کہ یہ نام قابل اعتراض نہیں ہے۔ گویا اس امر کا فیصلہ کہ مسلمانوں کے نزدیک کیا چیز قابل اعتراض ہونی چاہئے اور کیا نہ ہونی چاہئے، خود مسلمانوں کے کرنیکا نہیں بلکہ ان کے حکمرانوں کے کرنیکا ہے۔ اس پر مزید فریب کاری ملاحظہ ہو۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمان اپنے خرچ سے جو مدرسے قائم کریں ان کا نام ودیا مندر نہیں، بیت العلم رکھ لیں۔ مگر اسکیم کے تحت مدرسہ صرف اس جگہ قائم کیا جاسکتا ہے جہاں کم از کم چالیس لڑکے پڑھنے والے ہوں اور جس کیلئے کم از کم دو سو روپے سالانہ آمدنی کی جائداد وقف کی جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جہاں مسلمان اتنی اقلیت میں ہیں کہ ان کی آبادی سے ۴۰ لڑکے فراہم نہیں ہوسکتے، یا جہاں وہ اس قدر غریب ہیں کہ مطلوبہ زمین وقف نہیں کرسکتے وہاں ان کے بچوں کو ہمیشہ ودیا مندر ہی میں تیاری کرنی ہوگی۔ اس کا نفسیاتی اثر جو کچھ آئندہ نسل پر ہوگا۔ اسکا اندازہ ہر شخص کرسکتا ہے

(۲) اسکیم سردست اختیاری ہے مگر آگے چلکر اس کو جبری بنادیا جائیگا، یعنی ہر اس گاؤں یا مجموعہ دیہات کو جس سے چالیس لڑکے لڑکیاں فراہم ہوں ایک ودیا مندر لازماً قائم کرنا ہوگا۔ وہاں لوگوں کو مجبور کیا جائیگا کہ دو سو روپے ماہانہ آمدنی کی جائداد وقف کریں۔ اور اس علاقہ کی تمام خیرات بھی ودیا مندر کی طرف منتقل ہوگی۔ اسکیم کے آخر میں ارشاد ہوا ہے:-

"چھوٹے بڑے منصوں اور دیگر مذہبی خیراتی اداروں، مندروں، مسجدوں وغیرہ کے مالکوں کو احساس ہونا چاہئے کہ ہندوستان کی تاریخ میں اب وہ وقت آگیا ہے کہ وہ از خود پیش قدمی کریں اور اس سے پہلے کہ وقت ہاتھ سے نکل جائے اپنی خدمات پیش کرنے کا فخر حاصل کریں۔ (اسکیم صفحہ ۱۵)

اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ ایک جبری ولازمی اسکیم ہے اور مسلمانوں کے مذہبی اوقاف اور مساجد کے اوقاف بھی اس میں حصہ لینے پر مجبور کئے جائیں گے۔

---

سٹ ہیرکن مورخہ ۵ اکتوبر ۱۹۳۸ء اور سی پی گورنمنٹ کا پریس کمیونک مورخہ ۱۰ ستمبر ۱۹۳۸ء سی پی گورنمنٹ کا کمیونک مورخہ ۱۴ ستمبر ۱۹۳۸ء ودیا مندر اسکیم صفحہ ۶-۸۔ ودیا مندر اسکیم صفحہ ۶-۸-۹-۱۵

(۳) ہر مدرسہ کے لئے ایک کمیٹی بنائی جائیگی جس کے ارکان کا بیشتر حصہ حق رائے دہندگی بالغان کے اصول پر مخلوط انتخاب سے منتخب ہوگا، اور مدرسہ کی جائداد منقولہ وغیر منقولہ دیہاتی پنچایت یا ڈسٹرکٹ کونسل یا حکومت صوبہ کی ملک تصور ہوگی[1]۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان انتظام سے بھی بیدخل اور ملکیت سے بھی بے دخل۔ ان کا کام صرف اپنا مال اور اپنے بچے حوالہ کر دینا ہے۔

(۴) مدرسہ میں عموماً ایک ہی مدرس ہوا کرے گا جسے پانچ سال کے لئے امتحاناً مقرر کیا جائیگا پھر ہمیشہ کے لئے مستقل کر دیا جائیگا۔ اگر کمیٹی کی رائے میں اس کا رویہ نامناسب ہو تو وہ اسے نکالدیگی۔ اس کے فرائض یہ ہوں گے کہ مقررہ نصاب کے مطابق تعلیم دے اور گاؤں کے تمام معاملات کو "قومی رنگ" (National Out Look) میں رنگنے کی کوشش کرے[2]۔ قومی رنگ کا مطلب صاف ہے۔ بچوں میں اور اپنے زیر اثر آبادی میں واحد قومیت کی روح پھونکنا اور ملی امتیاز کو مٹا دینا۔ یہ کام قریب قریب کلیتہً ہندو مدرسین ہی سے لیا جائیگا مسلمان کا اول تو انتخاب میں آنا مشکل۔ اور اگر کوئی قسمت کا مارا آگیا تو کمیٹی یہ کہکر بآسانی اسے نکالدیگی کہ یہ قومی رنگ نہیں دیتا یا مقررہ نصاب کے خلاف بھی کچھ دینی کلمہ و نماز وغیرہ سکھاتا ہے نتیجہ یہ ہوگا کہ سات برس تک مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کو (اس لئے کہ تعلیم مخلوط[3] ہوگی) کلیتہً ایک ہندو استاد کے زیر اثر اور کثیر التعداد ہندو بچوں میں گھرا ہوا رہنا پڑے گا جہاں "قومی رنگ" ہر طرف سے ان کو محیط ہوگا اور خدا اور رسول کا نام تک ان کے کانوں میں نہ پڑیگا کجا کہ اسلامی زندگی کا کوئی نشان وہ دیکھ سکیں۔

(۵) اغراض و مقاصد میں تصریح کی گئی ہے کہ گاؤں کے بچوں میں "قومی نقطہ نظر" پیدا کیا جائیگا۔ "ودیا مندر ایک اہم سوشل مرکز کا کام دیگا جہاں استاد، بچوں کے والدین، لڑکے لڑکیاں سب جمع ہوکر ان مسائل کو جن سے ان کو سابقہ پڑتا ہے بحث مباحثہ کرکے حل کرنیکی کوشش کریں گے خواہ وہ مسائل "قومی" ہوں یا سوشل یا تعلیمی[4]"۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان ودیا مندروں کے ذریعہ سے دیہات کی منتشر و پراگندہ مسلمان آبادی کو کثیر التعداد ہندو آبادی میں جذب کرنیکی ایک منظم کوشش کیجائیگی۔ اور تربیت یافتہ دیہاتی تمام دیہی علاقوں میں پھیلا دیئے جائینگے تاکہ وہ تمام گاؤں کی پوری زندگی کو اپنے گرد مرتکز کرلیں اور نہ صرف تعلیم کے ذریعہ سے

---

[1] ودیا مندر اسکیم صفحہ ۱۰-۱۱ [2] ایضاً صفحہ ۱۳-۱۴ [3] ایضاً صفحہ ۸ [4] ایضاً صفحہ ۸

بلکہ سوشل اور سیاسی سرگرمیوں کے ذریعہ سے بھی سب کو ایک اجتماعی وحدت بنادیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ دیہات کی مسلمان آبادی خود بخود ناپید ہو جائیگی اور چند سال بعد جو مسلمان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھیں گے تو انہیں معلوم ہوگا کہ وہ صرف شہروں میں رہ گئے ہیں، اصلی ہندستان یعنی دیہی ہندوستان میں ان کا کہیں پتہ نہیں۔

(۶) ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہوگی اور مادری زبان کی تفسیر حکومت کے کمیونک[1] میں یہ کی گئی ہے کہ اس سے مراد علاقہ کی زبان[2] ہے یعنی وہ زبان نہیں جو بچہ کی ماں بولتی ہے بلکہ وہ زبان جو علاقہ کی ماں بولتی ہے۔ اب صوبہ متوسط میں تلاش کیجیے کہ کونسا علاقہ ہے جس کی ماں اردو بولتی ہو۔ وہاں کے آٹھ لاکھ مسلمانوں کی مائیں تو سب کی خالص اردو بولنے والی ہیں، مگر بحیثیت مجموعی علاقے دو ہی قسم کے ہیں، یا مرہٹی بولنے اور لکھنے والے یا ہندی (ناگری رسم الخط کے ساتھ) لکھنے اور بولنے والے۔ لہٰذا مادری زبان کی تفسیر علاقہ کی زبان سے کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ اردو خود بخود خارج از بحث ہو گئی۔ مسلمان اگر چاہیں تو اردو مدرسہ قائم کر سکتے ہیں، مگر صرف اس جگہ جہاں وہ چالیس بچے اردو پڑھنے والے فراہم کریں اور دو سو روپے سالانہ کی جائداد دے سکیں جہاں اقلیت یا غربت کی وجہ سے وہ ایسا نہ کر سکیں (اور شاید سی پی میں بہت ہی کم مقامات پر وہ ایسا کر سکیں) وہاں ان کے بچوں کو مرہٹی یا ہندی میں ہی سب کچھ پڑھنا ہوگا۔ اس کے بعد "متحدہ قومیت" آپ سے آپ پیدا ہوگی

(۷) حکومت کی پوری طاقت اس اسکیم کو کامیاب بنانے میں صرف ہوگی۔ ابتداءً ہر تعلقہ اور تحصیل میں حکومت اپنے خرچ سے چند ودیا مندر قائم کریگی۔ مدرسوں کی تنخواہیں حکومت کے خزانہ سے ملیں گی۔ ودیا مندر تعمیر کرنے کے لئے ضروری سامان بھی حکومت دیگی[2]۔ تمام سرکاری محکمے ودیا مندر کی پشت پر مدد کے لئے حاضر رہیں گے محکمۂ زراعت، محکمۂ طبابت و حفظان صحت، محکمہ امداد باہمی، محکمۂ علاج حیوانات، محکمۂ تعلیم، غرض سب اپنے اپنے دائرہ میں ودیا مندروں کو مادی، علمی ذہنی اور اخلاقی و نفسیاتی امداد دیں گے۔ یہ معنی ہیں قومی جمہوری حکومت کے۔ ۸ لاکھ مسلمان اس جمہوریت کا ایک جز ہیں تو ہوا کریں۔ دولت مشترکہ کی پیدائش میں ان کا حصہ ہے تو ہوا کرے، مگر ہیں تو وہ اقلیت میں۔ لہٰذا جس دولت اور طاقت کے فراہم کرنے میں ان کا حصہ ہے، اس کا مصرف متعین کرنے میں ان کا حصہ نہیں ہے۔ اس کو اکثریت اپنے منشا کے

---

[1] سی۔ پی گورنمنٹ کا کمیونک مورخہ ۴ ستمبر ۱۹۳۸ء　　[2] ودیا مندر اسکیم صفحہ ۱۱

مطابق استعمال کریگی۔ اور ایسے کاموں میں استعمال کریگی جو ان ہیبت زدہ چھوٹے گروہوں کی ہستی ہی کو ختم کر دیں۔

(۸) سی پی میں ابتدائی تعلیم لوکل بورڈوں اور میونسپل کمیٹیوں کے حدود عمل سے تعلق رکھتی ہے، اور چونکہ ہر جگہ اکثریت ہندوؤں کی ہے اس لئے یہ جماعتیں اردو مدرسوں کو بند کر رہی ہیں اور ان کی جگہ ودیا مندر قائم کرنے پر تلی ہوئی ہیں مسلمان اپنی اقلیت کے باعث کسی طرح اس ظلم کو روک نہیں سکتے۔ آگے چل کر آپ دیکھیں گے۔ کہ ان مجلسوں کی پوری طاقت ودیا مندر قائم کرنے میں صرف ہو گی۔ جو ٹیکس مسلمانوں سے لیا جائیگا وہ ان کی مرضی اور ان کے مفاد کے خلاف صرف کیا جائیگا۔ اور مسلمانوں کے احتجاج کو استحقار کے ساتھ ٹھکرا دیا جائیگا۔ حال ہی میں ضلع امراؤتی کی ورود میونسپل کمیٹی نے اردو اسکول کو اردو ودیا مندر بنا دیا۔ مسلمانوں نے احتجاج کیا مگر پر کاہ کے برابر بھی اس کی وقعت نہ کی گئی[1] سچ فرمایا پنڈت نہرو نے، جمہوریت کے معنی یہی ہیں کہ اکثریت اقلیت کو دبا کر رکھے۔

(۹) وردھا میں ودیا مندروں کے لئے اساتذہ تیار کرنے کا انتظام کیا گیا ہے اور ایک ٹریننگ اسکول قائم کر دیا گیا ہے۔ اس میں ۱۶۲ ہندو اور ۸ مسلمان تعلیم و تربیت حاصل کر رہے ہیں اور حکومت صوبہ متوسط نے اپنے احسانات کی جو فہرست گنائی ہے اس میں ہمیں یہ بھی بتایا ہے کہ تمام ہندوؤں اور مسلمانوں کو اردو کی تعلیم دیجاتی ہے تاکہ وہ ودیا مندروں میں جا کر بچوں کو اردو اور ہندی دونوں سکھا سکیں۔[2] مگر اصل حالات کیا ہیں؟ اس صوبہ کے قوم پرست مسلمانوں تک نے اپنی کانفرنس میں شکایت کی ہے کہ سارا زور صرف ہندی تعلیم پر صرف کیا جاتا ہے اور اردو کی محض شد بد پیدا کر کے چھوڑ دیا جاتا ہے تاکہ یہ ودیا مندروں میں اردو تعلیم کے انچارج ہوں۔ جن بیچاروں کا املا اور تلفظ تک درست نہیں، جو اردو کی معمولی عبارت تک صحیح نہیں پڑھ سکتے وہ ہمارے بچوں کو اس زبان کی تعلیم دینے جائیں گے۔[3]

سی پی اسمبلی کے ممبر مولوی عبدالرحمٰن خانصاحب جب اس ٹریننگ اسکول کا معائنہ کرنے گئے تو انہوں نے دیکھا کہ ہندو مسلمان سب کے سب دھوتیاں باندھے ہوئے تھے۔ یہ تمیز کرنا مشکل تھا کہ ان میں مسلمان کون ہے

---

[1] سی پی اسمبلی میں سوال نمبر ۱۹۶ کا جواب مورخہ ۸ مارچ ۱۹۳۸ء ٭ [2] حکومت سی پی کا پریس کمیونک مورخہ ۴ اکتوبر ۱۹۳۸ء

[3] مدینہ مورخہ ۲۰ جولائی ۱۹۳۸ء ٭

تمام مضامین ہندی اور مرہٹی میں پڑھائے جاتے ہیں۔ محض اردو رسم الخط سکھانے کیلئے ایک مسلمان استاد نوکر رکھا گیا ہے۔ مسلمان طلبہ اچھوتوں کی طرح رہتے ہیں۔ الگ کھاتے ہیں، پانی پینے کے برتنوں تک کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ روزانہ بندے ماترم سے مدرسہ شروع ہوتا ہے اور مسلمان طلبہ کو مجبور کیا جاتا ہے۔ ریا اگر مجبور نہیں تو ترغیب ہے ایسا بنایا جاتا ہے اگر پرارتھنا کے انداز میں ہاتھ جوڑ کر اور سر جھکا کر کھڑے ہوں۔ یہ ہے وہ مدرسہ جس میں "قومی تہذیب" کے نشوونما پر جناب مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہ نے اظہار مسرت فرمایا ہے اور جس کا افتتاح مہاتما گاندھی کی "برکتوں" کے ساتھ ہوا ہے!

---

۱۔ مولوی عبدالرحمٰن خان صاحب کا مضمون مندرجہ انقلاب ۲۲؍اگست ۳۸ء

علم ودھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم پر مسلمانوں کی طرف سے جو اعتراضات کئے گئے ہیں، ان کے جواب میں منجملہ اور باتوں کے ایک بات یہ بھی بار بار دہرائی جارہی ہے کہ جس ملک میں بہت سے مذاہب کے پیرو رہتے ہیں وہاں سب کی مذہبی تعلیم کا انتظام حکومت کیسے کر سکتی ہے۔ ایسی جگہ تو حکومت کی طرف سے عام وغیر مذہبی تعلیم ہی کا انتظام کیا جاسکتا ہے، اور تعلیم کو عام کرنے کیلئے اس کے سوا کوئی تدبیر نہیں کہ وسیع پیمانہ پر لازمی جبری اور غیر مذہبی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ لیکن عام ناظرین کی معلومات کیلئے میں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ یورپ کے سخت "مہذب" ممالک میں بھی جہاں مذہب کی کوئی اہمیت نہیں ہے فرانس، چیکوسلواکیا روس اور دو چار دوسرے ملکوں کے سوا کسی ملک نے وہ پوزیشن اختیار نہیں کی جو یہاں ہندوستان میں اختیار کی جارہی ہے۔ جرمنی میں باشندوں کی تعلیم کا انتظام کرنا حکومت کے فرائض میں سے ہے۔ اور یہ نظریہ اختیار کیا گیا ہے کہ سب کی تعلیم کا نظام ایک ہونا چاہیئے۔ اس بنا پر وہاں پرائیویٹ مدارس قائم کرنے کی اجازت بھی کم دی جاتی ہے لیکن دستور سلطنت میں ہر شخص کو یہ مطالبہ کرنے کا حق دیا گیا ہے کہ اس کے بچے کو اس کے عقیدے کے مطابق مذہبی تعلیم دی جائے اور حکومت کا یہ فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ اوقات مدرسہ میں اس تعلیم کا انتظام کرے۔ نیز اگر ایک مذہبی عقیدے کے لوگ کسی جگہ کافی تعداد میں ہوں اور مطالبہ کریں کہ ان کے لئے الگ مدرسہ قائم کیا جائے جہاں مذہبی تعلیم کا انتظام ان کی خواہش کے مطابق ہو تو حکومت کا فرض ہے کہ اس کا انتظام کر دے۔ انگلستان میں مذہبی تنظیمات کو خود اپنے مدارس قائم کرنے اور چلانے کا حق ہے اور حکومت کا محکمۂ تعلیم صرف ان کی نگرانی کرتا ہے۔ ایسے مدارس کو حکومت امداد بھی دیتی ہے۔ یوگوسلیویا میں ہر تسلیم شدہ مذہب کی تعلیم کا انتظام سرکاری مدارس میں کیا جاتا ہے اور ہر بچے کے والدین پر اس کا فیصلہ چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اس کیلئے کس نوعیت کی مذہبی تعلیم (باقی صفحہ ۱۹۶ پر)

(۱۱)

ان تفصیلات سے اچھی طرح اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ "جنگ آزادی" کے نام سے برطانوی حکومت کے زیر سایہ بتدریج سیاسی طاقت حاصل کرنیکی جو پالیسی اختیار کی گئی ہے وہ کس طرح مسلمانوں کی قومیت اور انکی طاقت کو فنا کرنے کیلئے استعمال کیجا رہی ہے، اور کس طرح ہمارے ہمسلیہ فیق قومی امپیریلزم کے وہ تمام ہتھکنڈے اختیار کرتے جا رہے ہیں، جن کو انہوں نے اپنے انگریز استادوں سے سیکھا ہے۔ لیکن یہ بیان نامکمل رہ جائیگا

(بقیہ حاشیہ) چاہتے ہیں۔ نیز وہاں تسلیم شدہ مذاہب کو اپنے تعلیمی نظام خود بنانے کا بھی حق ہے اور حکومت بجٹ خزانہ سے انکی اعانت کی جاتی ہے۔ لتھوانیا کے سرکاری مدارس میں بچوں کیلئے مذہبی تعلیم لازمی رکھی گئی ہے اور صرف وہ بچے اس سے مستثنیٰ کئے گئے ہیں جنکے والدین مذہبی تعلیم نہ دلوانا چاہتے ہوں اسکے علاوہ وہاں بھی مذہبی تعلیمات کو اپنے مدارس خود قائم کرنیکا حق ہے اور حکومت انکو اس شرط کے ساتھ امداد دیتی ہے۔ کہ ان میں دنیوی تعلیم کا انتظام سرکاری تعلیمی پالیسی کے مطابق کیا جائیگا۔ پولینڈ کے تمام سرکاری اور امدادی مدارس میں مذہبی تعلیم لازمی ہے۔ اور یہ کام مختلف مذاہب کی تسلیم شدہ انجمنوں کے سپرد کیا گیا ہے کہ وہ اپنے اپنے مذہب کے پیروؤں کیلئے خود نصاب تجویز کریں اور مدارس میں ان کی مذہبی تعلیم کی نگرانی کریں۔ اسٹھونیا میں بچے کے والدین کی درخواست پر سرکاری مدارس میں مذہبی تعلیم کا انتظام کرنا حکومت کے لئے لازم ہے۔ ملاحظہ ہو:-

The New Democratic Constitutions
of Europe. By Agnes Heedlam.
Morley, P. 53-57

بلجیم میں جہاں تک ابتدائی تعلیم کا تعلق ہے سرکاری اور غیر سرکاری دونوں قسم کے مدارس میں مذہبی تعلیم لازمی ہے اور تسلیم شدہ مذہب کے کلیساؤں کو حق دیا گیا ہے کہ مذہبی تعلیم کی نگرانی کے لئے اپنے انسپکٹر مقرر کریں۔ ناروے میں ابتدائی تعلیم تمامتر مذہبی تنظیمات کے ہاتھ میں رکھی گئی ہے۔ اٹلی میں مذہبی تعلیم لازمی ہے اور کوئی بچہ اس سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا جبتک کہ ان کے والدین استثناء کا مطالبہ نہ کریں۔ ہالینڈ میں مذہبی تنظیمات اپنے اپنے پیروؤں کی تعلیم کا انتظام خود کرتی ہیں اور حکومت اس کا خرچ ادا کرتی ہے۔ سوئٹزرلینڈ میں سرکاری طور پر صرف اس مذہب کی تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے جس کے پیروؤں کی تعداد مدرسہ میں زیادہ ہو لیکن جن اقلیتوں کی کافی تعداد موجود ہو۔ ان کے لئے بھی یہ انتظام کیا جاتا ہے (ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا چودھواں اڈیشن مضمون ایجوکیشن) اس کے بعد یہ کہنے کی گنجائش نہیں رہتی کہ پبلک مدارس میں مذہبی تعلیم کا انتظام ممکن نہیں ہے صاف کیوں نہیں کہا جاتا کہ قومیتوں کو فنا کرنے اور قوموں کے احساس خودی کو مٹانے کے لئے ہم اس چیز کو قصداً نہیں رکھنا چاہتے۔

اگر اسی سلسلہ میں ان کارروائیوں کا بھی ذکر نہ کر دیا جائے جو زبان کے باب میں کی جا رہی ہیں۔

ایک قوم کی زبان اور اس کا رسم الخط، اس کی تہذیب اور اس کی قومیت کے بقا و فنا میں فیصلہ کن اہمیت رکھتا ہے۔ کسی قوم کو اگر آپ دوسری قوم میں تبدیل کر دینا چاہیں تو اس کی زبان اور رسم الخط کو بدل دیجئے۔ رفتہ رفتہ وہ خود بخود دوسرے سانچے میں ڈھلتی چلی جائے گی۔ اس کی آنیوالی نسلوں کا تعلق اپنے اسلاف سے منقطع ہو جائیگا اور وہ بالکل نئی ذہنیت، نئے افکار اور نئی صورت قومی لیکر اٹھیں گی۔ جن جن لوگوں نے قومیتوں کے بنانے اور بگاڑنے کا کھیل کھیلا ہے۔ ان سب نے یہ ہتھیار ضرور استعمال کیا ہے۔ زار روس کی حکومت نے اپنے امپریلزم کی بنیادیں مستحکم کرنے کیلئے روسی زبان اور رسم الخط کو تمام غیر روسی قوموں پر مسلط کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ یہ سب قومیں روسی بن جائیں، اور اس کی مملکت میں کوئی قوم ایسی نہ رہ جائے جو اپنی زبان بولنے والی اور اپنے مذہب کا اتباع کرنیوالی اور اپنے رسوم پر چلنے والی ہو۔ اصطلاح میں اس کو Russification یعنی "روسی بنانے" کی پالیسی کہا جاتا ہے۔ بعد میں اسی پالیسی کی پیروی اشتراکی جماعت نے بھی کی۔ لینن نے انقلاب کے بعد ہی مشرقی قوموں کو نئے سانچے میں ڈھالنے کے لئے ان کے رسم الخط کو لاطینی رسم الخط سے بدل دیا اور اب تازہ اطلاع ہے کہ روس کی ۲۹ قوموں کا رسم الخط لاطینی کے بجائے روسی کر دیا گیا ہے تاکہ اس علیحدگی کے احساس کو بالکل مٹا دیا جائے جو ان کے روسی بنجانے میں مزاحم ہوتا ہے۔ ازبک، ترکمان، تاجیک، کرغیز اور داغستانی مسلمان جنکو عربی رسم الخط نے اسلامی روایات سے وابستہ کر رکھا تھا۔ اس ضرب کے اثرات کو ابھی سے محسوس کر رہے ہیں۔ ابھی ایک چوتھائی صدی بھی اس انقلاب پر نہیں گزری ہے اور وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی قومیت تحلیل ہو کر اشتراکی سوسائٹی میں تبدیل ہوتی چلی جا رہی ہے۔ یہی پالیسی فرانس نے شمالی افریقہ میں اختیار کی ہے۔ وہاں عربوں اور بربریوں کو فرانسیسی قومیت میں ڈھالنے کے لئے ساری طاقت اس پر صرف کی جا رہی ہے کہ عربی زبان اور رسم الخط کو مٹا دیا جائے۔ اسی پالیسی کا تختۂ مشق ہندوستان میں ہم کو بنایا جا رہا ہے۔

پنڈت جواہر لال کے بقول ہندوستان میں "نیشنلسٹ" جماعت کی خواہش اور کوشش یہ ہے کہ یہاں ایک متحدہ قوم پیدا ہو۔[1] اس غرض کے لئے زبان کی وحدت ناگزیر ہے۔ زبانیں الگ ہوں گی تو

[1] جامعہ۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء

الگ قومیں بھی رہیں گی۔ الگ قوموں کو فنا کر کے ایک قوم میں تبدیل کرنا ہو تو الگ زبانوں کو مٹا کر دولت تنظیم اور حکومت کی طاقت سے ایک زبان تمام ملک میں پھیلانی ہی پڑے گی۔ یہاں تک تو بات کھلم کھلا ہے۔ اس کے بعد کام تقسیم ہو جاتا ہے۔ کچھ باتیں دکھلانے کیلئے ہیں، اور کچھ کرنے کے لئے۔ دکھانے کے لئے تو بس یہ ہے کہ "قومی" زبان "ہندوستانی" ہے جس کا اطلاق اردو ہندی دونوں پر ہوتا ہے۔ فارسی اور دیوناگری دونوں رسم الخط مسلم ہیں اور دونوں کو نشوونما کا پورا موقع ملنا چاہئے۔ لیکن فی الواقع کیا کیا جا رہا ہے؟ اس کے لئے ذیل کی تفصیلات ملاحظہ ہوں۔

(۱) فارسی اور عربی کے وہ عام فہم الفاظ بھی جو "ہندوستانی" کے مشترک سرمایہ ہیں مدتوں سے داخل ہو چکے ہیں، جن کو ہر ہندو اور مسلمان بولتا اور سمجھتا ہے، قصداً ترک کئے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ ٹھیٹھ سنسکرت اصل کے یا بالکل نامانوس ہندی زبان کے الفاظ پھیلائے جا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر

| | | | | | | | | |
|---|---|---|---|---|---|---|---|---|
| سمے | بجائے | وقت | شکشا | بجائے | تعلیم | پرسدھ | بجائے | مشہور |
| منش یا پرش | " | آدمی | جٹ پرانت | " | صوبہ متحدہ | نگر | " | شہر |
| سنگھ | " | شیر | ٹھشا | " | مقدمہ | اوشک | " | ضروری |
| وانر | " | بندر | سبھاپتی | " | صدر | سوتنترتا | " | آزادی |
| مترتا | " | دوستی | بھارت ورش | " | ہندوستان | پرانت | " | صوبہ |
| انتی | " | ترقی | اتیحقہ | " | حاکم | پرانت کونسل | " | صوبہ متوسط |
| پونجی | " | مسل | مت بھید | " | اختلاف | لاگو | " | نافذ |
| جھگڑا اپیلھرد | " | مدعی | پرستاؤ | " | تجویز | دوربھا | " | برار |
| سدھانت | " | اصول | سنشودھن | " | ترمیم | اگوا | " | لیڈر یا رہنما |
| گھوشنا | " | اعلان | گرہن | " | منظور | جھگڑا دوجے | " | مدعا علیہ |

یہ صرف چند مثالیں ہیں۔ اس فہرست کو بہت زیادہ طویل کیا جا سکتا ہے۔ مگر اتنی ہی مثالیں یہ اندازہ کر لینے کے لئے کافی ہیں کہ یہاں "ہندوستانی" کے پردے میں در اصل ہندی زبان کو قومی زبان بنانے کی

کوشش کی جارہی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ "ہندوستانی قوم" کے بجائے دراصل "ہندو قوم" میں اس ملک کی قوموں کو جذب کرنا مقصود ہے۔ ہندوستانی زبان وادب میں سے ہمارے حصہ کو اس طرح نکال پھینکنے کی کوشش کی جارہی ہے جس طرح کوئی قوم کسی ظالم قوم کی حکومت سے آزاد ہونیکے بعد جوش انتقام میں اس کے باقیماندہ آثار کو مٹایا کرتی ہے۔

(۲) متحدہ قومیت کے علمبردار جو زبان اپنی تقریروں اور تحریروں میں استعمال کر رہے ہیں۔ اس کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔ گاندھی جی بھارتیہ ساہتیہ پریشد کے اجلاس ناگپور میں فرماتے ہیں:۔

"اس سبھا پتینوں مجھے دینے کا کارن جب میں ڈھونڈتا ہوں تو وہی پرتیت ہوتے ہیں۔ ایک میرا ساہتیہ کار نہ ہونا اور اس کے لئے کم سے کم ودیش کا کارن ہوتا ہے تتھا دوسرا میرا ہندوستان کی سب بھاشاؤں کا پریم۔ جو کچھ ہو میں آشا کرتا ہوں کہ ہم کچھ نہ کچھ سیوا کریں گے اور بھوشیہ میں اپنا سیوا کشیتر بڑھائیں گے یدی ہم شری نگر سے لیکر کنیا کماری تک اور کراچی سے لیکر دیبرو گڈھ تک جو یہ دیش ہے اسے ایک مانتے ہیں اور اس کے لوگوں کو ایک پرجا سمجھتے ہیں تو اس پردیش کے پرتیک بھاگ کے ساہتیہ کار بھاشا شاستری اتیادی آپس میں کیوں نہ ملیں اور بھن بھن بھاشاؤں دوارا ہندوستان کی یتھا یوگیہ سیوا کیوں نہ کریں۔"

آنریبل مسٹر سمپورنانند وزیر تعلیم صوبہ متحدہ کی ایک تقریر کا اقتباس یوپی کے محکمۂ اطلاعات کی رپورٹ سے:۔

"آدھنک کال جس میں کہ ہم رہ رہے ہیں اکی یہ بھی ایک شبدتا ہے کہ شکشت شمسیا کے پرت لوگوں کا اگرشٹ بہت شدھ اور بیاپک ہو گیا ہے۔ یہ بات ادھکانش سینے سنسار پر گھٹت ہوتی ہے اور ترن سار ہم اپنے دیش میں بھی اس بشیو بیاپی اندولن کے بھن بھن پہلوؤں کو دیکھ رہے ہیں اور ان کا ان بھو کر رہے ہیں آجکل ہم اپنے کو جس مانسک اور بدھاتک پرشتھت میں پاتے ہیں اور ہماری اس اشتھت کا جو سماجک مارج نیتک اور آرتھک آدھار ہے اور ساتھ ہی ساتھ ہم نے اپنے پوروجوں سے جو سنسکرت پائی ہے اس سے اس وشیو ویاپی پرگت کو ہمارے سمکھ نشندیہ ایک بشیس روپ میں

---

ٰ "جامعہ" مئی سنہ ۳۶ء

ایشفت کیا ہے اور ایک ذنیس بھارتیے شمسیہ بنا دیا ہے"

بابو موہن لال سکسینہ صدر صوبہ کانگرس کمیٹی کے خیر مقدم میں پیلی بھیت کی کانگریس کمیٹی حسب ذیل اعلان شائع کرتی ہے:-

"ہمارے صوبہ کے پرسد نیتا شری یت موہن لال جی سکسینہ ایم۔ ایل۔ اے ڈسٹرکٹ اجو پرانتی کانگریس کمیٹی کے پردھان ہیں، ۲۷ رمئی ۱۹۳۸ء کو پرات کال ۵ بجے کی گاڑی سے پدھار رہے ہیں۔ جنتا کو چاہئے کہ اس سنہرے اوسرے لابھ اٹھانے کے لئے یوب دیش کے پرت اپنے کرتو کو جاننے کے لئے ۲۶ رتاریخ کی شام کو ادھکا دھک سنکھیا میں راشٹر ساکاوس کے ساتھ میں آجانا چاہئے اور ۲۷ رمئی ۳۸ء کی صبح کو ۵ بجے ان کے سواگت کے جلوس کی رونق بڑھایئے

پروگرام ۲۷ رمئی کا

| | |
|---|---|
| پرت کال | ۷ بجے سے ۹ بجے تک جلوس |
| " | ۹ بجے سے ۱۰ بجے تک جل پان۔ |
| مدھیان | " " ۲ بجے تک بھوجن وشرام |
| | ۲ " " ۵ " کاریہ کارتاؤں کی بیٹھک |

## نویدک

دستخط پریذیڈنٹ دستخط اوپ منتری

شہر منڈل کانگریس کمیٹی۔ پیلی بھیت"

اس حمام میں سوشلسٹ ہندو بھی بے تکلف کپڑے اتار دیتے ہیں۔ حال میں آگرہ کی سوشلسٹ جماعت کی طرف سے ایک جلسہ کا اعلان بدیں الفاظ ہوا ہے:-

"آگرہ میں سماج وادی مہا سنٹر۔ لگاتار چھ دن تک۔ اکھل بھارتیہ سماج وادی نیتاؤں کے دوارا"

"ہمیں جنتا کو یہ سوچنا دیتے ہوئے پرسنتا ہوتی ہے کہ تاریخ ۱۱ ر اکتوبر سے برابر چھ دن تک اکھل

ل۔ مدینہ ۱۳ ر ستمبر ۳۸ء

بھارتیہ سوشلسٹ نیتا سماج نیتی کے انیک وشیوں پر اپنے سناگر بہت اور ودیا پورنر بھاشنٹر دیں گے۔ آگرہ کی جنتا کے لئے یہ اپور و اوسر ہے کہ وے دیش کے درجہ سوشلسٹوں کے سمپرک میں آکر یہ سمجھ لیں کہ برٹش سامراج واد کو کس پرکار اکھاڑ پھینکنا چاہئیے۔ بھاشنٹر وں کے وشے کیونزم، سوشلزم، پونجی واد، ورک بندھ، سامراجیہ واد، فیسزم، نرم و گرم دل، فیڈریشن، کسان، کرانتی، وشو شانتی کی سمیا۔ ودیارتھی اندولن، کسان مزدور اندولن روس کی کرانتی۔ سماج وادی روس۔ انتر راشٹریہ۔ شرستبھت آدی۔ آدی بھاشنٹر میں پرویش چار آنے کے ٹکٹ سے ہوگا۔ آپ کو ٹکٹ ہر ٹرپکھ کانگریس ودیارتھی کاریہ کرتا تھا وارڈ شہر کانگریس کمیٹی کے دفتر ودوارا مل سکتا ہے۔ جن نیتاؤں کے آنے کی آشا ہے ان کے نام اس پرکار ہیں:-

"ڈاکٹر اشرف کے ایم آبھاگا کانگریس کمیٹی کے راج نیتا و بھاگ کے پردھان۔ اچاریہ نریندر دیو اکیل بھارتیہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی کاریہ کارنی کے ٹرپکھ سدسے تھا کانگریس کارشمتی کے بھوت پورو سدسے۔ ڈاکٹر زید اے احمد اکیل بھارتیہ کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی کار کارنی کے سدسیے تھا آبھاگا کانگریس کمیٹی کے آرتھک و بیاگ کے بھوت پورو۔ ڈاکٹر رام منوہر لوہیہ اکیل بھارتیہ کانگریس کمیٹی کے ویدیشک بیاریہاگ کے منتری تھا ابھاگا سوشلسٹ پارٹی کے کارکارنی کے سدسے۔ کامریڈ ظہیر بار ایٹ لا آبھا کا سوشلسٹ پارٹی کی کارکارنی کے سدسے۔ کامریڈ ہرش دیو مالوی یوپی کسان سبھا کی کارکارنی کے پرمکھ سدسے۔"

"دھیان رہے یہ بھاشنٹر ۱۱ اکتوبر سے شام کو ۵ بجے سے ۸ بجے تک ہوں گے۔ استھان کی سوچنا شکر وبھاجگی یہ بھاشنٹر شہر کانگریس کمیٹی کانگریس سوشلسٹ پارٹی اور آگرہ ودیارتھی سنگھ کے سنیکٹ پلیٹ فارم پر ہوں گے۔

مہادیو نرائن ٹنڈن

پردھان منتری کانگریس سوشلسٹ پارٹی۔ آگرہ"

یہ محض چند نمونے ہیں۔ ورنہ یہ زبان جس طرح ذمہ دار لیڈروں اور ذمہ دار قومی مجلسوں سے لے کر اخبارات، رسائل اور سینماؤں تک بہ آرائش نشر و اشاعت کے ذریعہ سے پھیلائی جارہی ہے۔ اس کا مشاہدہ ہر آنکھوں والا کر رہا ہے اور اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر حکومت کی باگیں ان لوگوں کے ہاتھ میں پوری طرح آگئیں تو یہ کیسی "ہندوستانی" زبان بنائیں گے۔

(۳) اگرچہ ابھی سیاسی اقتدار پوری طرح ان کے ہاتھ میں نہیں آیا ہے، لیکن جس قدر بھی اقتدار انہیں مل چکا ہے اس کو انہوں نے عملاً اس کام میں استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔ اقتدار تو حاصل کرتے ہیں یہ کہہ کر کہ ہم مشترک وطنی اغراض کے لئے آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں مگر اقتدار کو استعمال کیا جاتا ہے اس کام میں کہ وطن کی ایک جماعت پر دوسری جماعت کی زبان کو بزور مسلط کر دیا جائے۔ صوبہ بہار میں ۲۵ ہزار سے زیادہ مسلمان بچے ہندی مدرسوں (پاٹھ شالاؤں) میں جانے پر مجبور ہیں کہ ان کے لئے تعلیم کا کوئی دوسرا انتظام ہی نہیں۔ پٹنہ ڈویژن میں ۷۵ فیصدی، چھوٹا ناگپور ڈویژن میں ۸۰ فیصدی، بھاگلپور ڈویژن میں ۷۱ فیصدی اور ترہٹ ڈویژن میں ۵۵ فیصدی مسلمان طلبہ ہندی زبان میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ مجموعی طور پر جو مسلمان بچے صرف ایک صوبہ میں ہندی اللسان بنائے جا رہے ہیں۔ ان کی تعداد ۵۰ ہزار کے قریب ہے یعنی کل مسلمان طلبہ کا ۷۰ فیصدی حصہ۔ اور ان کو پڑھایا کیا جاتا ہے؟ متعدد کتب نصاب میں یہ چیز آپ کو ملے گی کہ "نبی" کے معنی "رام اوتار" کے ہیں۔ ایک چاول سے اندازہ کر لیجئے کہ پوری دیگ میں کیا ہے۔ پروفیسر عبدالحق سکرٹری انجمن ترقی اردو نے رسالہ "اردو" کی ایک قریبی اشاعت میں اپنے ایک دوست کا خط نقل کیا ہے جو یوپی میں ڈپٹی کلکٹر ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ اس سال مجھے ڈسٹرکٹ بورڈ کے بہت سے مدرسوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا اور ان میں عموماً میں دیکھا کہ اردو پڑھانے والے مدرسوں کی بہت کمی ہے۔ مسلمان بچوں کو مجبوراً ہندی پڑھنی پڑتی ہے، اور وہاں زبان کے واسطہ سے ان پر ہندویت کا گہرا رنگ چڑھ رہا ہے۔ مثلاً ایک ابتدائی مدرسہ میں بچے کو پکاریئے تو وہ "حاضر جناب" کہنے کے بجائے "اپستھت شریمان" کہے گا۔ یہ اس صوبہ کا حال ہے جو صدیوں سے ہماری قومی تہذیب کا گہوارہ رہا ہے۔ ان سب سے زیادہ بدتر حالت صوبہ متوسط کی ہے۔ ضلع بیتول کی ڈسٹرکٹ کونسل نے پورے ضلع میں جبری تعلیم نافذ کرنے کی جو سکیم بنائی ہے اس میں تعلیم کی زبان لازمی ہندی رکھی گئی ہے اور حکومت نے اس شرط کے ساتھ اس کو مالی امداد دی ہے کہ تمام تعلیم ہندی میں ہو۔ اس جدید اسکیم کے ماتحت ۱۱۰ ہندی اسکول قائم کئے گئے اور پورے ضلع میں اردو کا ایک اسکول تھا سو وہ بھی بند کر دیا گیا[۱]۔ یہ صرف ابتدا ہے۔ ودیا مندر اسکیم جب نافذ ہوگی۔

[۱] عبدالغنی صاحب ایم اے سنٹرل کا مراسلہ مندرجہ اسٹار آف انڈیا، یکم مارچ ۳۸ء صفحہ ۵ پر دیکھیں۔

تو آپ دیکھیں گے کہ دیہات کی مسلمان آبادی کو ۲۵ سال کے اندر قریب قریب کلیتہً ہندی اللسان بنا دیا جائیگا۔ ابتدائی تمامتر لوکل بورڈوں کے قبضہ میں ہے اور وہاں حال یہ ہے کہ ۵۰ اسو انتخابی حلقوں سے نصف درجن مسلمان بھی منتخب نہ ہوسکے۔ یہ عصبیت جہاں کام کر رہی ہو، وہاں کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ پبلک کے خزانہ سے کہیں اردو ودیا مندر یا "بیت العلم" بھی قائم کیا جائیگا۔ لوکل بورڈوں میں تو پھر بھی محدود نظر اور پست ذہنیت کے لوگ جاتے ہیں، صوبہ کی حکومت جن اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ذمہ دار کانگریسی لیڈروں کے ہاتھ میں ہے خود وہی کانگریس کے اس زبانی دعویٰ کو جھوٹا اور منافقانہ دعویٰ ثابت کر رہے ہیں۔۔ کہ "ہندوستانی" زبان اردو اور دیوناگری دونوں رسم الخطوں کے ساتھ تسلیم شدہ سرکاری زبان ہے سی پی اسمبلی میں خود صدر مجلس کے زیر ہدایت رولز کمیٹی نے جو قواعد بنائے ہیں ان میں ۶ لاکھ مسلمانوں کی زبان کا نام تسلیم شدہ زبانوں کی فہرست میں کہیں نظر ہی نہیں آتا۔ عبد الرحمن خانصاحب ایم ایل اے نے جب اپنے سوالات اردو زبان میں لکھ کر بھیجے تو اسمبلی کے سکرٹری نے انہیں واپس کر دیا اور ہدایت کی کہ انگریزی زبان میں سوالات بھیجئے۔ اسمبلی کی کاروائی قلمبند کرنے کیلئے ہندی رپورٹر تو رکھا جاسکتا ہے مگر اردو رپورٹر رکھنے اور اردو میں کارروائی شائع کرنے کے لئے بجٹ میں گنجائش نہیں نکلتی۔ اسمبلی میں کانگریس کے کراچی ریزولیوشن کا حوالہ دیکر مطالبہ کیا جاتا ہے کہ کارروائی ہندی اور اردو دونوں میں لکھی جائے۔ تو کانگریسی حکومت کا وزیر عدل و انصاف جواب دیتا ہے کہ :-

"جو لوگ کانگریس کو ایک قومی جماعت تسلیم نہیں کرتے۔ انہیں کانگریس کی کراچی والی تجویز پر ہماری توجہ مبذول کرانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ انہیں کیا حق ہے کہ اس تجویز کا حوالہ دیکر وہ ہم پر نکتہ چینی کریں ہم اقلیتوں کے معقول مطالبے ماننے کو تیار ہو سکتے ہیں لیکن اس ترمیم میں مسلمانوں کی طرف سے جو مطالبہ کیا گیا ہے وہ نہ تو معقول ہے اور نہ قابل عمل کسی اقلیت کو یہ حق حاصل نہیں ہوسکتا کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) ہے چنانچہ ۲۵ فروری ۳۶ء کو خود سی پی کے وزیر اعظم نے بھی اپنے سرکاری کمیونک میں اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ ضلع کا واحد اردو اسکول بند کر دیا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۲۱ جون ۳۶ء)

[1] عبد الرحمن خاں کا مراسلہ۔ اسٹار آف انڈیا مورخہ ۔ ار ستمبر ۳۸ء

دہ ایوان اکثریت سے نامعقول مطالبے منوانے کی کوشش کرے۔

مسلمان ممبروں کو اس وقت بھی یہ رعایت حاصل ہے کہ وہ چاہیں تو اردو میں تقریر کریں۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اردو خط صوبہ کی سرکاری عدالتوں اور دفتروں میں رائج نہیں۔ اسمبلی میں بھی اسے رائج نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے بے انتہا مصارف بڑھ جائیں گے"[1]

دہم، عمل کے ساتھ زبانوں پر بھی علانیہ یہ بات آ گئی ہے کہ "قومی" زبان حقیقت میں "ہندی" ہے نہ کہ وہ "ہندوستانی"، جو "یوگوسلیویا کی" "سربوکروٹو سلافینی" زبان کی طرح محض ایک دھوکے کی ٹٹی بنائی گئی ہے۔ اس تخیلی زبان کے متعلق تو ابھی حال میں گاندھی جی نے خود فرما دیا ہے کہ خارج میں اس کا وجود کہیں نہیں ہے بلکہ وہ آیندہ پیدا کی جانے والی ہے[2]۔ اب مقابلہ رہ جاتا ہے اردو اور ہندی میں۔ تو اس کے متعلق "متحدہ ہندوستانی قوم" کے لیڈر کا فیصلہ یہ ہے کہ ہندی زبان ہی ہندوستان کی قومی زبان ہے اور دیوناگری رسم الخط ہی ہندوستان کا رسم الخط ہونا چاہیے[3]۔ ہری پورہ کانگریس کے موقع پر "راشٹر بھاشا سمیلن" (قومی زبان کی کانفرنس) کا ساتواں اجلاس مسٹر جمنالال بزاز کے زیر صدارت ہوتا ہے اور کانگریس کا صدر اس کو پیغام بھیجتا ہے کہ:۔

"صوبوں کے باہمی تعلقات کی ترقی کے لئے ایک مشترک زبان کی ضرورت ہے اور وہ زبان ہندی یا ہندستانی ہی ہو سکتی ہے جن لوگوں نے ابھی تک ہندی نہیں سیکھی انہیں سیکھنی چاہئے کہ یہ ہندستانی قوم کی تعمیر میں مددگار ہوگی"[4]

یوپی کا وزیر تعلیم ۱۹ اگست ۳۸ء کو ناگری پرچارنی سبھا، بنارس کے ایڈریس کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے:۔

"اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہندی کو، جسے ہندوستانی بھی کہا جاتا ہے، ہمارے جنوبی ہند کے ہموطن آسانی سے سیکھ لیں تو لازم ہے کہ ہم ہندوستانی زبان میں سنسکرت کے کافی الفاظ استعمال کریں۔"

اسی صوبہ کی اسمبلی کا صدر اسی وزیر تعلیم کے پاس وفد لے جاتا ہے اور اس سے درخواست کرتا ہے کہ

---

[1] "مدینہ" مورخہ ۱۳ ر اکتوبر ۳۸ء

[2] Hindustani of the Congress Conception has yet to be Crystallised into Shape. (Harijan, 20 Oct. 1938)

[3] ہریجن بحوالہ ٹریبیون مورخہ ۸ ر جولائی ۳۷ء [4] ٹائمز آف انڈیا مورخہ ۲۲ ر فروری ۳۸ء

ہندی ذریعہ تعلیم بنانے سے پہلے اس کو سرکاری زبان قرار دیا جائے اور محکموں اور خصوصاً عدالتوں میں سارا کام ہندی کے ذریعہ سے ہو۔ مدینہ یکم ستمبر ۱۹۳۸ء

یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے متحدہ ہندوستان کے نام سے سیاسی طاقت حاصل کی ہے، اور اب یہ اس طاقت کو ہندوستان کی ایک قوم کی زبان مٹانے اور دوسری قوم کی زبان سارے ملک پر مسلط کر دینے میں استعمال کر رہے ہیں۔

---

یہ ساری روداد آپ کے سامنے ہے اسے آنکھیں کھولکر پڑھیے اور اندازہ کیجئے کہ اس جنگ آزادی کی حقیقی نوعیت کیا ہے اس کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ میرا قید خانہ کا رفیق مجھ سے کہتا ہو کہ آؤ میں اور تم دونوں ملکر لڑیں اور ہم دونوں اپنی بیڑیاں اور ہتھکڑیاں کاٹ پھینکیں۔ اگر معاملہ یہی ہوتا تو مجھ سے بڑھکر کون احمق ہوتا کہ ایسے کار خیر میں اس کا ہاتھ بٹانے سے انکار کرتا لیکن یہاں صورت معاملہ کچھ اور ہی ہے۔ میرا رفیق زنداں اس تدبیر میں ہے کہ جیلر کو ہٹا کہ خود اس کی جگہ لے اور اپنے ہاتھ پاؤں کی ہتھکڑیاں اور بیڑیاں بھی میرے ہاتھ پاؤں میں ڈالکر مجھے اپنا قیدی بنالے وہ مجھ سے تو کہتا ہے کہ آؤ اس قید بند سے آزادی حاصل کرنے کے لئے جیلر سے لڑیں۔ مگر جیلر کے ساتھ یہ معاملہ طے کرتا ہے کہ حضور مجھے برقنداز بنادیں، جیل کا انتظام حضور کے حسب منشا ہوگا اور قیدیوں کو میں قابو میں رکھونگا۔ اس طرح جو کچھ اختیارات اسے جیلر سے ملتے جاتے ہیں ان سے کام لیکر وہ اپنی قید طوق و سلاسل اتار کر مجھے کستا چلا جاتا ہے۔ اور مزید غضب یہ ہے کہ جیلر صاحب تو نرے جیلر تھے مگر یہ ہمارے رفیق صاحب جو اب برقنداز بنے ہیں، ان کو مردم خوری کا لپکا بھی ہے۔ یہ مجھے فقط اپنا قیدی ہی نہیں بنانا چاہتے بلکہ میرے گوشت اور خون کو آہستہ آہستہ اپنا جزو بدن بھی بنا لینے کی فکر میں ہیں اب اگر میری عقل ماری گئی ہے تو میں ان کے ساتھ ضرور تعاون کروں گا تاکہ یہ میری مدد سے جیلر پر دباؤ ڈالکر اور زیادہ اختیارات حاصل کریں اور زیادہ آسانی سے مجھے نوش جان فرما سکیں اور اگر میری بھیجے کی آنکھیں پھوٹ چکی ہیں تو میں جیل کی کوٹھڑی میں بیٹھکر بیٹھا ان برقنداز صاحب کی ترقی کو دیکھتا رہوں گا اور اگر جیل کی زندگی نے مجھے پست ہمت اور ذلیل بنادیا ہے تو میں بوڑھے جیلر کی خدمت میں دوڑا ہوا جاؤں گا اور ہاتھ جوڑ کر عرض کروں گا کہ حضور کا دم سلامت رہے جبتک

آپ جیتے ہیں اسوقت تک تو آپ ہی جیل کا انتظام فرمائیں، جب خدانخواستہ آپ کا وقت آن پورا ہو گا، اس وقت دیکھی جائے گی جس کی قید بھی قسمت میں لکھی ہو گی بھگت لیں گے، لیکن اگر میں عقل و خرد سے کچھ بھی بہرہ رکھتا ہوں اور میری رگوں میں ابھی شرافت کا بھی کچھ خون باقی ہے تو میں ہمت کر کے اٹھوں گا اور جیل کی دیواریں اپنے ہاتھ سے توڑنے کی کوشش کروں گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ اس کوشش میں جیلر یا برقنداز کی گولی کا نشانہ بن جاؤں گا تو بہت اچھا، مجھے اس کو گوارا کر لینا چاہئے۔ قیدی کی زندگی سے، اور برقنداز کی غذا بننے سے لاکھ درجہ بہتر ہے کہ لڑ کر مر جاؤں۔ اس مردانہ کام میں دوسری کا سبھی مگر یہ امکان بھی ہے کہ مجھے اپنی کوشش میں کامیابی نصیب ہو جائے اور میں اپنے مکار رفیق زنداں سے کہہ سکوں کہ برادرم! جیل کی ہوا بھول جاؤ اور سیدھی طرح شریف ہمسایہ بن کر رہو۔

استدراک:۔ اس باب کو ختم کرنے سے پہلے ایک چیز قابل ذکر ہے۔ ۹ نومبر ۳۸ء کے زمزم میں جناب مولانا ابوالکلام آزاد کا ایک بیان شائع ہوا ہے جس میں مولانا نے سی پی کے متعلق بعض شکایات کی تردید فرمائی ہے اور بعض کے متعلق بیان فرمایا ہے کہ جب وہ ان کے علم میں آئیں تو انہوں نے کانگریس پارلیمنٹری کمیٹی کو توجہ دلائی اور اس نے اس کی تحقیقات یا تلافی کرنے کی کوشش کی۔ یہاں اس بیان پر تفصیلی تبصرہ کی گنجائش نہیں مگر مختصراً میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جن باتوں سے مولانا خود اطمینان حاصل فرما رہے ہیں اور جن پر مسلمانوں کو مطمئن کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں وہ درحقیقت قابل اطمینان نہیں ہیں۔ خود ان کے اپنے بیان سے یہ حقیقت واضح ہو رہی ہے کہ اس سراسر غلط جمہوری نظام میں طاقت تو سمٹ سمٹا کر اکثریت کے ہاتھ میں آگئی ہے اور ہماری اصلی حیثیت اب یہ ہے کہ اگر وہ ہم پر ظلم کریں تو ہمارا کوئی نمائندہ جا کر سردار پٹیل کی خدمت میں یا کسی اور سرکاری کی خدمت میں عرض معروض کر دے، اور اس ظلم کی تلافی صرف اس وقت ہو سکے جبکہ وہ بربنائے عنایت و مہربانی یا بربنائے مصلحت وقت تلافی کرنا چاہیں یہ پوزیشن کسی طرح بھی اس غلامی کی پوزیشن سے مختلف نہیں جو اب تک انگریزی سلطنت میں ہمیں حاصل رہی ہے۔ یہاں بھی کوئی مصیبت مسلمانوں پر پیش آتی ہے تو کوئی فضل حسین یا کوئی شفیع خود اس کا تدارک نہیں کر سکتا بلکہ جا کر وائسرائے بہادر سے عرض کرتا ہے یا کسی صوبہ کے گورنر صاحب کو توجہ دلاتا ہے، اور اگر وہ مہربان

ہوں یا مصلحتہً اس کی ضرورت سمجھیں تو تدارک ہو جاتا ہے ، ورنہ اگزیکٹیو کونسل کے ممبر صاحب اپنا سا منہ لیکر رہ جاتے ہیں اور بدستور اس امید میں رکنیت کی کرسی سے چپکے رہتے ہیں کہ شاید کسی دوسرے موقع پر یہ منصب کام آجائے ۔ ہمارا اصلی اعتراض دراصل اسی پوزیشن پر ہے ۔ مان لیا کہ کانگریسی صوبوں میں اس وقت بڑی حق پسندی اور نہایت درجہ کے عدل و انصاف کے ساتھ حکومت ہو رہی ہے اور یہ بھی تسلیم کر لیا کہ جتنی شکایات ابتک مسلمان اخبارات میں شائع ہوئی ہیں سب کی سب جھوٹی ہیں ۔ مگر سوال یہ ہے کہ دستوری نوعیت کیا ہے اور آئندہ کی لڑائی کس نوعیت کے دستوری ارتقاد کے لئے ہو رہی ہے اگر اس کی نوعیت یہی ہے کہ ہم اس جھوٹے جمہوری نظام میں محض اپنے سروں کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے محکوم ہوں اور ہندو صرف اس لئے ہم پر حاکم ہوں کہ ان کے سر ہم سے زیادہ ہیں ، تو ظلم اس نظام کی عین فطرت میں پوشیدہ ہے ۔ آج اگر مولانا ابوالکلام کی اس لئے سن لی جاتی ہے کہ ان سے کچھ زیادہ بڑا کام لینا ہے تو کل کسی ابوالکلام کی نہ سنی جائیگی اور کسی ابوالکلام میں یہ طاقت نہ ہوگی کہ جب اس کی نہ سنی جائے تو وہ کچھ کر سکے ۔ ہمارا اصلی جھگڑا اسی باطل اصول سے ہے اور مولانا یہ سمجھے ہیں کہ بس تمام شکایت بتیوں کے مدرسے اور ودیا مندر کے نام اور ایسی ہی چند چھوٹی چھوٹی چیزوں کے متعلق ہے ۔ جو لوگ مولانا کے علم اور انکی دانائی کے معترف ہیں وہ اس سے کچھ زیادہ دانشمندی و بصیرت کی توقع ان سے رکھتے تھے ۔

# تنبیہ الغافلین

گذشتہ صفحات میں نیشنلزم اور آزادئ ہند کی وطن پرستانہ تحریک کا جو علمی اور واقعاتی تجزیہ کیا گیا ہے اس سے یہ بات آفتاب نصف النہار کی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ ہمارے اور اس تحریک کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں ہے ہماری موت اسکی زندگی ہے اور اس کی موت ہماری زندگی۔ ہمارے اور اس کے درمیان اصول میں، مقاصد میں اور طریق کار میں صرف یہ کہ کسی قسم کا اتحاد نہیں ہے، بلکہ درحقیقت کلی اختلاف ہے۔ ایسا شدید اختلاف، کہ کہیں کسی ایک نقطہ پر بھی ہم اور وہ جمع نہیں ہوتے، ہمارا اور اس کا تباین اس نوعیت کا ہے جیسا مشرق اور مغرب کا تباین ہے کہ جو شخص مغرب کی طرف جانا چاہتا ہو اس کیلئے بجز اس کے کوئی چارہ ہی نہیں کہ مشرق سے منہ موڑ لے۔

اب جو شخص اس تحریک کے ساتھ چلتا ہے اور اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتا ہے وہ لامحالہ دو حالتوں میں سے کسی ایک حالت میں مبتلا ہے۔ یا تو وہ اس تحریک کی حقیقت اور اس کے منطقی اور واقعی نتائج کا پورا شعور رکھتا ہے اور اس شعور کے ساتھ اس نے اپنے لئے یہ راستہ منتخب کیا ہے۔ یا پھر وہ کسی غلطی کا شکار ہے۔

پہلے شخص سے ہمارا کوئی جھگڑا اس کے سوا نہیں ہے کہ ہمیں اس کی منافقت پسند نہیں۔ ہم اس سے صاف کہتے ہیں کہ جب تم اسلامی قومیت کی نفی کرنے کیلئے بالارادہ تیار ہو اور اس جمہوری نظام میں صرف ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے شریک ہونا چاہتے ہو جس کو واحد وطنی قومیت کی بنیاد پر تعمیر کیا جا رہا ہے تو تمہیں آخر کس نے مجبور کیا ہے کہ اپنے آپکو نام چار کے لئے مسلم سوسائٹی سے بھی وابستہ رکھو؟ یہ نہ صرف منافقانہ حرکت ہے بلکہ اس میں تمہارا اپنا سراسر نقصان ہے۔ "مسلمان" کا ٹھپہ جب تک تمہارے اوپر لگا رہے گا اس وقت تک اکثریت کی حکومت میں تمہارے ساتھ امتیازی برتاؤ بہرحال ہوگا۔ خواہ تم ایک سو ایک فیصدی نیشنلسٹ بنجاؤ، تمہارا نام ہر جگہ تمہاری راہ میں حائل ہوگا۔ ہر ذمہ داری کا منصب تمہیں دیتے ہوئے اکثریت جھجکے گی۔ صدارت کی کرسی، وزارت عظمیٰ، پارٹی لیڈرشپ، مالی اعانت غرض ہر اہم چیز کو دینے میں فطری طور پر بخل سے کام لیا جائے گا۔ اس معاملہ میں اگر تم ایثار کے لئے تیار ہو تب بھی

تو انہیں سمجھ لینا چاہئے کہ "ایک علیحدگی پسند" قوم سے ظاہری وابستگی برقرار رکھکر تم اپنے مقصد۔ واحد قومیت کی تعمیر۔ کو نقصان پہنچا رہے ہو۔ جبکہ ایک قوم اپنی جداگانہ ہستی قائم رکھنے پر اصرار کر رہی ہے تو تمہارے اوپر یہ فرض عائد ہو جاتا ہے کہ اس سے علیحدگی اختیار کرو بشرطیکہ تم اپنے مقصد کے سچے وفادار ہو۔

اب رہ جاتا ہے وہ شخص جو اپنی قومیت کی نفی نہیں کرنا چاہتا۔ بلکہ دل سے اس کے بقا اور نشو و نما کا آرزومند ہے، اور اس امر کی حقیقی خواہش رکھتا ہے کہ آزاد ہندوستان میں اس کی قومیت کو آزادی خود اختیاری اور ترقی کا پورا موقع ملے، مگر اس کے باوجود کسی غلطی یا غلط فہمی کی وجہ سے اس تحریک میں شامل ہو گیا ہے جو اس کے قومی نصب العین سے اصولی، مقصدی، اور عملی مخالفت رکھتی ہے۔ ایسے شخص کی حالت کا ہمیں تجزیہ کر کے دیکھنا ہو گا کہ وہ کس نوعیت کی غلطی یا غلط فہمی میں مبتلا ہے۔

اس کے مرض کا ایک سبب یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اس تحریک کی حقیقت سے واقف نہ ہو، بلکہ چند سطحی باتیں اپنے حسب منشا پاکر اس کے ساتھ لگ گیا ہو۔ گذشتہ صفحات اس بیماری کا علاج کرنے کے لئے کافی ہیں۔ آنکھیں کھولکر انہیں پڑھے گا تو انشاء اللہ شفایاب ہو جائے گا۔

دوسرا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ اس تحریک کی حقیقت اور اس کے نتائج کو سمجھتا ہو، مگر علم و واقفیت کی کمی نے اسے غلط فہمی میں مبتلا کر دیا ہو کہ ہندوستان میں آزاد حکومت کا نشو و نما ان جمہوری اصولوں کے سوا کسی دوسری صورت سے ممکن ہی نہیں ہے جن کو یہاں رواج دیا جا رہا ہے، لہٰذا وطنی آزادی کی خواہش رکھنے والے کو چار و ناچار انہیں قبول کرنا ہی پڑیگا ورنہ پھر دوسرا راستہ اور ایک ہی راستہ انگریز کی غلامی کا ہے۔ جو لوگ اس غلطی کے شکار ہوئے ہیں انہیں اس کتاب کا آخری باب کھلے دل سے پڑھنا چاہئے۔ ہمیں امید ہے کہ ان کی پوری تشفی ہو جائے گی۔

تیسرا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ علمی و نظری حیثیت سے تو ایک شخص کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہے۔ مگر یاس، بزدلی اور کم ہمتی نے اس کے دل پر قابو پالیا ہے۔ اسے یہ تو خبر نہیں ہے کہ ہندوستان کے مسئلہ کو حل کرنے کی دوسری صحیح تر صورتیں بھی موجود ہیں۔ مگر وہ ایک طرف اپنی قوم کی بیچارگی کو دیکھتا ہے اور دوسری طرف یہ دیکھ کر ہیبت زدہ ہو جاتا ہے کہ وطنی قومیت اور جمہوریت کی پشت پر زبردست طاقتیں ہیں جن کا مقابلہ یا تو

کیا ہی نہیں جا سکتا، یا اگر کیا جا سکتا ہے تو اپنے آپ کو بربادی و ہلاکت کے خطرے میں ڈالنا پڑیگا اور پھر بھی کامیابی کی امید کم ہی ہے۔ ایسے شخص کیلئے ہم خدا سے دعا کریں گے کہ اس کے دل میں ایمان کی طاقت پیدا ہو، اور خود اس شخص کو بھی مشورہ دیں گے کہ بندۂ خدا، اگر تجھ میں تائید حق کا بل بوتا نہیں ہے تو باطل کی تائید کر کے اپنی قبر میں آگ کیوں بھر رہا ہے۔ جا، اور گوشے میں بیٹھ بیٹھ کر اللہ اللہ کر، یہ فتنہ کا وقت ہے۔ جو مرد میدان بن کر نہیں نکل سکتا اس کے لئے سلامتی ایمان کی راہ صرف یہی ہے کہ اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے۔

چوتھا سبب یہ بھی ممکن ہے کہ آدمی پر جذبۂ انتقام مستولی ہو گیا ہو۔ اسے انگریز کے ہاتھوں سے اتنی تکلیفیں پہنچی ہوں کہ وہ جوش غضب میں اندھا ہو گیا ہو اور کہتا ہو کہ اگر حق کی تلوار نہیں ملتی تو پروا نہیں، میں باطل ہی کی تلوار سے اس دشمن کا سر اڑاؤں گا چاہے ساتھ ہی ساتھ میری اپنی ملت کی بھی رگ جان کٹ جائے۔ ایسے شخص کی بیماریٔ دل کا علاج خداوند عالم کے سوا اور کسی کے پاس نہیں۔ اللہ اس کو توبہ کی توفیق عطا فرمائے، ورنہ ڈر ہے کہ جس راہ پر وہ اس جذبہ کے ساتھ چل رہا ہے اس میں اپنی عمر بھر کی کمائی ضائع کر دیگا اور قیامت کے روز اس حال میں خدا کے سامنے حاضر ہو گا کہ ساری عبادتیں اور نیکیاں اس کے نامۂ اعمال سے غائب ہونگی اور ایک قوم کی قوم کو گمراہی و ارتداد میں مبتلا کرنے کا مظلمۂ عظیم اس کی گردن پر ہو گا۔ یَحْمِلُوْنَ اَوْزَارَهُمْ وَ اَوْزَارَ الَّذِیْنَ یُضِلُّوْنَهُمْ ـــ پانچواں سبب یہ ہے کہ ایک شخص اس فعل کو کار ثواب سمجھ کر کر رہا ہو۔ وہ اس خیال میں مبتلا ہو کہ دنیائے اسلام کو انگریزی امپیریلزم کے پنجے سے چھڑانے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ آزادیٔ ہند کی اس تحریک کا ساتھ دیا جائے۔ اب اگر اس میں ہندوستان کی مسلمان قوم ختم ہو جائے تو پروا نہیں، ہندوستان سے باہر کے مسلمان تو اس بلا سے نجات پا جائیں گے۔ اس خیال خام نے جس شخص پر قابو پا لیا ہے اس سے ہم تین باتیں عرض کریں گے:۔

(۱) انگریزی امپیریلزم کو اگر کوئی چیز ختم کر سکتی ہے تو وہ آزادی کامل کی خالص انقلابی تحریک ہی ہے۔ اس کے بغیر نہ یہ بلا دور ہو گی نہ آپ کا مقصد حاصل ہو گا۔ لیکن یہ تحریک جس کا ساتھ آپ دے رہے ہیں نہ آزادی کامل کی تحریک ہے اور نہ خالص انقلابی تحریک۔ اس کی جو حقیقت ہم پچھلے صفحات میں بیان کر چکے ہیں اس کی تردید میں اگر آپ کے پاس کانگریسی لیڈروں کے بعض زبانی دعووں کے سوا کوئی ثبوت ہو تو بسم اللہ، اسے سامنے لایئے۔ ورنہ صریح واقعات کے خلاف آپ کا اپنی جگہ یہ سمجھ بیٹھنا کہ اس تحریک کی حمایت سے آپ دنیائے اسلام کو

آزاد کرالیں گے محض بے معنی ہے اور بلادت ذہن کے سوا کسی دوسری چیز پر دلالت نہیں کرتا۔

(۲) پھر اگر بالفرض اس وطنی قومیت کی تحریک سے آپکو فی الواقع دنیائے اسلام کی آزادی حاصل بھی ہو سکتی ہو تو ہم کہیں گے کہ اس پاک مقصد کیلئے یہ ناپاک ذریعہ اختیار کرنا ہرگز جائز نہیں خوب سمجھ لیجئے کہ اس تحریک کی کامیابی اور ہندوستان کی مسلمان قوم کا ارتداد دونوں لازم و ملزوم ہیں، اس کا مآل یہ ہے کہ آٹھ کروڑ مسلمانوں کی عظیم الشان قوم رفتہ رفتہ مرتد ہو جائے اور اس کی آئندہ نسل سے مادہ پرست دہریئے پیدا ہوں جن کے عقائد، اخلاق اور عمل میں اسلامیت کا شائبہ تک نہ پایا جائے۔ کیا اس نتیجہ کو سامنے رکھکر کوئی شخص جو علم دین سے ذرہ برابر بھی بہرہ رکھتا ہو یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ دنیائے اسلام کی آزادی کیلئے یہ قربانی دینا بھی جائز ہے؟ اگر محض جان اور مال کی قربانی کا سوال ہوتا تو پروانہ تھی ہم کھلے دل کے ساتھ کہتے کہ اس سرزمین کا ایک ایک مسلمان اس مقصد کیلئے کٹ مرے حتی کہ ایک بچہ بھی زندہ نہ رہے۔ لیکن یہاں سوال دین و اخلاق کی قربانی کا ہے۔ یہاں یہ قربانی دینی پڑتی ہے کہ ہماری نسلیں باقی رہیں مگر مسلمان نہ رہیں۔ تو یہ قربانی دنیا کی کسی بڑی سے بڑی اور مقدس سے مقدس چیز حتی کہ بیت اللہ اور گنبد خضرا کے لئے بھی نہیں دی جا سکتی۔

(۳) وطن پرستی کی یہ تحریک اگر کامیاب ہو جائے تو دنیائے اسلام کے لئے انگریزی امپیریلزم کے بجائے ہندوستانی امپیریلزم کا خطرہ پیدا کر دیگی۔ نیشنلزم تاریخ کے دوران میں اکثر امپیریلزم کی شکل اختیار کرتا رہا ہے اور آج بھی اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ شتر مرغ کی طرح ریت میں منہ چھپا لینے سے کچھ حاصل نہیں آپکو اچھی طرح جان لینا چاہیئے کہ نیشنلزم کا نشہ جب کامیابی سے ہمکنار ہو گا تو امپیریلزم کا جنون بن جائیگا اور اس وقت دنیائے اسلام کے قلب میں ایک دوسرا جاپان پیدا ہو گا۔ آپکی نسل نے تو محض پیٹ کی خاطر ارض عرب میں داد مردانگی دی ہے لیکن آپ کی آئندہ نسل جو دھاانکم اور دیا مندر اسکیم سے تیار ہو گی وہ اعتقاد کی قوت کے ساتھ یہ خدمت انجام دیگی۔ اس کا ضمیر اس فعل پر ملامت نہ کریگا بلکہ الٹا فخر کریگا کہ اس نے ہندوستان کا نام اونچا کیا اور اپنی قوم ماتا کے آگے دور و نزدیک کی قوموں کے سر جھکا دیئے۔ پس درحقیقت ہندوستان کے مسلمان پر نیشنلزم کے شیطان کو مسلط کرنا دنیائے اسلام کی بھی کوئی خدمت نہیں ہے۔

اب ایک غلط فہمی اور رہجاتی ہے جسے دور کر دینا ضروری ہے۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس ملک

میں کانگریس ایک طاقت بن چکی ہے اور ایسی طاقت بن گئی ہے جس نے سیاسی قوت واقتدار کے تمام سرچشموں پر قابو پالیا ہے۔ اس سے الگ رہنا یہ معنی رکھتا ہے کہ ہم ان سرچشموں سے خود دستبردار ہوگئے اور دوسرے لوگوں کو آپ سے آپ ان کا قبضہ دیدیا۔ زیادہ صحیح تدبیر یہ ہے کہ اس جماعت کے اندر گھس جاؤ اور وہاں طاقت پیدا کرو۔ اس کا کم سے کم فائدہ یہ ہے کہ ہندو راج کے حامیوں کا زور ٹوٹ جائیگا اور مسلمان سیاسی طاقت میں حصہ دار بن جائیں گے اور اس میں زیادہ سے زیادہ فائدہ کے بھی امکانات ہیں۔ مثلاً یہ کہ مسلمان سوشلسٹ گروہ کے ساتھ مل کر مہاسبھائی عنصر کو شکست دے دیں اور یہ کہ مسلمان اپنی بالاتر تہذیب سے ہندوؤں کو متاثر کریں اور آگ کی طرح ان کی تہذیب ہندوؤں میں پھیلتی چلی جائے۔

یہ بڑی دل خوش کن باتیں ہیں۔ مگر ہمیں تنقید کرکے دیکھنا چاہئے کہ اس میں حقیقت کتنی ہے اور جنت حمقا کی ہوائیں کس قدر شامل ہوگئی ہیں۔

بلاشبہ کانگریس کا نظام جمہوری ہے اور اس کے آئین میں اتنی گنجائش موجود ہے کہ جو گروہ چاہے اسمیں شریک ہوکر اقتدار کے مرکز پر قبضہ کرنیکی جدوجہد کرسکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح انگلستان کے آئین میں اس امر کی گنجائش موجود ہے کہ لبرل، کنزرویٹو، سوشلسٹ، کمیونسٹ جو چاہے پارلیمنٹ میں جانے اور وزارت پر قبضہ کرنیکی کوشش کرسکتا ہے۔ نظری حیثیت سے یہ بھی ممکن ہے کہ دو یا تین چھوٹی جماعتیں ملکر بڑی دوسری جماعت سے زیادہ طاقتور ہوجائیں اور مرکزی اقتدار حاصل کرلیں۔ لیکن یہاں سوال آئین اور اسکی نظری گنجائشوں کا نہیں بلکہ امور واقعیہ کا ہے۔ جو جماعت خالص جمہوری اصولوں پر مبنی ہو اس میں کسی ایسی پارٹی کے برسر اقتدار ہونیکا ہرگز کوئی امکان نہیں۔ جسکی حیثیت دراصل قومی اقلیت National Minority کی ہو، اور کثیر التعداد قوم کی تمام پارٹیوں میں جس کے خلاف قومی امتیاز اور قومی امپیریلزم کا جذبہ بطور ایک قدر مشترک کے پایا جاتا ہو۔ ایسی اقلیت نہ تو کبھی اکثریت بن سکتی ہے، اور نہ یہ امید کرسکتی ہے کہ کثیر التعداد قوم کی کوئی پارٹی اسکو برسر اقتدار ہونے میں مدد دیگی

ہمارے سامنے آئرلینڈ کی مثال موجود ہے۔ سنہ ۱۸۰۰ میں انگلینڈ اور آئرلینڈ کی یونین (وحدت) عمل میں آئی اور دونوں قوموں کو ایک قوم قرار دیکر ایک جمہوری نظام میں شریک کردیا گیا۔ دونوں کی ایک ہی پارلیمنٹ تھی۔ ایک ہی طریق انتخاب سے دونوں اپنے اپنے نمائندے منتخب کرکے اس جمہوری ادارہ میں

بھیجتے تھے۔ اور جہاں تک نظریہ کا تعلق ہے، آئین میں کوئی ایسی رکاوٹ موجود نہ تھی کہ آئرش نمائندے پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل کر کے گورنمنٹ پر قابض نہ ہو سکیں یا کسی دوسری پارٹی کے ساتھ مل کر وزارت نہ بنا سکیں لیکن فی الواقع ہوا کیا؟ اوکانل (O'Connell) جیسے آتش بیان خطیب اور ہوشیار قانون داں کی تدبیریں اور پارنل (Parnell) جیسے قابل پارلیمنٹری لیڈر کی چالیں بھی کچھ نہ کر سکیں۔ ایک سو بیس سال کی پوری تاریخ شاہد ہے کہ ایک دن کے لئے بھی آئرش نمائندوں کو برطانوی پارلیمنٹ میں اقتدار نصیب نہ ہوا۔ اور اقتدار تو درکنار، وہ غریب کسی آئینی تدبیر سے ان مصائب کو بھی دور نہ کر سکے جو انگریزی حکومت کے ہاتھوں ان پر نازل ہوتے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ آخر کار ان کو باہر سے لڑنا پڑا، اور آج کی آئرستانی حکومت کسی آئینی جدوجہد، کسی اندرونی تعاون کا نہیں بلکہ بیرونی جنگ کا نتیجہ ہے۔ یہی سبق ہم کو چیکوسلواکیہ کے جمہوری نظام سے ملتا ہے جہاں جرمن اور سلاوک اقلیتیں چیک اکثریت کے مقابلہ میں پارلیمنٹری طریقوں سے کچھ نہ کر سکیں۔ یہی سبق ہمیں یوگوسلیویا سے ملتا ہے جہاں کروٹس اور سلافینی آج تک کبھی کسی آئینی چال سے حکومت کے نظام پر قابض نہ ہو سکے۔ یہی سبق ہمیں امریکہ سے ملتا ہے جہاں ہر پارٹی حکومت پر قبضہ کر سکتی ہے مگر حبشی قوم کے لئے اس کا قطعاً کوئی امکان نہیں لہٰذا جو لوگ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ دراصل ہندوستان میں ہماری حیثیت محض ایک سیاسی پارٹی کی نہیں بلکہ ایک قومی اقلیت کی ہے، وہ کانگریس پر قبضہ کرنے کے خواب جس قدر چاہیں دیکھتے رہیں اگر عقل سے نہیں سمجھتے تو تجربہ انہیں بتا دیگا کہ یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکیں گے۔

بھول نہ جانا چاہئے کہ کانگریس کا اور ہمارا اختلاف محض ذرائع اور طریقوں (Means and Methods) کے اختلاف کی حیثیت نہیں رکھتا، یہ اصول، مقاصد اور پالیسی کا بنیادی اختلاف ہے۔ اس کے اصول قومیت و جمہوریت کو ہم بالکل بدل ڈالنا چاہتے ہیں۔ اس کے مقصد یعنی ایک قومی جمہوری لادینی اسٹیٹ کے قیام کو بھی ہم قبول نہیں کر سکتے۔ اس کی پالیسی یعنی بتدریج سیاسی اختیارات حاصل کرنے اور ان کی مدد سے ہندوؤں کی بالادستی عملاً قائم کر دینے، کو بھی ہم گوارا نہیں کر سکتے۔ یہ تینوں بنیادی چیزیں جب تک بدل نہ جائیں، کانگریس کے ساتھ ہمارا تعاون اسلامی اغراض کے لئے ذرہ برابر مفید نہیں۔ اب یہ دیکھنا چاہئے کہ آیا کانگریس کے اندر جا کر ہم انہیں بدل سکتے ہیں؟

داخلی مقاومت یا تعاون سے کسی جمہوری تنظیم کے اصول، مقاصد اور پالیسی میں تغیر پیدا کرنے کی تین ہی صورتیں ممکن ہیں:-

یا تو تغیر چاہنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو کہ وہ اس جماعت پر چھا جائیں۔ اس صورت میں کلی تغیر بھی ہو سکتا ہے۔

یا اس جماعت کے اندر ان کا نظام اتنا زبردست ہو کہ وہ اپنی منظم مقاومت سے اس جماعت کو پریشان کر دیں۔ اس صورت میں کلی تغیر تو نہیں۔ البتہ کسی حد تک تغیر ضرور ممکن ہے۔

یا پھر تغیر چاہنے والے اپنے اخلاقی اثر اور اپنے دلائل کی قوت سے اس جماعت کی رائے کو متاثر کر دیں، اور اس طرح وہ جماعت خود ہی حق اور عدل کی طرف مائل ہو جائے۔ اس طریقہ کی کامیابی تمام تر اس جماعت کی انصاف پسندی و حق آگاہی پر منحصر ہے۔

ان میں سے پہلی صورت تو یہاں ناقابل عمل ہے کسی حسابی معجزے کے بغیر یہ ممکن نہیں ہے کہ کانگریس میں مسلمانوں کے ووٹ ہندوؤں کے ووٹوں سے زیادہ ہو جائیں۔ لہٰذا جو لوگ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ کثرت سے کانگریس میں داخل ہو اور اس پر قابض ہو جاؤ ان کی بات اتنی ہی قابل التفات ہے جتنی اس شیر خوار بچے کی بات قابل التفات ہو سکتی ہے۔ جو بچارا ایک اور چار کی نسبت سے بھی واقف نہیں۔

رہی دوسری صورت تو داخل میں منظم جدوجہد اور مقاومت صرف اس طرح ممکن ہے کہ کانگریس میں جتنے مسلمان شریک ہیں، اور آئندہ شریک ہوں، وہ سب کے سب، یا ان کی ایک بہت بڑی اکثریت ایک پارٹی، بلکہ ایک ٹیم بن کر رہے۔ ان کی قیادت ایک ایسے دیندار گروہ کے ہاتھ میں ہو جو اسلامی مفاد کا صحیح احساس و شعور رکھتا ہو، اور وہ اس گروہ کی ایسی کامل اطاعت کریں کہ ان کا کانگریس میں رہنا یا نکل آنا اسکے حکم پر موقوف ہو، مگر کیا بحالات موجودہ کانگریس میں ایک مسلم پارٹی کی تنظیم اس طرز پر ہو سکتی ہے؟ واقعات سے اسکا جواب نفی میں ملتا ہے۔ وہاں جو مسلمان شریک ہیں ظاہر میں ان سب پر لفظ مسلمان کا اطلاق ہوتا ہے، اور آزادی ہند کے مسئلے میں وہ ہم آہنگ بھی ہیں لیکن اسلامی نقطہ نظر سے ان کے خیالات اس قدر متضاد ہیں کہ ان کو ایک پارٹی میں منسلک کرنے کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں سے ایک گروہ تو قطعی طور پر اسلام سے منحرف ہو چکا ہے، اور حمایۃً یہ رائے رکھتا ہے کہ ہندوستان کے آئندہ نظام اجتماعی میں مذہب کیلئے کوئی جگہ نہیں۔ دوسرا

گروہ نہ منحرف ہے اور نہ معتقد اس گروہ میں اتنی مختلف اقسام پائی جاتی ہیں جتنی سانپوں کی اقسام ہیں ان میں سے بعض اسلام کے متعلق خود اپنے کچھ تصورات رکھتے ہیں جن کے لئے کتاب وسنت کی سند غیر ضروری ہے بعض کو مسلمانوں کے سیاسی و معاشی مفاد سے تو ضرور دلچسپی ہے مگر اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں بعض ایسے ہیں جو مسلمانوں کے مفاد کو کسی حد تک اہمیت ضرور دیتے ہیں، مگر اتنی نہیں کہ ملک کے مفاد کا جو تصور ان کے دماغ میں ہے اس پر مسلمانوں کے مفاد کو قربان کرنے میں انہیں کوئی تامل ہو تیسرا گروہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جو دیندار، اہل علم اور نیک نیت ہیں کانگریس میں جب کبھی ہندوستان کے مشترک مفاد کا کوئی مسئلہ اُٹھے گا یہ تینوں گروہ ایک آواز بلند کرینگے مگر جب اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کا سوال آئیگا تو یہ اس قدر بھانت بھانت کی بولیاں بولیں گے کہ اسلام اور مسلمان، دونوں غیر مسلموں کے لئے مضحکہ بنکر رہ جائیں گے، اور یہ متعین کرنا بھی مشکل ہو جائیگا کہ حقیقت میں اسلام کیا چیز ہے، اور مسلمانوں کا مفاد کس چڑیا کا نام ہے۔

ماس کانٹیکٹ کے ذریعہ سے یہ تینوں گروہ مسلمانوں کو کانگریس میں بھرتی کر رہے ہیں، اور اب علمائے کرام کے صدقے میں کانگریس کے ہندو کارکن بھی بھرتی کا کام کرنے کے قابل ہو گئے ہیں۔ اس طرح جو مسلمان کانگریس میں جا رہے ہیں وہ تینوں گروہوں اور ان کی بےشمار شاخوں میں تقسیم ہوتے چلے جاتے ہیں کانگریس کے ہندو ارکان کی ہمدردیاں تمامتر پہلے گروہ سے وابستہ ہیں، خواہ وہ گاندھی جی ہوں یا جواہر لال یا کوئی سخت مہاسبھائی، بہر حال فطرۃً ان سب کا میلان ان نام نہاد مسلمانوں کی طرف ہے جو اسلام سے اعتقاداً اور عملاً منحرف ہو چکے ہیں۔ اور جو اسوقت ہندوستان میں اسلام اور مسلم قومیت کی جڑیں کاٹنے کیلئے بدترین منافقوں کا پارٹ ادا کر رہے ہیں، کانگریس کے ذمہ دار عہدے اور کانگریسی حکومتوں کے تحت عزت اور منفعت اور اثرو اقتدار کے مناصب تمامتر انہیں منافقین کیلئے وقف ہیں اور رہیں گے۔ انکے بعد کانگریسی لیڈروں کے نزدیک اگر کوئی گروہ قابل ترجیح ہے تو وہ دوسرا گروہ ہے، اور اس گروہ میں بھی خصوصیت کے ساتھ وہ طبقہ جو منافقین کے مقام سے اقرب ہے۔ باقی رہا تیسرا گروہ اور اس سے قریب تر تعلق رکھنے والے طبقے، تو ان کو محض آلۂ کار کی حیثیت سے استعمال کیا جا رہا ہے جبتک وفادار خدام کی حیثیت سے صرف رنگروٹ بھرتی کرتے رہینگے، ان سے مداہنت برتی جائیگی جہاں انہوں نے کچھ زور پکڑا اور اسلامی مفاد کا نام لیا، ان پر منافقین کی اس فوج کو ہشکا دیا جائیگا جو اسی دن کیلئے پرورش کی جا رہی ہے ایسے موقع پر ہندو لیڈروں کو خود سامنے آنے کی تکلیف بھی نہ اٹھانی پڑیگی۔ ہماری اپنی قوم کے منافقین ہی ہمارے دینداروں کو

بھینٹ چڑھائیں گے۔ کیا ایسی حالت میں کانگریس کے اندر رہ کر اسلامی مفاد کے لئے کوئی منظم جدوجہد کی جاسکتی ہے؟

اس کے بعد تیسری صورت باقی رہ جاتی ہے۔ جہاں تک اخلاقی اثر اور دلیل وحجت کا تعلق ہے اس کیلئے کثرت تعداد کی کوئی حاجت نہیں۔ اگر کوئی جماعت واقعی حق پسند اور انصاف شعار ہے تو اس کو ایک تنہا شخص بھی حق کا اعتراف کرنے اور انصاف سے کام لینے پر آمادہ کر سکتا ہے۔ اب ہم پوچھتے ہیں کہ گذشتہ چند مہینوں میں کانگریسی حکومتوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو صریح اور ناقابل انکار بے انصافیاں کی ہیں، ان میں سے کس کی تلافی ہمارے دیندار کانگریسی بھائیوں نے اپنے اخلاقی اثر اور زور استدلال سے کرائی؟ کیا وردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم میں ایک شوشے کا بھی تغیر کرالیا؟ کیا گائے کی قربانی کو دفعہ ۱۴۴ کی زد سے بچالیا؟ کیا اس صریح بے انصافی کا کوئی تدارک کرالیا جو بہار اور سی پی کے ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپلٹیوں کے مسلمانوں کے ساتھ روا رکھی گئی؟ جگہ جگہ مدرسوں اور پبلک جلسوں میں مسلمانوں کو بندے ماترم کیلئے قیام تعظیمی پر جو مجبور کیا جارہا ہے، کیا اس کا کوئی تدارک کرالیا؟ (اور اگر یہ نہیں تو یہی ارشاد ہو کہ صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر صلوٰۃ و سلام بھیجنے ہی کیلئے قیام تعظیمی ممنوع ہے، اور صرف اسی پر رسالے تصنیف کرنے اور فتوے شائع کرنے کی بھی ضرورت ہے؟ باقی رہا بندے ماترم تو وہ اس سے بالاتر ہے کہ اس کیلئے قیام تعظیمی کرنے یا نہ کرنے کا سوال معرض بحث لایا جاسکے؟) سی پی کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ہندو وزراء اور ایک مسلمان وزیر کے ساتھ جو مختلف قسم کے طرز عمل اختیار کئے، کیا اس پر کوئی نتیجہ خیز بازپرس کرلی؟ حکومت کی طاقت سے اردو کو مٹانے اور ہندی کو ابھارنے کی جو کوششیں ہو رہی ہیں، کیا ان کو رکوادیا؟ کانگریسی حکومتوں میں نہایت متعصب اور بدنام بھائیوں کو جو ذمہ دار عہدے دیئے گئے ہیں، کیا ان پر کوئی موثر احتجاج کرلیا؟ اگر کوئی کانگریسی مسلمان سخن پروری کے ساتھ نہیں بلکہ دیانت اور صداقت کے ساتھ ان امور کے متعلق اپنا کوئی کارنامہ پیش کر سکتا ہے، تو سامنے آئے اور ضرور آئے۔ اور اگر اس کے پاس ہمارے ان سوالات کا کوئی جواب اس کے سوا نہیں ہے کہ ہماری پشت پر دیندار مسلمانوں کی اتنی طاقت ہی نہیں جس سے ہم ان بے انصافیوں کا تدارک کر سکیں، تو ہمارا مدعا خود اس کے اپنے اعتراف سے ثابت ہوگیا۔ ہم بھی اس سے یہی اعتراف کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ایک ایسی جماعت سے تعاون کر رہا ہے جو حق کو حق اور انصاف کو انصاف کی حیثیت سے قبول کرنے والی نہیں، بلکہ صرف زور اور طاقت کے آگے سر جھکانے والی ہے، لہٰذا اس کے ساتھ تعاون کر کے محض اخلاقی طاقت سے وہ کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔

# ہمارا نصب العین اور طریق کار

یہ تمام بحث جو اس تفصیل کے ساتھ پچھلے صفحات میں کی گئی ہے، اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم مسلمانوں کو ان کے غیر مسلم ہمسایوں سے لڑانا چاہتے ہیں، یا یہ بات ان کے دل میں بٹھانا چاہتے ہیں کہ اپنے ہموطنوں کے ساتھ ان کے اشتراک عمل کی کوئی صورت نہیں ہے یا یہ کہ ہم ان کو نفس آزادی ہند کا مخالف بنانے کی فکر میں ہیں محض اس خوف سے کہ ہندو یہاں کثیر التعداد ہیں اور وہ ہم کو کھا جائیں گے۔ کچھ لوگ سمجھ بوجھ کی کمی کے سبب سے، اور کچھ دوسرے لوگ ہوشیاری کی زیادتی کے باعث ہمارے دلائل سُن کر بے صبری کے ساتھ اسی نوعیت کے شبہات پیش کرنے لگتے ہیں، لیکن ہمارا مدعا دراصل کچھ اور ہے جس کی طرف اپنے مقدمہ میں ہم پہلے ہی اشارہ کر چکے ہیں اور اب ذرا زیادہ تفصیلی صورت میں اسے پیش کرتے ہیں۔

اس وقت ہندوستان میں ہمارے سامنے اصلی سوال یہ نہیں ہے کہ ہمیں اپنی ہمسایہ قوم کے ساتھ اشتراک عمل کرنا چاہئے یا نہیں، ہم آزادی وطن کے لئے جدوجہد کریں یا معطل ہو کر بیٹھے رہیں، ہمسایہ قوموں کے ساتھ مل کر چلیں یا لڑ کر گذر کریں۔ اس باب میں ظاہر ہے کہ دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ کم از کم کوئی ذی ہوش آدمی تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ مسلمان یہاں تمام دوسری قوموں سے قطع تعلق کر کے بھی رہ سکتے ہیں، یا یہ کہ انہیں آزادی کی ضرورت نہیں ہے، یا یہ کہ ہمسایوں کے درمیان تعلقات کی تلخی اور آئے دن کی سرپھٹول اور اجنبی حکمرانوں کا اس سے فائدہ اٹھانا کوئی مرغوب چیز ہے۔ اسی طرح ہمارے سامنے اصلی سوال یہ بھی نہیں ہے کہ اس ملک کے نظام حکومت کا ارتقاء جمہوریت کے راستہ پر ہو یا کسی دوسرے راستہ پر۔ کوئی خردمند نفس جمہوریت کی مخالفت نہیں کر سکتا۔ اور نہ یہ کہہ سکتا ہے کہ یہاں پادشاہی، یا امراگردی (ارسٹاکریسی)، یا اور کسی طرز کی حکومت ہونی چاہئے۔ دراصل حقیقت جو سوال ہمارے لئے ایک مدت سے پریشان کن بنا ہوا ہے، اور روز بروز زیادہ پریشان کن بنتا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ گذشتہ ستر اسّی سال سے ہندوستان میں انگریزوں کی غلط رہنمائی و فرمانروائی اور ہندوؤں کی خوش نصیبی

وخود غرضی کے سبب سے نظام حکومت کا نشوو ارتقاء واحد قومیت کے مفروضے پر جمہوری طرز ادارہ کی صورت میں ہوا ہے۔ نفس جمہوریت کو اور اس جمہوری طرز ادارہ کو جو واحد قومیت کے مفروضہ پر مبنی ہو، ایک دوسرے سے خلط ملط نہ کرنا چاہئے۔ دونوں میں زمین و آسمان کا بل ہے اور ایک سے اختلاف کرنیکے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم دوسرے سے اختلاف کر رہے ہیں۔ اب حقیقت نفس الامری تو یہ ہے کہ یہاں واحد قومیت موجود نہیں ہے اور واحد قومیت جن بنیادوں پر تعمیر ہو سکتی ہے وہ بھی موجود نہیں ہیں۔ لیکن یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ہم ہندو مسلمان، اچھوت، سکھ، عیسائی وغیرہ سب ایک جغرافی نام اور ایک سیاسی نظام رکھنے والے ملک میں پیدا ہونے اور رہنے سہنے کی وجہ سے ایک قوم ہیں لہٰذا ہمارے درمیان جمہوریت کا یہ قاعدہ جاری ہو سکتا ہے اور ہونا چاہئے کہ ہم میں سے جو جماعت کثیر التعداد ہو اسی کی مرضی کے مطابق حکومت چلے۔ اسی نظریہ کی بنا پر دستور حکومت بنایا گیا ہے اور آئندہ جو دستوری ارتقاء ہونیوالا ہے اس کے لئے یہی راستہ متعین کر دیا گیا ہے۔ انگریز اپنے نزدیک اسی کو صحیح سمجھتا ہے اور اس کے پاس طاقت ہے جس کے بل پر وہ ہندوستان کو اس راستہ پر لئے جا رہا ہے۔ ہندو اپنے لئے اس کو سراسر مفید پاتا ہے اور وہ قوم پرستانہ جوش کے ساتھ اس پر جانے کے لئے آمادہ ہے۔ اس صورت حال نے اس کے لئے ہندو قوم پرستی اور ہندوستانی وطن پرستی دونوں کو ایک کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وطن کی سچی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو آزادی اور خود مختاری ایسے ہی جمہوری نظام کی شکل میں حاصل ہو۔ ہندو قوم پرستی کے جتنے حوصلے اس کے سینے میں فطری طور پر پیدا ہوتے ہیں وہ بھی سب کے سب اسی ایک چیز میں پورے ہو جاتے ہیں، لہٰذا وہ اس میں نہ تو کوئی قباحت محسوس کرتا ہے، نہ اس امر کی کوئی وجہ ہے کہ وہ قباحت محسوس کرے۔ اور نہ اس کے لئے یا اس کے سرپرست کے لئے ان لوگوں کے احساسات کو سمجھنا آسان ہے جو اس میں قباحت پاتے ہیں۔ اپنے سرپرست کے ساتھ اس کی کشاکش جو کچھ بھی ہے صرف اس امر میں ہے کہ یہ اس راستہ پہ جلدی بڑھنا چاہتا ہے۔ اور دور تک پہنچ جانا چاہتا ہے، اور وہ اس کی خواہش کو پورا کر دینے میں تامل کر رہا ہے۔ مگر ہمارا معاملہ بالکل برعکس ہے۔ ہمارے لئے اس نظام میں قباحت ہے اور اس کی مزید ترقی میں مضرت ہے اور اس کی تکمیل میں ہلاکت ہے۔ ہندو کے برخلاف ہمارا حال یہ ہے کہ اس نظام میں ہمارے قومی حوصلے پورے نہیں ہوتے بلکہ

ان کا گلا گھٹ جاتا ہے، ان کی جڑ کٹ جاتی ہے، اس لئے کہ ہم شمار میں کم ہیں اور یہ نظام جو کچھ دیتا ہے ان کو دیتا ہے جو شمار میں زیادہ ہوں۔ جو کچھ یہ دیتا ہے، اگر ہم اسے لینا چاہیں تو لازم آتا ہے کہ اپنی قومی خودی کو خود مٹادیں، اور اگر ہم اپنی خودی کو باقی رکھنا چاہیں تو یہ ہمیں کچھ نہیں دیتا جس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دستوری ارتقاء کے ساتھ ساتھ تمام طاقت دوسروں کے ہاتھ میں چلی جائے اور وہ بزور ہماری خودی کو مٹائیں۔ اس صورت حال نے ہم کو ایسی جگہ لاکر کھڑا کر دیا ہے جہاں ہمیں صرف یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ خودکشی اور سزائے موت میں سے کسی ایک چیز کو منتخب کرلیں۔ ہمارے سامنے زندگی اور آزادی پیش ہی نہیں کی جاتی بلکہ صرف یہ چیز پیش کی جاتی ہے کہ یا تو اپنے وجود کی خود نفی کردو، یا پھر اپنے آپکو سپرد کردو تاکہ یہ نفی کرنے کی خدمت دوسرے انجام دیں۔ پس جو سوال ہم کو حل کرنا ہے وہ یہ ہے کہ یہ چکر جس میں لاکر ہم پھنسا دیئے گئے ہیں اس سے نکلنے کی بھی کوئی صورت ہے یا نہیں؟

دوسری قلیل التعداد قوموں کی پوزیشن کیا ہے؟ اس کا فیصلہ ہم نہیں کرسکتے۔ یہ ان کا اپنا کام ہے کہ اس کو سمجھیں اور رائے قائم کریں کہ واحد قومیت پر جمہوری نظام کی تعمیر کے منطقی اور واقعی نتائج انہیں قبول ہیں یا نہیں۔ ہم صرف اپنی پوزیشن کو پوری طرح سمجھ سکتے ہیں اور اسی کے متعلق ٹھیک طور پر کہہ سکتے ہیں۔ ہم ایک مستقل قوم ہیں جس کی اجتماعی زندگی ایک مخصوص اخلاقی و تمدنی قانون پر مبنی ہے۔ اکثریت کی قوم میں اور ہم میں اساسی اور اصولی اختلافات ہیں۔ اس کے اخلاقی و تمدنی اصول ہمارے اصولوں سے مختلف ہیں۔ جب تک یہ اختلاف باقی ہے، یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ ہم اور وہ من کل الوجوہ ایک ہو جائیں۔ جن امور کو مشترک کہا جاتا ہے ان میں بھی تفصیلات پر پہنچکر ہمارے اور ان کے درمیان اختلاف نقطہ نظر کا، مقاصد اور ضروریات کا، اصولوں اور طریقوں کا اختلاف پیدا ہوجاتا ہے۔ مثلاً تعلیم کو لیجئے جہالت کو دور کرنا اور تعلیم کو عام کرنا اور کارآمد تعلیم دینا ہم بھی چاہتے ہیں اور وہ بھی۔ اس حد تک ہمارے اور ان کے درمیان اشتراک ہے اور ہم بڑی خوشی کے ساتھ اس کار خیر میں ان کے ساتھ مل کر جدوجہد کرسکتے ہیں۔ مگر تعلیم کا مسئلہ تخلیق مقصد حیات، تعمیر ذہنیت، تشکیل اخلاق، تصویر عادات اور فی الجملہ اس خاص ٹائپ کی پرورش کے ساتھ لازمی طور پر جڑا ہوا ہے جسے ایک قوم اپنے اسلاف سے پاتی ہے اور اپنی آئندہ نسلوں میں

ترقی کے ساتھ برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ تعلیم کی اس تفصیلی صورت میں ہمارے اور ان کے درمیان اتفاق نہیں ہے
ہم یہ ضرور چاہیں گے کہ ہماری اور ان کی آئندہ نسلوں میں حسن سلوک ہو، شریفانہ ہمسائگی کے تعلقات ہوں اور
یہ ایک دوسرے کے ساتھ ملکر ہندوستان کی بھلائی کے لئے کام کریں۔ مگر یہ سب کچھ ہم اپنے نیشنل ٹائپ کا
تسلسل قائم رکھنے کے ساتھ چاہیں گے، نہ یہ کہ ہمارا نیشنل ٹائپ ان کے ٹائپ میں گم ہو جائے یا دونوں
گڈمڈ ہو کر کسی برہمو سماجی یا کبیر پنتھی وضع کے ٹائپ میں تبدیل ہو جائیں۔ لہٰذا تعلیم عمومی کے مسئلہ میں ہمارے
اور ان کے درمیان کلی اشتراک عمل ممکن نہیں، نہ یہ ممکن ہے کہ ہم میں سے کوئی ایک اپنی آئندہ نسل کو اطمینان
کے ساتھ دوسرے کے حوالہ کر دے اور اسے اختیار دے دے کہ ان کچی لکڑیوں کو جس صورت کا چاہے بنائے
ایسا ہی حال زندگی کے دوسرے اہم مسائل کا بھی ہے۔ خوشحالی ہم بھی چاہتے ہیں، مگر ہمارے اور ان کے معاشی
اصول، مناہج، مسائل بالکل یکساں نہیں ہیں۔ اصلاح معاشرت کے ہم بھی خواہاں ہیں، مگر اصلاح کے مفہوم
و معیار اور معاشرت کے اصول و قوانین میں ہم اور وہ بالکل متفق نہیں ہیں۔ تمدنی ترقی ہمیں بھی مطلوب
ہے، مگر تمدن کے قالب میں جو روح کام کرتی ہے، اور جو روح اس کی ترقی کا راستہ متعین کرتی ہے۔ وہ
ہمارے اور ان کے درمیان بالکل ایک نہیں ہے۔ پنڈت جواہر لال اور ان کی طرح کے سطح بین لوگوں
کے لئے یہ کہہ دینا آسان ہے کہ اس سائنٹفک تمدن کے دور میں ریل، ہوائی جہاز، ریڈیو اور کثیر پیداآوری
نے قوموں کے حدود امتیاز کو توڑ دیا ہے اور اب قومی تمدن کا
زمانہ ختم ہو گیا مگر ہم جانتے ہیں کہ اس وقت جو تمدن پھیل رہا ہے اس کی یہ خاص صورت مغربی تہذیب نے بنائی
ہے، اور اس تہذیب کو دنیا پر چھا جانے کا موقع اس لئے مل گیا ہے کہ وہ سائنس کے طاقتور وسائل سے کام
لے رہی ہے۔ یہی وسائل ہماری تہذیب کے ہاتھ آجائیں تو وہ اس سے زیادہ صالح اور زیادہ درخشاں تمدن
پیدا کرے گی اور وہ بھی اسی طرح قوموں کی حدود امتیاز کو توڑ کر ان کے گھروں تک گھستا چلا جائیگا۔ لہٰذا
پنڈت جی جیسے حضرات کی زبان سے بس یہ خبر سنکر کہ اب قومی تمدنوں کا زمانہ لد گیا ہے، ہم ہتھیار
نہ ڈال دیں گے اور نہ اس بات کے لئے راضی ہوں گے کہ جو تمدن پھیل رہا ہے اسی میں اپنے آپ کو گم کر دیں
خلاصہ یہ کہ ہماری اور ان کی راہیں متوازی تو چل سکتی ہیں اور کہیں کہیں مل بھی سکتی ہیں

لیکن از اول تا آخر ایک ہو جائیں، یہ کسی طرح ممکن نہیں۔

جب صورت حال یہ ہے تو ہمیں اور ان کو ملا کر ایک ایسا نظام حکومت کیونکر بنایا جا سکتا ہے جس میں جمہوریت کا قاعدہ نافذ ہو؟ ہم اس بات پر کیسے راضی ہو سکتے ہیں کہ زندگی کے کسی معاملہ کا جو فیصلہ چار ہندو کر دیں اسے ایک مسلمان بھی مان لے اور صرف اس لئے مان لے کہ یہ ایک ہے اور وہ چار ہیں خصوصاً اس زمانہ میں جبکہ حکومت کا دائرہ غیر محدود ہے اور پرانے نظریہ ریاست کے جتنے حرم تیار تھے ان سب کو توڑ کر شخصی زندگی تک گھس گیا ہے، ہم اس اصول کو کس طرح مان سکتے ہیں؟ اس کو مان لینے کے بعد تو لامحالہ دو ہی صورتیں پیش آ سکتی ہیں۔

(۱) اگر ہم حکومت میں عملاً حصہ دار بننا چاہیں تو اپنے امتیازی وجود کو مٹا دیں۔

(۲) اور اگر اپنے امتیازی وجود کو قائم رکھنا چاہیں تو حکومت سے عملاً بے دخل ہو جائیں۔

یہ ممکن ہے کہ اکثریت فیاضی سے کام لیکر ہمیں ان دونوں مشکلوں سے بچائے لیکن یہ تو اس کے رحم و کرم کی بات ہے اور کوئی قوم ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کسی دوسری قوم کے رحم و کرم پر نہ زندہ رہی ہے نہ رہ سکتی ہے۔ یہاں سوال فیاضی کا نہیں ہے بلکہ اس امر کا ہے کہ اس قسم کے جمہوری انتظام کی فطرت کیا ہے۔ اور ایسا جمہوری نظام جب ایک چھوٹی اور ایک بڑی قوم کو ملا کر بنایا جائیگا تو عملاً وہ چھوٹی قوم کو بڑی قوم کا محکوم بنا دیگا۔ اس میں بڑی قوم کو خود اختیاری ملے گی اور چھوٹی قوم کو بے اختیاری۔ اس میں عمومی حاکمیت کا جمہوری نظریہ قطعی باطل ہو جائیگا۔ بڑی قوم کو بہر حال حاکمیت حاصل ہو گی چاہے وہ اپنی جداگانہ قومیت پر اصرار کرے یا نہ کرے۔ مگر چھوٹی قوم حاکمیت میں حصہ دار نہیں ہو سکتی جب تک وہ اپنی قومیت سے دستبردار نہ ہو جائے۔ بڑی قوم اپنے تمام اصولوں پر قائم رہ سکتی ہے اور ان کو نہ صرف اپنے اوپر بلکہ دوسروں پر بھی نافذ کر سکتی ہے، مگر چھوٹی قوم کے لئے رفتہ رفتہ اپنے تمام اصولوں کو قربان کر دینا لازم آ جاتا ہے۔ وہ دوسروں پر نافذ کرنا تو درکنار خود اپنے اوپر بھی ان کو نافذ نہیں کر سکتی۔ اس کو اپنے اصول تہذیب پر قائم رہ کر ترقی کرنے بلکہ زندہ رہنے کا بھی موقع نہیں مل سکتا۔ اس کے اپنے ہاتھ میں کوئی ایسی طاقت نہیں آتی جس سے وہ اپنی خودی کو آپ برقرار رکھ سکے۔ اس کی خودی دوسروں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔

کرچاہیں اسے برقرار رہنے دیں یا اپنی خودی میں جذب کرلیں۔ کیا اس کا نام آزادی ہے؟ کیا اسے جمہوریت کہتے ہیں؟ کیا یہ عمومی حاکمیت ہے؟ کیا اس کے لئے ہم لڑیں اور جانفشانی دکھائیں؟ ہمیں آزادی کے لئے لڑنے سے انکار نہیں، مگر ہم یہ پوچھتے ہیں کہ اس نوعیت کے نظام میں ہمارے لئے آزادی ہے کہاں؟ ہم جمہوریت کے مخالف نہیں، مگر ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ جس عمومی حاکمیت کو جمہوریت کہتے ہیں۔ اس کے اندر ہمارا حصہ کہاں ہے؟ ہم اپنی ہمسایہ قوم کے ساتھ اشتراک عمل کرنے سے انکار نہیں کرتے مگر سوال یہ ہے کہ اشتراک عمل کی صورت کیا ہے؟ اس کی بنیاد کیا ہے؟ مشترک زندگی کے لئے تو اشتراک عمل کرنے سے ہمیں انکار نہیں مگر یہاں ہم سے کہا جاتا ہے کہ اپنی قبر کھودنے کے کام میں گورکنوں کے ساتھ اشتراک عمل کرو۔ ہمارا جھگڑا اس پر ہے کہ اشتراک عمل کی یہ کونسی بنیاد ہے؟ ہم نے یہ تو کبھی نہیں کہا کہ ہم اپنی ہمسایہ قوم سے ملنا نہیں چاہتے، اگر گذر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے۔ کہ ملنے کی صورت کیا ہے ہم ان کے ساتھ اس صورت سے ملکر چلنے کے لئے راضی ہیں کہ ہم بھی زندہ رہیں اور وہ بھی۔ مگر وہاں قومی استعلاء و استکبار
کا بھوت سوار ہے اور مردم خوری
کا چسکا لگ گیا ہے۔ کیا ہمیں اس بھوت سے ملنے کیلئے کہا جارہا ہے؟ کیا اس سے بھی صلح اور دوستی ہوسکتی ہے؟

یہ باتیں ہیں جن پر ہمارے ان بھائیوں کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے۔ جو ہمارے خیالات کو سنتے ہی آپے سے باہر ہوجاتے ہیں اور چیخنا شروع کردیتے ہیں کہ تم آزادی کے مخالف ہو، اور متحدہ جدوجہد کا دروازہ بند کرتے ہو، اور انگریزی امپیریلزم کو تقویت پہنچاتے ہو۔ ہم ان سے عرض کرتے ہیں کہ بات کی پچ کرنے کی ضرورت نہیں یہ معاملہ کسی شخصی جائداد یا کسی پارٹی کے گرنے اور اٹھنے کا نہیں، بلکہ اس قوم کی زندگی کا ہے جس کی فلاح و بہبود کے لئے ہم اور آپ سب خدا کے سامنے جوابدہ ہیں۔ ضد اور ہٹ دھرمی شاید دنیا میں بات بنادے مگر آخرت میں تو نہ بنا سکے گی۔ لہٰذا لاطائل بلند آہنگی اور بے اصل سخن پروری کو چھوڑیئے اور ایمان و احتساب نفس کے ساتھ سوچئے کہ جو کچھ ان صفحات میں عرض کیا جارہا ہے، وہ حق ہے یا نہیں۔

اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ فی الواقع یہ سوال ہندوستان میں امت مسلمہ کی زندگی و موت کا ہے اور اس کو حل کرنے کا یہی وقت ہے، اور اس کو آزادی ہند کا مسئلہ حل ہونے تک اٹھا رکھنا موجودہ سیاسی

حالات میں صحیح نہیں ہے تو بات آسان ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد صرف یہ سوال رہ جاتا ہے کہ اس چکر سے مسلمانوں کو نکالنے کی معقول صورت کیا ہے؟ اس سوال کا جواب دینا ہمارا فرض ہے اور ہم اس فرض کو کما حقہٗ ادا کرنے کی کوشش کریں گے۔

سب سے پہلے ہمیں یہ طے کرنا چاہئے۔ کہ ہم چاہتے کیا ہیں۔ پھر یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہوگی۔ کہ اس مقصد تک پہنچنے کا صحیح راستہ کونسا ہے۔

۱۔ ہمارے پچھلے بیان سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ واحد قومیت کا مفروضہ اور اس پر جمہوریت کی تعمیر ہی دراصل خرابی کی جڑ اور بس کی گانٹھ ہے۔ اب تک ہماری سیاسی پالیسی یہ رہی ہے کہ وطنی قومیت کے اصول کو ہم نے جوں کا توں رہنے دیا۔ ان جمہوری ادارات کو بھی قبول کر لیا جو اس غلط قاعدے پر بنائے جاتے رہے اور اپنا تمام زور صرف اس بات پر صرف کیا کہ اس بداصل دستور کے اندر کسی طرح اپنے تحفظ کا سامان کریں۔ یہ بنیادی غلطی تھی اور اب اس کے تلخ نتائج واضح طور پر ہمارے سامنے آگئے ہیں۔ اب ضرورت ہے کہ ہم سرے سے اپنی اس پوری سیاست پر نظر ثانی کریں۔ ہمیں جان لینا چاہئے کہ جس دستور حکومت کی بنیاد ان اصولوں پر ہو اس میں کسی قلیل التعداد قوم کا تحفظ کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ جداگانہ انتخاب، پاسنگ Weightage نشستوں کا تعلق، عہدوں اور مناصب میں حصہ کی تخصیص، یہ سب قطعی بیکار ہیں جبکہ قلیل و کثیر کو ایک مجموعہ فرض کر کے کثیر کی رائے کو قوت نافذہ عطا کر دیجائے۔ خرابی کی اس جڑ کو پا لینے کے بعد ہمیں شاخوں کو چھوڑ کر اپنا پورا زور اسی کے استیصال پر صرف کرنا چاہئے۔ ہماری قومی سیاست کا اولین نصب العین اب یہ ہونا چاہئے کہ اس واحد قومیت کے مفروضہ کی دھجیاں بکھیر دیں اور اپنی مستقل قومیت تسلیم کرائے بغیر ایک قدم آگے نہ چلنے دیں۔

(۲) واحد قومیت کا مفروضہ ٹوٹنے کے ساتھ ہی جمہوریت کا وہ غلط نظریہ بھی آپ سے آپ پاش پاش ہو جاتا ہے جس پر ہندوستان کے موجودہ دستور کی بنا رکھی گئی ہے اور جس کو انہی خطوں پر آگے بڑھانے کے لئے کانگریس اور ہندو سبھا کوشش کر رہی ہیں۔ اگر ہندوستان ایک قوم کا نہیں بلکہ کم از کم دو یا اس سے زائد قوموں کا ملک ہے تو یہاں خالص جمہوریت کے وہ اصول ہرگز نہیں چل سکتے جو صرف ایک قوم کے لئے موزون

ہیں۔ دو الگ قوموں کی ایک ڈیموکریسی اصولاً غلط ہے، عین اصول جمہوریت کی نفی ہے، عملاً دنیا کے کسی ملک میں کامیاب نہیں ہو سکتی ہے، اور یہ قطعی طور پر ثابت ہو چکا ہے کہ ایسی جمہوریت دراصل ایک قوم پر دوسری کی تیسری مسلط کرنیکا مجرب نسخہ ہے۔ ہم اس کے لئے ہرگز تیار نہیں ہیں کہ اس نسخہ کو یہاں پر آزمایا جائے۔

(۳) دو یا زائد قوموں کے ملک میں عمومی حاکمیت کی یہ تفسیر بھی قطعاً غلط ہے کہ ہر باشندہ ملک کو محض باشندۂ ملک ہونیکی حیثیت سے حاکمیت حاصل ہو۔ محض ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے دولت مشترکہ میں حصہ دار ہونا اور حاکمیت سے متمتع ہونا ہمارے لئے بالکل بے معنی اور بیکار ہوگا۔ ہماری ہندوستانیت ہماری مسلمانیت سے نہ تو منفک ہو سکتی اور نہ ان دونوں کو الگ الگ خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ مسلمان کسی حال اور کسی حیثیت میں بھی غیر مسلم نہیں ہے۔ وہ اپنے بچے کا باپ، اپنی بیوی کا شوہر، اپنے باپ کا بیٹا اور اپنے بھائی کا بھائی بھی مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہے، اور اسلام ہی کا قانون اسے بتاتا ہے کہ ان سب کے ساتھ اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہونی چاہئے۔ وہ اپنے اہل محلہ کا ہمسایہ، اپنے شہر والوں کا رفیق، اپنے وطن والوں کا معاون اور اپنے بنی نوع کا بھائی بھی مسلمان ہونے کی حیثیت ہی سے ہے۔ اور اسلام ہی اسے ہمسائگی، رفاقت، تعاون اور برادری کے اصول و حدود بتاتا ہے۔ انسانی تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت، اور نظم اجتماعی کے جملہ معاملات میں وہ جیسا اور جس قدر حصہ لے گا، مسلمان ہی کی حیثیت سے لیگا اس لئے کہ اس کے عین مسلمان ہونے ہی کا اقتضا یہ ہے کہ ان سب معاملات میں وہ اسلام کا نقطۂ نظر اختیار کرے اور اسلام کے اصول پر چلے۔ اس سے یہ کہنا کہ تو ہندوستان کی اجتماعی زندگی میں اپنی مسلمان ہونیکی حیثیت کو الگ کر کے ہی حصہ لے سکتا ہے، دراصل اس سے یہ کہنا ہے کہ تو ہندوستان میں مسلمان بنکر نہیں رہ سکتا۔ دوسری قوموں کے متعلق تو ہمیں کچھ کہنے کا منصب نہیں، مگر مسلمانوں کے متعلق ہم بلا خوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کے لئے یہ پوزیشن کسی طرح قابل قبول نہیں ہے علاوہ بریں اگر عمومی حاکمیت کی تفسیر یہ کی جائے کہ ملک کی حکومت میں ہمارا حصہ صرف ہندوستانی ہونیکی حیثیت سے ہے تو اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ ہماری زندگی دو الگ الگ خانوں میں تقسیم ہو جاتی ہے ایک خانہ ہندوستانیت کا ہے جس میں ہم حکومت کے حصہ دار ہیں اور دوسرا خانہ مسلمان ہونے

کی حیثیت کا ہے جس میں ہم حکومت کی طاقت اور اس کے اختیارات سے محروم ہیں۔ بالفرض یہ تقسیم صحیح بھی ہو تو سوال یہ ہے کہ اپنی زندگی کے اس دوسرے خانے کو درست کرنے اور درست رکھنے کے لئے جن وسائل و ذرائع، جن اختیارات و اقتدارات کی ہمیں ضرورت ہے وہ ہم کہاں سے لائیں گے؟ وطنی حکومت میں سے تو یہ چیزیں ہم کو مل نہیں سکتیں کیونکہ اس میں ہمارا حصہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے نہیں ہے۔ کہیں باہر سے بھی ہم اسے نہیں لا سکتے۔ اور خود اپنے اندر سے بھی اسے پیدا نہیں کر سکتے کیونکہ ان دونوں صورتوں میں وطنی حکومت سے تصادم ہوتا ہے۔ پس لامحالہ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہم کو آزادی وطن کے بعد بھی آزادی میسر نہ ہو، اور ہماری تہذیب کا نظام جس طرح انگریز کی غلامی میں زندگی کے اسباب اور ترقی کے وسائل نہ پانے کے سبب سے مضمحل ہو رہا ہے اسی طرح آزادی ہند کے دور میں بھی مضمحل ہوتا چلا جائے۔ کوئی شخص جو دستوری مسائل کا ذرہ برابر بھی فہم رکھتا ہو اس نتیجہ کا انکار نہیں کر سکتا، اور کوئی شخص جس کے دل میں اسلام کی ذرہ برابر بھی وقعت اور مسلمان رہنے کی کچھ بھی خواہش موجود ہو، اس نتیجہ کو قبول کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا ہمارے لئے اس امر پر اصرار کرنا قطعاً ناگزیر ہے کہ آزاد ہندوستان کے جمہوری نظام میں ہمارا حصہ مسلم ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے ہونا چاہئے نہ کہ محض ہندوستانی ہونے کی حیثیت سے۔

یہ تین اہم ترین نکات ہیں جنہیں آئندہ کے لئے مسلمانوں کی قومی پالیسی اور ان کے سیاسی نصب العین کا سنگ بنیاد قرار دینا چاہئے۔ ان میں ایک امر میں بھی کسی ترمیم کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے کہ ان نکات سے ہٹنا در اصل موت کے گڑھے میں جانا ہے۔ اب یہ ظاہر بات ہے کہ برٹش گورنمنٹ کا بنایا ہوا دستور حکومت اور کانگریس اور مہاسبھا دونوں کا نصب العین ہمارے ان نکات سے اصولاً متصادم ہوتا ہے اور ہمارے لئے لازم ہو جاتا ہے کہ اس کو بالکلیہ رد کر دیں۔ لیکن محض رد کر دینا کافی نہیں ہے۔ یہ محض سیاسی چیز ہے جس پر کسی عمارت کی تاسیس نہیں ہوتی۔ ہمیں ایجابی طور پر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتانا چاہئے کہ ہمارے نکات کی بنیاد پر کونسا دستور حکومت بنایا جا سکتا ہے جو ممکن العمل بھی ہو۔ ملک کی دوسری قوموں کے لئے قابل قبول بھی ہو اور جس میں ہمارے قومی حوصلے بھی ٹھیک ٹھیک پورے

ہو سکتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ہمارے سامنے مستقبل ہند کی تعمیر کے لئے تین خاکے آتے ہیں جنہیں ہم الگ الگ پیش کریں گے۔

## پہلا خاکہ

دو یا زائد قوموں کے ملک میں ایک جمہوری ریاست بنانے کی صحیح اور منصفانہ صورت یہ ہے:۔

اولاً وہ بین الاقوامی وفاق (International Federation) کے اصول پر مبنی ہو۔

یا دوسرے الفاظ میں وہ ایک قوم کی ریاست نہیں بلکہ متوافق قوموں کی ایک ریاست (A State of Federated Nations) ہو۔

ثانیاً اس وفاق میں شریک ہونیوالی ہر قوم کو تہذیبی خود اختیاری (Cultural Authority) حاصل ہو یعنی ہر قوم اپنے مخصوص دائرہ زندگی میں اپنے گھر کی تنظیم و اصلاح کے لئے حکومت کے اختیارات استعمال کر سکے۔

ثالثاً مشترک وطنی معاملات کے لئے اس کا نظام عمل مساویانہ حصہ داری (Equal Partnership) پر تعمیر کیا جائے۔

ہندوستان کے حالات کو سیاسی نقطۂ نظر سے سمجھنے اور حل کرنے کی جن لوگوں نے کوشش کی ہے انہوں نے یہ بات تو تسلیم کر لی ہے کہ اس ملک کیلئے وحدانی (Unitary) طرز کی حکومت موزوں نہیں ہے، بلکہ یہاں ایک اسٹیٹ اگر بن سکتا ہے تو وہ صرف وفاقی اصول پر بن سکتا ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ وہ حالات کے صرف ایک پہلو کو دیکھکر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ دوسرا پہلو ان کی نگاہوں سے اوجھل رہ گیا ہے۔ انہوں نے صرف اس حد تک واقعات کو دیکھا اور سمجھا کہ یہاں دیسی ریاستیں اور برٹش انڈیا کے صوبے ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور خود صوبوں کی زبان، روایات، معاشرت اور عمرانی مسائل میں کافی تفاوت ہے۔ اس لئے وہ صرف اس نتیجہ تک پہنچ سکے کہ ان سب کو ایک مرکزی اقتدار کا بالکلیہ تابع بنا دینا درست نہیں ہے بلکہ ان کی اندرونی خود مختاری کو برقرار رکھ کر ان کے درمیان وفاقی تعلق قائم کرنا چاہیئے لیکن واقعات

کے اس پہلو پر ان کی نگاہ نہیں پہنچی کہ یہاں ریاستوں اور صوبوں کی طرح قوموں کے درمیان بھی اصول تہذیب طرز زندگی، ضروریات قومی اور ضروریات اجتماعی میں کافی تفاوت ہے۔ اس حقیقت کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے انہوں نے مختلف قوموں کو ایک وحدانی طرز کی حکومت میں باندھ کر رکھ دیا۔ درانحالیکہ جو وجوہ ریاستوں کے معاملہ میں وفاقی اصول اختیار کرنے کے مقتضی سمجھے ہیں۔ ان سے زیادہ قوی وجوہ قوموں کے معاملہ میں وفاقی اصول اختیار کرنے کے مقتضی ہیں۔

وفاق کی روح کیا ہے؟ مختصراً اس کو یوں سمجھ لیجئے کہ جو جماعتیں کچھ ایسے مشترک اغراض و منافع رکھتی ہوں کہ ایک دوسرے سے علیحدہ زندگی بسر کرنا ان کے لئے ممکن نہ ہو، اور اس کے ساتھ ان کے کچھ مخصوص حالات ایسے ہوں جن کی بنا پر وہ بالکل ایک دوسرے میں مدغم ہو جانا بھی گوارا نہ کر سکتی ہوں، وہ آپس میں مل کر اس طرح کی ایک مصالحت (Compromise) کر لیتی ہیں کہ اپنے مخصوص معاملات میں ان کی خود مختاری بھی برقرار رہے اور مشترک معاملات میں اشتراک عمل بھی ہو سکے۔ اس قسم کے وفاق میں مرکز اور وفاقی اجزاء کے درمیان حاکمیت منقسم ہو جاتی ہے۔ مرکز اور ہر ایک وفاقی جز اپنے اپنے دائرہ عمل میں مختار ہوتا ہے۔ نہ ایک کو دوسرے کے دائرے میں گھس آنے کا اختیار ہوتا ہے اور نہ آئینی حیثیت سے کسی ایک کو یہ اقتدار حاصل ہوتا ہے کہ دوسرے کو مٹا دے۔ اس طرح کی مصالحت یہ موقع بہم پہنچا دیتی ہے کہ مختلف النوع جماعتیں مشترک ضروریات کیلئے مل کر ایک اسٹیٹ بنا سکیں۔

وفاق کی اس روح کو سمجھ لینے کے بعد کسی سیاسی فہم و بصیرت رکھنے والے شخص کے لئے اس حقیقت کا ادراک کر لینا مشکل نہیں ہے کہ اسی نوعیت کا وفاق جس طرح ریاستوں (یعنی الگ الگ جغرافی خطے والی جماعتوں) کے درمیان ہو سکتا ہے۔ اسی طرح قوموں (یعنی ایک ہی جغرافی خطہ میں رہنے والی مختلف المذہب یا مختلف التمدن جماعتوں) کے درمیان بھی ہو سکتا ہے۔ البتہ اصول وفاق کا انطباق (Application) دونوں صورتوں میں مختلف طرز پہ ہوگا۔ متوافق ریاستوں اور مرکز کے درمیان اختیارات کی تقسیم جس طرح پر کی جاتی ہے، متوافق قوموں کے درمیان وہ اس سے مختلف طریقہ پر ہوگی۔ پہلی چیز کو ہندوستان میں صوبائی خود اختیاری سے تعبیر کیا گیا ہے، دوسری چیز کو ہم تہذیبی خود اختیاری (Cultural Autonomy) سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے بنیادی اصول حسب ذیل

ہونے چاہئیں :۔

(۱) وفاقی اسٹیٹ بنانیوالی ہر قوم صاحب حاکمیت قوم (Sovereign Nation) ہو یعنی وہ اپنے دائرہ عمل میں خود حکومت کے اختیارات استعمال کرے۔

(۲) تعلیم، مذہبی معاملات (مثلاً عبادت گاہوں اور اوقاف کا نظم ونسق اور مذہبی احکام کو اپنے افراد قوم پر نافذ کرنا اور ان احکام کے خلاف ان کی سرکشی کو روکنا) اور مخصوص تمدنی ومعاشرتی مسائل (مثلاً نکاح، طلاق، وراثت اور قومی طرز معاشرت (National Social System) میں ہر قوم کو پوری حکومت خود اختیاری حاصل ہو اور مرکز کو اس میں دخل دینے کا حق نہ ہو۔

(۳) ان اغراض کے لئے ہر قوم کی الگ الگ ضلع وار اور صوبہ وار کونسلیں ہوں اور ان پر ایک سپریم کونسل ہو، مذکورہ بالا معاملات انہی کونسلوں میں پیش ہوں اور وہیں سے ان کے لئے قوانین منظور کئے جائیں۔ ان قوانین کا مرتبہ عام ملکی قوانین سے کسی طرح کم نہ ہو۔ ان کو نافذ کرنے کے لئے ایک مستقل ہیئت انتظامیہ (Executive) ہو اور وہ قومی کونسل کے سامنے جوابدہ ہو۔ مصارف نظم و نسق کے لئے ٹیکس عائد کرنے اور وصول کرنے کے پورے اختیارات اس قومی نظام کو حاصل ہوں۔ اور ملکی خزانہ میں سے ایک مخصوص حصہ ہر قوم کے لئے مقرر کر دیا جائے، جس طرح وفاقی ریاستوں اور وفاقی مرکز کے درمیان مالیات کی تقسیم ہوا کرتی ہے۔

(۴) متوافق قوموں کے درمیان، یا کسی وفاقی جزاور مرکز کے درمیان جو آئینی اختلافات پیدا ہوں ان کا تصفیہ وفاقی عدالت (Federal Court) کرے۔

(۵) اپنے مخصوص قوانین کے مطابق فصل خصومات کرنے کے لئے ہر قوم کا مستقل عدالتی نظام بھی ہو جسے عام ملکی عدالتوں کی طرح پورے عدالتی اختیارات حاصل ہوں۔

اس مرحلہ پر تہذیبی خود اختیاری کے صرف اصول بیان کئے جا سکتے ہیں، اگر ان پر اتفاق ہو جائے[1] تو ان کا تفصیلی نقشہ ایک بین الاقوامی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس یا آئین ساز مجلس (Constituent Assembly) میں بنایا جا سکتا ہے۔

[1] حاشیہ صفحہ ۲۱۱ پر ملاحظہ فرمائیں

اس کے بعد مرکزی حکومت کا سوال سامنے آتا ہے۔ مرکزی حکومت سے یہاں ہماری مراد ریاستوں
کے وفاق کا مرکز نہیں ہے، بلکہ قوموں کے وفاق کا مرکز ہے، یعنی وہ نظام حکومت جسے متوافق قومیں اپنی
مشترک اغراض کے لئے بنائیں۔ اس معنی میں صوبوں اور ریاستوں کی حکومت بھی اسی طرح مرکزی ہے
جس طرح وفاقی مرکز (Federal Centre) یہ مشترک نظام حکومت لامحالہ مساویانہ حصہ داری[1]
کے اصول پر مبنی ہونا چاہئے اس لئے کہ یہ صاحب حاکمیت کا وفاق ہے نہ کہ ایک قوم کا وحدانی
نظام حکومت۔ یہاں پوری احتیاط کے ساتھ اس امر کا انتظام کرنا پڑے گا کہ اصول جمہوریت کے لحاظ
سے ایک وفاقی جزو کو جو حاکمیت حاصل ہے دوسرا وفاقی جزو اسے سلب نہ کرے۔ تہذیبی خود اختیاری
کی طرح اس کا بھی ایک ڈھانچہ بنا کر ہم پہلے پیش کرچکے ہیں جس کی تفصیلی صورت بعد میں ایک آئین
ساز مجلس بنا سکتی ہے۔

(۱) اسٹیٹ کے تشریعی، انتظامی، عدلی اور دفاعی، چاروں شعبوں میں ہر قوم کا حصہ[1] اس کی

---

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابق) بعض لوگ اس موقع پر فوراً سوال اٹھاتے ہیں کہ اسلام میں زانی اور سارق اور قاذف کے لئے جو حدیں مقرر
ہیں یا ہندو شاستر میں جو مخصوص قوانین ہیں، کیا ان کو جوں کا توں نافذ کیا جائے گا؟ یہ سوال سراسر ناواقفیت پر
مبنی ہے۔ اصل یہ ہے کہ ابتدائی مرحلہ میں بین الاقوامی تعلقات کا تناسب قائم کرنے کے لئے ہم صرف ان قوانین کے
نفاذ پر زور دیں گے جو عام ملکی قوانین سے متصادم نہ ہوتے ہوں۔ اس کے بعد ہر قوم اپنی تہذیب کے اصولوں کا مظاہرہ کرکے
اور ان کے حق میں علمی و عقلی دلائل پیش کرکے رائے عام کو ہموار کرنے کی کوشش کرتی رہیگی اور جس کی تہذیب کے اصول زیادہ
طاقتور ہونگے وہ عام ملکی قوانین کو متاثر کرنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

لے خود غرض لوگ یہاں یہ اعتراض پیدا کر دیتے ہیں کہ اس طرح حصے کرنے سے مناصب حکومت کی اہلیت (Efficiency)
متاثر ہو جاتی ہے۔ مگر یہ محض ایک فریب ہے اور اس کا مقصد بجز اس کے کچھ نہیں کہ اپنے حق سے
زیادہ جو لوگ لے چکے ہیں وہ اس کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ ورنہ کھلی ہوئی بات ہے کہ کسی قوم میں اہل آدمیوں کی اتنی کمی نہیں
ہے کہ نظام حکومت کو چلانے کے لئے اپنے تناسب آبادی کے مطابق کام کے آدمی نہ دے سکتی ہو۔ حصہ کے سوال کو
یہ معنی پہنانا کہ ہم اہلیت کے بجائے محض قومیت کو مدار انتخاب قرار دینا چاہتے ہیں۔ ایک ذلیل قسم کی چالاکی ہے۔

آبادی کے تناسب سے مقرر کر دیا جائے۔ جو تناسب کے تغیرات کے ساتھ ساتھ متغیر ہو سکتا ہو۔ پاسنگ (Weightage) کا طریقہ بالکل اڑا دیا جائے۔

(۲) موجودہ طریق انتخاب کو بھی بالکل بدل دیا جائے۔ چھوٹے چھوٹے حلقہائے انتخاب بنانے کے بجائے ایک ریاست کے پورے حدود ارضی کو ایک حلقۂ انتخاب قرار دیا جائے جس میں ایک ایک نشست کے لئے الگ الگ امیدوار کھڑے نہ ہوں بلکہ تسلیم شدہ سیاسی جماعتیں (Recognized Political Parties) اپنے اپنے امیدواروں کی فہرستیں پیش کریں اور ان کو کامیاب کرنے کیلئے جد و جہد کریں۔ اس صورت میں (اور یاد رکھئے کہ صرف اسی صورت میں) جداگانہ انتخاب کے طریقہ کو موقوف کر دینا چاہئے، اس لئے کہ پھر بند قلعوں میں رہنا ہر قوم کے لئے مضر ہوگا۔ جداگانہ طریق انتخاب کی ضرورت صرف اسی وقت تک ہے جبتک کہ یہاں انگلستان کی بوسیدہ ڈیموکریسی کے نمونہ پر چھوٹے چھوٹے یک نشستی حلقہائے انتخاب بنائے جاتے ہیں یورپ کی جدید جمہوریتوں میں متناسب نمائندگی (Proportional Representation) کے جو تجربات کئے گئے ہیں، اگر ان سے استفادہ کر کے ایک صحیح جمہوری طریق انتخاب اختیار کر لیا جائے تو پھر جداگانہ انتخاب کو اڑا دینا ہوگا تاکہ اولاً آبادی کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی نمائندگی سے محروم نہ رہ سکے، ثانیاً مقابلہ اشخاص کا اشخاص سے نہ ہو، بلکہ پارٹیوں کے اصول اور پروگرام ایک دوسرے کے مقابلہ میں آئیں، اور ثالثاً ہر پارٹی اپنے اصول اور پروگرام کو لیکر سب قوموں کے پاس جاسکے بابت ممکن ہے کہ ابتداءً ہم اپنے نظم کی کمزوری کے باعث کسی زیادہ منظم جماعت کے مقابلہ میں شکست کھا جائیں، لیکن تہذیبی خود اختیاری کے بعد یہ شکست ہمارے لئے کچھ زیادہ مضر نہ ہوگی، اور مزید براں کھلے مقابلہ ہی میں زور آزمائی کرنے سے ہم سیاسی تنظیم کا سبق سیکھ سکیں گے ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ مقابلہ آزادانہ اور مساویانہ ہو۔ اس کے بعد اگر ہم اپنے نظم کی کمزوری یا اپنے اصول اور پروگرام کی کمزوری کے باعث شکست کھائیں گے تو اس شکست کے مستحق ہوں گے۔

(۳) جمہوریت کو مؤثر بنانے کے لئے استصواب عام (Referendum) کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ نیز رائے دہندوں کو یہ حق بھی دیا جائے کہ جن نمائندوں پر ان کو اعتماد نہ رہا ہو ان کو واپس

بلالیں۔ یہ بھی انگلستان کی دقیانوسی جمہوریت کا سراسر غیر جمہوری طریقہ ہے کہ نمائندوں کو منتخب کرنے کے بعد رائے دہندے ایک معین مدت تک اپنے ہاتھ کٹوا بیٹھتے ہیں۔ روسو کے بقول انگریز صرف اس وقت آزاد ہوتے ہیں جب وہ پارلیمنٹ کے ارکان کا انتخاب کرتے ہیں۔ اور جب وہ انہیں منتخب کر لیتے ہیں تو پھر اپنے ہی منتخب کردہ نمائندوں کے غلام بنجاتے ہیں۔

(۴) استصواب عام کے ساتھ یہ اصول مقرر کر دیا جائے کہ جس چیز کی مخالفت ایک قوم کے ووٹر بالاتفاق یا عظیم اکثریت کے ساتھ کریں وہ مجلس قانون ساز میں پاس نہ ہو سکے۔ کیونکہ یہ مخالفت اس بات کی دلیل ہوگی کہ جمہوری نظام کے حصہ داروں میں سے ایک حصہ دار اس کو اپنے لئے مضر پاتا ہے اور دوسرا حصہ دار صرف اس لئے اس کا مؤید ہے کہ وہ اس کے لئے مفید ہے۔ اس قسم کے کسی قانون یا ریزولیوشن کا پاس ہونا عین اصول جمہوریت کی نفی ہوگا۔

(۵) استصواب عام کے لئے یہ اصول بھی مقرر کرنا پڑیگا کہ اگر کسی قوم کے ووٹروں کی کم از کم اتنے فیصدی تعداد استصواب کا مطالبہ کرے تو اس کا انعقاد ضروری ہوگا۔

(۶) دستور کی ترمیم پر بھی سخت پابندیاں عائد کرنی ہوں گی۔ جن کے لئے امریکہ، سوئٹزرلینڈ، آسٹریلیا، اور دوسرے جمہوری ممالک کے دساتیر سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

## دوسرا خاکہ

اگر بین الاقوامی وفاق کی یہ صورت قبول نہ کی جائے تو دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مختلف قوموں کے الگ الگ حدود ارضی مقرر کر دیئے جائیں جہاں وہ اپنے جمہوری اسٹیٹ بنا سکیں۔ پچیس سال یا اس سے کچھ کم و بیش مدت تبادلۂ آبادی کے لئے مقرر کر دی جائے۔ ہر اسٹیٹ کو زیادہ سے زیادہ اندرونی خود مختاری دی جائے، اور وفاقی مرکز کے اختیارات کم از کم رکھے جائیں۔ اس صورت میں ہم غیر مسلم ریاستوں کے ساتھ مل کر ایک وفاقی اسٹیٹ بنانے پر نہ صرف راضی ہو جائیں گے، بلکہ اس کو ترجیح دیں گے۔

میرے دوست ڈاکٹر عبداللطیف صاحب نے حال میں ہندوستان کے تہذیبی مستقبل

(Cultural Future of India) پر جو مقالہ حیدر آباد سے شائع کیا ہے وہ ہندوستان کی مختلف قوموں کے درمیان ارضی حدود کی تقسیم کا بہترین نقشہ پیش کرتا ہے۔ یہ ایک منصفانہ تقسیم ہے جس کی رو سے مشرقی بنگال، حیدر آباد، بھوپال، جوناگڑھ، جاورہ، ٹونک، اجمیر، دہلی وادوھ، شمالی و مغربی پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے حلقے مسلمانوں کے لئے مخصوص ہو جاتے ہیں۔ اس طرح یہ ممکن ہے کہ پچیس سال کی مدت میں ہندوستان کے دوسرے خطوں سے ہجرت کر کے مسلمان ان حلقوں کے اندر سمٹ جائیں اور ہندو قریب کے علاقوں میں چلے جائیں۔ بقیہ ہندوستان میں اگر اچھوت اپنی الگ قومیت بنانا چاہیں تو ان کے لئے بلحاظ ان کی آبادی کے مستقل رقبے کئے جا سکتے ہیں (بشرطیکہ گاندھی جی خودکشی کی دھمکی دیکر ان کی آزادی رائے کو پھر نہ سلب فرمالیں) اسی طرح سکھوں کو بھی ان کی آبادی کے لحاظ سے ایک رقبہ دیا جا سکتا ہے۔

## تیسرا خاکہ

اگر یہ صورت بھی منظور نہ ہو تو پھر مجبوراً ہم یہ مطالبہ کریں گے کہ ہماری قومی ریاستیں الگ بنائی جائیں اور ان کا علیحدہ وفاق ہو، اسی طرح ہندو ریاستوں کا بھی ایک جداگانہ وفاق ہو، اور پھر ان دو یا زائد وفاقی مملکتوں کے درمیان ایک طرح کا تحالف (Confodracy) ہو جائے، جس میں مخصوص اغراض، مثلاً دفاع اور مواصلات (Communications) اور تجارتی تعلقات کے لئے مقررہ شرائط پر تعاون ہو سکے۔

---

یہ تین خاکے جو ہم نے تجویز کئے ہیں، ان میں سے جس کو بھی قبول کر لیا جائے اس پر ہم مفاہمت کر سکتے ہیں۔ اگر کوئی چوتھی یا پانچویں صورت پیش کی جائے تو اس پر بھی غور کر سکتے ہیں۔ مگر ہمارے ہندو ہمسایوں اور ان کے انگریز سرپرستوں کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ موجودہ کانسٹی ٹیوشن اور ہر وہ نظام حکومت جو واحد قومیت کی بنا پر جمہوری ادارات قائم کرتا ہو، کسی حال میں ہمارے لئے قابل قبول نہیں ہے۔ اس بنیادی غلطی سے پاک کر کے جو دستور بھی پیش کیا جائے اس کو اور صرف اسی

کو زیر غور لایا جا سکتا ہے۔

---

اپنے قومی نصب العین کی اس تشریح کے بعد ہمارے لئے آخری سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اس کو حاصل کرنے کا ذریعہ کیا ہے؟ یہاں اس سوال کی تفصیلات پر بحث کرنے کا موقع نہیں۔ مختصراً ایک بات میں صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ حالات جس حد تک پہنچ گئے ہیں ان میں ہمارے لئے انقلابی ذرائع اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے قومی رہنماؤں اور سیاسی اداروں نے گذشتہ دس پندرہ سال کی مدت میں انتہا درجہ کی بے بصیرتی اور ناعاقبت اندیشی سے کام لیا ہے۔ اور اس کے برعکس ہماری ہمسایہ قوم کو اعلیٰ درجے کے دانشمند اور مدبر رہنما میسر آگئے ہیں اس نامساوی مقابلہ کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج ہم اس ملک کے سیاسی ترازو میں بہت بے وزن ہیں اور ان کا پلڑا بہت جھک چکا ہے۔ اب وہ اپنی کامیابی کی منزل سے بہت قریب ہو چکے ہیں۔ اور متعدد اسباب ہیں جن کی طرف میں پہلے اشارہ کر چکا ہوں، انگریز بھی دانستہ یا نادانستہ وہی طریق دستور سازی اختیار کرنے پر اصرار کر رہا ہے۔ جو سراسر انہی کے لئے مفید ہے۔ ایسی حالت میں یہ توقع کرنا انتہا درجہ کی خام خیالی ہوگی۔ کہ محض زور استدلال یا افہام و تفہیم سے، آئینی چالوں سے ہم ہندوؤں اور انگریزوں کو ان کے وہ اصول اور مقاصد یکسر بدل ڈالنے پر آمادہ کر سکیں گے جو نہ صرف ان کے عقیدے میں درست ہیں بلکہ ان کی اغراض کے لئے مفید بھی ہیں۔ اب آئینی تدبیروں کے لئے کامیابی کا کوئی موقع باقی نہیں رہا ہے۔ اب کوئی پارنل اور کوئی او کانل ہماری لڑائی نہیں جیت سکتا۔ اب صرف جان و مال کی قربانیوں ہی سے واقعات کی رفتار بدلی جا سکتی ہے۔ جب تک ہم یہ ثابت نہ کر دیں گے۔ کہ یہ کانسٹی ٹیوشن ہمارے زندہ سروں پر نہیں بلکہ قبروں پر ہی نافذ کیا جا سکتا ہے، اور جب تک ہم اپنے عمل سے یہ نہ بتا دیں گے کہ مسلمان اپنی قومی زندگی کے لئے مرنے کی طاقت رکھتا ہے، اس وقت تک اس کانسٹی ٹیوشن کا ایک شوشہ بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹے گا، اور نہ قومی جمہوری لادینی اسٹیٹ ہم پر مسلط ہونے سے باز رہے گا جس کے لانے پر انگریز، ہندو، اور ہمارے منافقین اور رہنت سے صم بکم عمی فہم لا یعقلون مل جل کر کوشش کر رہے ہیں۔ مسلمان انتہا درجہ کے نادان ہونگے اگر وہ اب بھی حالات کی نزاکت کو ٹھیک ٹھیک

نہ سمجھیں گے۔ وہ ابھی تک اس دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں کہ ان کو یہ نمائشی جلسے اور جلوس اور کھوکھلے مظاہرے قومی ہلاکت سے بچالیں گے۔ وہ ان لوگوں کی لیڈری پر اعتماد کر رہے ہیں جن کے سامنے اپنی وزارت اور وجاہت کے سوا کوئی چیز نہیں، جو اپنی قوم کے لئے اپنا بال تک بیکا ہونا گوارا نہیں کر سکتے جو مسلمانوں کے مفاد کا نام صرف اس لئے بلند آہنگیوں کے ساتھ لیتے ہیں کہ ایوانِ وزارت پر ان کا قبضہ رہے جن کی بزدلی پر دشمنوں تک کو پورا پورا اعتماد ہے، جنہیں یہ چیلنج کیا جاتا ہے کہ اگر تم ہمارے ساتھ جیل میں جانے اور لاٹھیاں کھانے کو تیار ہو تو ہم تمہاری ہر بات ماننے کے لئے تیار ہیں۔ اور وہ اس چیلنج کو قبول کرنے کے بجائے کنی کاٹ جاتے ہیں، جن کا حال یہ ہے کہ یورپ میں سرکار برطانیہ کو جنگ کا خطرہ پیش آتا ہے تو یہ سب سے پہلے آگے بڑھ کر اپنی وفادارانہ خدمات پیش کرتے ہیں۔ ایسے لیڈروں سے اگر مسلمان یہ توقع باندھے بیٹھے ہیں کہ یہ ان کی کشتی کو بھنور سے نکال لیں گے، تو میں پیشینگوئی کرتا ہوں کہ ان کی کشتی ڈوب کر رہے گی۔ یہ تقریروں کا نہیں بلکہ جان جوکھوں کا کام ہے۔ اگر مسلمان جینا چاہتے ہیں تو ان کو اور خصوصاً ان کے نوجوانوں کو اپنا گرم خون زندگی کے لئے بھینٹ چڑھانے پر تیار ہونا چاہئے۔

پوچھا جاتا ہے کہ انقلابی ذرائع سے تمہاری مراد کیا ہے۔ میں حیران ہوں کہ اس کا کیا جواب دوں جب تک کہ قوم کی ایک بڑی تعداد ایک نصب العین پر متحد نہ ہو جائے، اور ہر قیمت پر اسے حاصل کرنے کا عزم صمیم اس میں پیدا نہ ہو جائے، انقلابی ذرائع کی ایک فہرست پیش کر دینا کسی یاوہ گوہی کا کام ہو سکتا ہے، اور میں یاوہ گوئی سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔